اکہتر کے وہ دن

جہاں آرا امام

تدوین وتعارف: احمد سلیم



اکہتر کے وہ دن

مصنفہ: جہاں آرا امام

بنگلہ سے ترجمہ: منور مہدی

تدوین وتعارف: احمد سلیم

جُمہوری پبلیکیشنز

انتساب!

پاکستانی عوام کے نام

جو اِن حقائق کو پہلی بار جان پائیں گے۔

تعارف

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

پاکستان میں 1971ء کے المیہ کے حوالے سے درجنوں کتابیں چھپی ہیں۔ان میں سے بیشتر کتابیں پاکستان کی سول اور فوجی بیوروکریسی کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ چند کتابیں سیاست دانوں یا سیاسی دانشوروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ان میں زیادہ تر کتابیں خودنوشت سوانح عمریوں پر مبنی ہیں جن میں فوجی افسران' سول بیوروکریٹ یا تو ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے نظر آتے ہیں یا سارا زورِ قلم خود اپنی حب الوطنی اور پاکستان دوستی پر صرف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بنگالی عوام سے ہمدردی ان کتابوں میں مکمل طور پر مفقود ہوتی ہے۔عوامی لیگ کی غداری، بھارتی سازشیں' پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی طے کردہ حب الوطنی ان کتابوں کے بنیادی رجحانات ہیں۔دوسرے اور تیسرے درجے کی صحافتی تجزیاتی کتابیں کم وبیش انہی رجحانات کے گرد گھومتی ہیں۔ چند اکا دکا کتابیں البتہ سچائی کے قریب قرار دی جاسکتی ہیں۔

اس تناظر میں شہید جنانی جہاں آرا امام کی بنگلہ کتاب 'اکہتر کے وہ دن' پاکستانی قارئین کے لے نیا سیاسی صدمہ ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ بنگلہ دیش کی آزادی کے اڑتیس سال گزر جانے کے باوجود وہ آج بھی نہیں جانتے کہ 1971ء میں دراصل ہوا کیا تھا۔ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجی ایکشن دراصل بنگالی عوام کے قتل عام کی کہی' ان کہی کہانی ہے۔کہی ان معنوں میں کہ جہاں آرا امام اسے 1971ء کے ان دنوں میں ڈائری کی صورت میں اپنے خون سے لکھتی رہیں اور ان کہی' ان معنوں میں کہ پاکستانی عوام ابھی تک اس ڈائری کی تفصیلات اور مندرجات سے بے خبر رکھے گئے ہیں۔

یہ استدلال اپنی جگہ پر انتہائی بودا اور بے جان ہے کہ مغربی پاکستان کے عوام نے مشکل کی ان گھڑیوں میں اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے حق میں اس لیے آواز بلند نہیں کی، اس لیے ان کے قتل عام پر صدائے احتجاج بلند نہیں کی، یحییٰ خان کی فوجی جنتا کے خلاف اس لیے سڑکوں پر نہیں نکلے کیوں کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ وہاں کس طرح کا خونی کھیل کھیلا جارہا ہے۔ یہ جاننا ان کا فرض تھا کہ پاکستان کی چھپن فیصد آبادی کے ساتھ کیا ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے۔ یہ جاننا بھی ان کا فرض تھا کہ 1970ء کے انتخابات میں واضح اکثریت سے جیتنے والی سیاسی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار کیوں نہیں منتقل کیا جارہا تھا۔

یہ معلوم کرنا بھی ان کا فرض تھا کہ اکثریتی پارٹی کا رہنما شیخ مجیب یا ایک ملک کی چھپن فیصد آبادی غدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کے سوا شاید ہی کسی نے یہ جاننے کی خواہش کی ہو کہ پاکستان کے بڑی آبادی والے حصے میں اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں کا خون کیوں بہایا جا رہا تھا؟ کیا یہ اجتماعی بے خبری ایک جرم نہیں تھی؟ اور کیا پاکستان کے عوام، یہاں کی پارلیمنٹ اور یہاں کے مقتدر طبقوں کو بنگلہ دیش کے عوام سے معافی نہیں مانگنی چاہیے تھی؟ یہ روزنامچہ پڑھتے ہوئے اگر آپ شرم محسوس کرتے ہیں تو ان سوالوں پر غور کیجئے اور اسٹیبلشمنٹ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی ان کے جواب طلب کیجئے۔ اس کتاب میں آپ کے بہت سے سوالوں کا جواب پہلے سے موجود ہے۔

یہ اجتماعی مجرمانہ خاموشی اڑتیس سال گزر جانے کے بعد بھی قائم ہے۔ 1971ء میں جب مغربی پاکستان میں اکا دکا شریفانہ آوازیں بلند ہوئیں تو یحییٰ حکومت نے بھی اور پاکستان کے عام لوگوں نے بھی انہیں وطن کا غدار قرار دیا۔ انجمن جمہوریت پسند خواتین نے مشرقی بنگال میں عوام کی نسل کشی کے خلاف لاہور میں جلوس نکالا تو جلوس کی شرکاء پر، جن میں طاہرہ مظہر علی خان اور بیگم نسیم شمیم اشرف ملک بھی شامل تھیں، تھوکا گیا۔ انہیں پاکستان کا غدار اور بھارتی ایجنٹ قرار دیا گیا۔ حبیب جالب نے تڑپ کر کہا ۔

بگیا لہولہان

تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ عبداللہ ملک' عبدالرؤف ملک اور نیشنل عوامی پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو صوبہ سرحد سے' سندھ سے' بلوچستان اور پنجاب سے گرفتار کیا گیا۔ خود مجھے قید و بند' جرمانے اور کوڑوں کی سزا سے نوازا گیا۔ میری بوڑھی ماں کو فوجی عدالت میں دھکے دیئے گئے۔ میری پانچ سالہ بھانجی نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''ماموں کو کیوں لے گئے ہیں''؟

جواب ملا

''تمہارے ماموں نے یحییٰ خان کے خلاف ایک نظم لکھی تھی اس لیے''

تو 'یحییٰ خان ماموں کے خلاف نظم لکھ لیتا' پکڑنے کی کیا ضرورت تھی''

شاید اس سارے عمل پر پانچ سالہ بچی کا یہ ایک بلیغ تبصرہ تھا۔ فیض نے اپنے مخصوص انداز میں تڑپ کر دو تین نظمیں لکھیں اور بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد 1973ء میں ڈھاکہ سے واپسی پر کہا

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

جس پر بنگلہ دیش کے صدر نے کہا تھا

''فیض صاحب خون کے دھبے برساتوں سے نہیں دھلا کرتے''

حمید اختر' عبداللہ ملک اور آئی اے رحمان نے 1970ء میں لاہور سے روزنامہ ''آزاد'' جاری کیا تھا اور قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں بنگالی عوام کے ساتھ تھیں۔ پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد

جب بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تو گورنر کھر نے شہر کی سڑکوں پر ان تینوں کے خلاف بینر آویزاں کروائے جن پر لکھا تھا۔

صحافت کے تین شیطان

حمید اختر' عبداللہ ملک اور رحمان

یہ اور ایسی ہی چند دوسری شریفانہ آوازوں کے علاوہ پورے مغربی پاکستان میں خاموشی چھائی رہی اور اب 16 دسمبر 2009ء تک جب اس سانحہ کو اڑتیس سال گزر چکے ہیں، اسی طرح خاموشی چھائی ہوئی ہے اور نئی نسل جو 1971ء کے بعد پیدا ہوئی اور پروان چڑھی' آج یہ بھی نہیں جانتی کہ موجودہ بنگلہ دیش پاکستان کی اکثریتی آبادی کا صوبہ تھا جہاں قیام پاکستان سے پہلے ہی مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور جس کے رہنماؤں میں سہروردی' اے کے فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین کے نام شامل تھے اور شیخ مجیب الرحمان ایک طالب علم کے طور پر پاکستان کی تحریک چلا رہے تھے۔

نئی نسل کو یہ کتاب کیا بتاتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

"نارندہ سے عطا بھائی آئے تھے' خیریت معلوم کرنے کے لیے خدا پرست' پرہیزگار اور قناعت پسند انسان ہیں مگر اسلام کے نام پر پاکستانی جو کچھ کر رہے ہیں اس پر ان کی قناعت' چین اور نیند سب حرام ہوگیا ہے۔ کہنے لگے 'سمجھ گئیں جہاں آرا' اب ان کے زیادہ دن نہیں رہے۔ اسلام کے نام پر وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس سے خدا کا عرش بھی کانپنے لگا ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر قاری صاحب قرآن کی تلاوت کر رہے تھے انہیں بھی گولی ماردی ہے۔ خدا کے گھر میں گھس کر انسان کا قتل' ماں کی آنکھوں کے سامنے ننھے بچے کو سنگین چبھو کر مارا ہے۔ بالغ بچے کے سامنے ماں کو بے عزت کیا ہے۔ سمجھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ اتنے ظلم بخش دے گا۔ وہ اپنی تباہی کو خود ہی دعوت دے رہے ہیں۔" (۱۲۵ اپریل ۱۹۷۱ء)

مساجد میں انسان کا قتل' چھوٹی بچیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ زیادتی' ماؤں کے جگر گوشوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالنا' نوجوانوں کا اغوا اور ان کا بہیمانہ قتل! 2009ء کا پاکستان 1971ء سے کتنا آگے بڑھ گیا ہے اور بلوچستان؟ تاریخ نے ہمیں سچ مچ نشان عبرت بنا دیا ہے۔

جہاں آرا امام ایک خاتون خانہ اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی جنت میں مگن ہیں کہ اچانک یکم مارچ 1971ء طلوع ہوتا ہے۔ جہاں آرا امام ایک نیک نفس بیوی اور شفیق ماں اور اس سے بھی بڑھ کر ایک سچی محب وطن۔ یکم مارچ سے سولہ دسمبر تک ان سارے دنوں اور راتوں سے گزرتی ہیں۔ اس عرصہ میں اپنے بڑے بیٹے اور اپنے شوہر کو کھونے کا صدمہ برداشت کرتی ہیں۔ 17 دسمبر سے اپنے چھوٹے بیٹے جامی کو وطن کی خدمت کے لیے وقف کرتی ہیں اور پھر اپنی زندگی بھی آزاد بنگلہ دیش کی نذر کر دیتی ہیں۔ ایک خاتون خانہ سے امن و انصاف کی مشعل بننے تک انہیں آگ اور خون کا دریا پار کرنا پڑتا ہے۔ آزادی کے بعد وہ ایک جان لیوا اور مہلک بیماری سے نبرد آزما ہوتی ہیں لیکن آرام و آسائش کو

ایک طرف رکھ کر قاتلوں اور ان کے آلہ کاروں کو بے نقاب کرنے اور انہیں انصاف کے کٹہرے تک لانے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ وہ ملک میں مذہبی انتہا پسندی اور جنون کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور اپنے نحیف ونزار بدن اور طاقتور روح کے ساتھ غیر مسلم اقلیتوں کی حفاظت کا پرچم بلند کرتی ہیں اور اسی جدوجہد میں اپنی جان' جان آفرین کے سپرد کر دیتی ہیں۔ قوم انہیں عزت واحترام کے طور پر شہید جنانی (شہید خاتون) کے خطاب سے یاد کرتی ہے اور آج ڈھاکہ میں ان کے نام سے قائم ''شہید جنانی جہاں آرا امام میوزیم'' اس جدوجہد اور ان قربانیوں کا زندہ ثبوت ہے جو اس بہادر خاتون نے اپنے وطن کے لیے کیں۔

یہ کتاب انہوں نے بنگلہ زبان میں لکھی تھی۔ اس کا ایک عدد انگریزی ترجمہ بھی دستیاب تھا لیکن میرا خیال تھا کہ انگریزی ترجمے سے اردو ترجمہ کروانے کی بجائے اسے براہ راست بنگلہ سے ترجمہ کیا جائے۔ میرے پرانے دوست منور مہدی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ جناب مفید الحق نے جو خود بھی بنگلہ کتابوں کے ایک بڑے ناشر ہیں' نے اس سلسلے میں دست تعاون دراز کیا۔ 96-1995 میں یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا۔ اس کی تدوین کرتے ہوئے میں نے اس امر کو پیش نظر رکھا کہ اردو ترجمہ بنگلہ انداز بیان سے قریب تر رہے اور اردو محاورہ کو اس طرح مسلط نہ کیا جائے کہ حقیقی بنگلہ روح غائب ہو جائے پھر بھی کہیں کہیں ضرورت کے مطابق اسے با محاورہ بنانا پڑا تا کہ ابلاغ میں وقت پیش نہ آئے اور قاری مصنفہ کے سادہ انداز ہ بیان کے ساتھ ساتھ اس کے معنی کی روح تک بھی پہنچ سکے۔

منور مہدی بنگلہ دیش کے نوجوان مصور ہیں۔ وہ ابتدا میں اپنے خاندان کے ساتھ لاہور اور اسلام آباد میں مقیم تھے۔ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں زیر تعلیم رہے لیکن 1980ء کی دہائی میں مستقل طور پر اپنے وطن بنگلہ دیش میں جا کر آباد ہو گئے۔ 1990ء کی دہائی میں جب پہلی بار میرا بنگلہ دیش جانا ہوا تو میں نے اُن سے اس ترجمے کی درخواست کی۔ جناب مفید الحق کے تعاون سے یہ کام جلد ہی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پہلے یہ ترجمہ کراچی کے ایک ماہنامہ میں قسط وار شائع ہوتا رہا لیکن پھر اسے روک کر کتابی صورت میں لانے کا خیال آیا۔ پاکستان کے اپنے معروضی حالات میں اس کی اشاعت میں تاخیر ہوتی رہی۔ ایک ناشر سے دوسرے ناشر -اور دوسرے ناشر سے تیسرے ناشر تک گردش کرتے ہوئے یہ مسودہ فرخ سہیل گوئندی تک پہنچا جسے وہ اپنے جمہوری پبلیکیشنز سے شائع کر رہے ہیں۔ میں اس کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میں جہاں آرا امام کے صاحبزادے جناب جامی' جہاں آرا امام میوزیم' جناب مفید الحق' لبریشن وار میوزیم' یو پی ایل کے جناب محی الدین اور کتاب کے مترجم منور مہدی کا بھی شکر گزار ہوں جن کی محبت' مہربانی اور مدد سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا اور آج یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

احمد سلیم

یکم دسمبر 2009ء

یکم مارچ ۱۹۷۱ء بروز پیر

رومی آج شام کو کرکٹ میچ دیکھ کر اپنے دوستوں کو گھر پر لے کر آئے گا، ہیم برگر کھلوانے کے لئے۔

غسل سے فارغ ہو کر بارہ بجے ''پرنما'' جناح ایونیو سنیک بار سے ڈنر رول خریدنے کے لئے نکلی۔ دو درجن ڈنر رول خرید کر سیدھی، گھر کے قریب واقع، نیو مارکیٹ چلی آئی۔ میں گزشتہ دو ہفتوں سے مختلف دکانوں پر مشرقی پاکستان میں تیار شدہ صابن، تیل، ٹوتھ پیسٹ، برتن مانجھنے کا پاؤڈر وغیرہ ڈھونڈ رہی تھی مگر مل نہیں رہا تھا۔ صرف ''ایوا'' نام کا برتن مانجھنے والا ایک پاؤڈر موجود تھا جو یہیں کا بنا ہوا تھا۔ گویا واحد سہارا۔ پیا کے نام سے ڈھاکے کی ایک ٹوتھ پیسٹ بازار میں آنے کی بڑی دھوم تھی لیکن وہ بھی خدا جانے کن مسائل کی وجہ سے آنہیں پا رہی تھی۔

گھر پہنچنے میں ڈیڑھ بج گیا۔ دروازہ کھولتے ہی بارک نے کہا ''اماں! صاحب کو فون کر لیجئے گا، کھانے پینے کا سامان خرید کر رکھنے کو کہہ رہے تھے۔ معلوم نہیں کہاں پر فساد چھڑ گیا ہے''۔

فساد ممکن ہے۔ پچھلے دو مہینوں سے تو ڈھاکہ تپی ہوئی کڑھائی بنا ہوا ہے۔ آفس فون کرتے ہی شریف نے بتایا ''دوپہر کے ایک بجے صدر یحیٰی نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا ہے۔ شہر میں ہر طرف شور وغل پڑ گیا ہے۔ لوگ گروہ در گروہ دفتروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ سٹیڈیم میں کرکٹ کا میچ رک گیا ہے۔ سارے تماشائی سلوگن دیتے ہوئے میدان سے باہر نکل آئے ہیں۔ یہاں موتی جھیل میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے۔ نیو مارکیٹ کی طرف سے کچھ نظر نہیں آیا کیا؟''

''میں بوکھلا گئی تھی..... اس وقت میں پچھلی طرف والی دکانوں میں تھی، اتنا غور نہیں کر سکی۔ ہو سکتا ہے وہاں کے لوگوں نے تب تک نہ سنا ہو۔'' اتنا کہہ کر مجھے کچھ یاد آیا اور میں یک دم چیخ اٹھی ''رومی، جامی..... وہ تو سٹیڈیم گئے ہوئے تھے۔''

شریف بولے، ''گھبراؤ مت! وہ نکل کر میرے آفس آئے تھے۔ جامی کو یہاں پر چھوڑ کر رومی اپنے یاروں کے پاس گیا ہے.... سنو! خاصہ ہنگامہ ہوگا۔ یہاں پر پہلے ہی مظاہرے شروع ہو گئے ہیں۔ سنا ہے بیت المکرم اور سٹیڈیم کی سب دکانیں بند ہو رہی ہیں۔ ہنگامہ بڑھنے پر ممکن ہے کرفیو لگا دیں۔ گھر پر کھانے پینے کا سامان تو موجود ہے نا؟ نہ ہو تو فوراً خرید لاؤ''۔

اسی وقت دوبارہ نکل پڑی۔ ایلیفنٹ روڈ پر آتے ہی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر بے تحاشہ ہجوم نظر آیا۔ لوگ سانسیں چڑھا کر خرید وفروخت میں مصروف تھے۔ دکاندار خریداروں کو بغیر رکے مسلسل سامان دیئے جا رہے تھے لیکن ہجوم کو نپٹا نہیں پا رہے تھے۔ میں نے رش کے اندر دھکم پیل کر کے... دو تین دکانیں گھوم کر بسکٹ، ٹوسٹ، ماچس، موم بتی، خشک دودھ، بیٹری اور ایسی ہی دوسری چیزیں خریدیں۔ گھر پہنچ کر بارک کو مٹی کے تیل کے لئے خالی کنستر دیا اور سبحان کے ہاتھوں میں بوری تھما کر چاول لانے کے لئے بھیج دیا۔

سارے کاموں سے نپٹتے نپٹتے شریف اور جامی دفتر سے آن پہنچے، تقریباً تین بجے۔ ٹیبل پر لگے ہوئے کھانے پر سے کپڑا اتار کر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا، ''اور کیا خبریں ہیں؟''

''شیخ مجیب نے ہوٹل پربانی میں پریس کانفرنس بلائی ہے۔ دفتر سے واپسی پر میں نے دیکھا ہوٹل کے سامنے والی تینوں سڑکیں مین روڈ تک لوگوں سے بھری ہوئی ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں یا پھر بانس کی لاٹھیاں ہیں۔ آفس سے نکل کر بھیڑ کی وجہ سے روزنامہ پاکستان کے دفتر کی طرف سے گاڑی نکال ہی نہیں سکا۔ بالآخر گورنمنٹ ہاؤس کے بازو والی سڑک پر سے نکل کر گلستان ہوتے ہوئے گھر پہنچا..... رومی اب تک نہیں آیا؟ شریف نے پوچھا۔

اب میں نے اطمینان سے کہا، ''لگتا ہے اس شور شرابے میں کہیں پھنس گیا ہوگا۔ میچ دیکھ کر واپسی پر دوستوں کو ہیم برگر کھلانے کے لئے گھر پر بلایا ہوا تھا۔ اب چونکہ میچ رک گیا ہے، ہوسکتا ہے جلدی ہی آجائے''۔

چار بجے..... پھر پانچ بج گئے..... رومی کی کوئی خبر نہیں۔ میں ساڑھے چار بجے سے پہلے دو درجن ہیم برگر بنا کر اوون کے اندر ہلکی آنچ پر رکھ چکی تھی۔ شام ڈھل کر رات ہوگئی تب کہیں آٹھ بجے کے بعد رومی کی شکل دکھائی دی.... وہ اکیلا ہی تھا۔ سہ پہر سے شام تک باغیچے میں ٹہلتے ٹہلتے میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس کی بجائے دل میں تشویش سر اٹھا رہی تھی۔ رومی کو دیکھ کر غصہ پھر سے ابھر آیا۔ میرے تیور دیکھ کر رومی نے دفاعی انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے ہونٹوں پر دل لبھانے والی مسکراہٹ پھیلائی اور بولا ''پہلے میری بات تو سن لیجئے..... ایک ہی دن کے اندر کتنے سارے واقعات پیش آئے ہیں..... ابھی میں آپ کو ساری صورتحال پر سکوپ نیوز دے سکتا ہوں۔ ویسے اگر چاہیں تو صبح تک انتظار کر لیجئے..... اخبارات کے لئے۔''

میں نے ہنسی چھپا کر تلخ انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا، ''سنیں تو ذرا کیا ہیں آپ کی سکوپ نیوز؟''

''بہت سی ہیں۔ سرے سے بتاتا ہوں۔ ایک بجے میں سٹیڈیم میں موجود تھا۔ بہت سے تماشائی اپنے ساتھ ریڈیو لائے ہوئے تھے۔ اجلاس کے التوا کا اعلان کانوں میں پڑتے ہی ہر طرف شور مچ گیا۔ میدان میں موجود چالیس پچاس ہزار لوگ اکٹھے ''جوئی بنگلہ'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے میدان چھوڑ کر باہر آگئے۔ میں جامی کو ابو کے دفتر میں چھوڑ کر خود یونیورسٹی جا پہنچا۔ وہاں پر بھی ایک ہی صورتحال۔ ریڈیو پر اعلان سنتے ہی سب لڑکے ٹولیوں کی شکل میں کلاسوں اور باروں سے نکل کر برگد کے پیڑ کے نیچے اکٹھے ہونے لگے۔ میں جب پہنچا لڑکے چیونٹیوں کی طرح چاروں سمت سے نکلتے آرہے تھے۔ یوں لگا جیسے سمندر کی ایک ایک لہر آکر، بڑ کے تلے، ٹوٹ رہی ہو۔

چھتر الیگ اور یونین کے لیڈروں نے موقع پر فیصلہ سنایا کہ سہ پہر کے تین بجے پلٹن میدان میں اجلاس ہوگا"۔ رومی بے تکان بولتا گیا۔ میں نے ٹوکا۔

"پلٹن میں میٹنگ ہوئی؟ ڈیڑھ دو بجے اعلان کیا اور تین بجے اجلاس بھی ہو گیا؟"

"اور نہیں تو کیا؟ دیکھے بغیر تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اتنے ے ے ے زیادہ لوگ۔ اتنے لووو وگ..... اف اللہ۔ مگر اس میٹنگ سے پہلے شیخ مجیب نے پربانی میں پریس کانفرنس کی۔ ویسے صبح ہی سے وہ اپنی پارٹی کے پارلیمانی اجلاس کے سلسلے میں وہیں پر موجود تھے۔ یحییٰ کے اعلان کے بعد ایک گھنٹے کے اندر پچاس ساٹھ ہزار لوگوں نے کندھوں پر بانس کی لاٹھیاں اور لوہے کے راڈ اٹھائے اور پربانی کے سامنے والی ساری سڑکیں بند کر دیں۔ اس قدر نعرے بلند ہوئے کہ خدا کی پناہ! پاکستان کا جھنڈا اور جناح صاحب کی تصویر کو بھی آگ لگائی گئی۔ شیخ صاحب نے فوراً صحافیوں کو بلا کر ہڑتال اور سات تاریخ کو ریس کورس گراونڈ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔" رومی پھر شروع ہو گیا۔

دھیرے دھیرے دل نرم پڑتا گیا۔ شریف نے بھی پربانی کے سامنے مجمعے کا ذکر کیا تھا۔ پھر بھی چہرے پر خفگی کا تاثر برقرار رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "ایسے جھمیلوں کے بیچ بھی دو درجن ہیم برگر تیار کیے۔ مگر تم میں سے کسی کو یاد تک نہ رہا۔"

"مجال ہے امی جو یاد رہ جاتا۔ سارے شہر میں ایسا غل غپاڑا مچا ہوا ہے۔ گلستان کے موڑ پر لگے ہوئے کمان کے اوپر کھڑے ہو کر متیا چودھری نے ایسی آتش فشاں تقریر کی کہ تم سنتیں تو تمہارے وجود میں بھی آگ لگ جاتی۔ خواہ مخواہ تو لوگ انہیں "اگنی کنیا" نہیں کہتے۔"

مجھے پھر سے غصہ آ گیا۔ "اب تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو اکیلا اتنی ساری جگہوں پر کیسے گیا، ایک ہی پہر میں؟"

رومی میرے لہجے پر کافی حیران ہوا... بولا "ویری سمپل..... دوست کے ساتھ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر ساری جگہوں پر گھومتے رہے۔ ہم کسی ایک جگہ پر بیٹھ کر لیڈروں کی تقریریں تھوڑی سن رہے تھے۔ سٹیڈیم سے یونیورسٹی، وہاں سے پربانی ہوٹل، پربانی سے گلستان چوک، وہاں سے پھر پلٹن..... بس چرخے کی طرح گھومتے رہے۔"

"سارے دن میں کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا؟"

"کسی نے بھی تو نہیں کھایا۔ ایک بجے سے پہلے چائے بسکٹ وغیرہ جسے جو کچھ بھی ملا کھا لیا تھا۔ اس کے بعد سے بس فاقہ، بانس کی لاٹھیاں، لوہے کی سلاخیں..... جسے جو کچھ ملا کندھے پر ڈال کر سڑک پر نکل آیا۔ اتنی دیر میں اب محسوس ہو رہا ہے کہ دن بھر سے کچھ نہیں کھایا۔"

"چل کر پہلے کھانا کھا لو۔ کھانے سے فارغ ہو کر باقی باتیں سنوں گی۔"

"مجھے تو ہیم برگر ہی دے دو۔ ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ تم سب لوگ بھی رات کے کھانے میں یہی کھا لو۔"

''سارے خاندان والے مل کر کھائیں تب بھی ختم نہیں ہوں گے۔''

''فکر مت کرو، میں اکیلا آدمی درجن کھا جاؤں گا۔''

شیخ مجیب نے اگلے روز ڈھاکہ شہر میں اور اس سے اگلے روز صوبہ گیر ہڑتال کی کال دی۔ ۷ مارچ کو ریس کورس گراؤنڈ میں اجتماع عام کا اعلان بھی کیا۔ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے، کھانے کی میز پر بیٹھے رات گئے دیر تک اس بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ رات کو تقریباً بارہ بجے سونے کے لئے کمرے میں گئی مگر نیند نہیں آئی۔ دور دور سے شور اور نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اتنی رات کو بھی لوگ سڑکوں پر مظاہرے اور نعرے بازی میں مشغول تھے۔ ''جوئی بنگلہ'' کے علاوہ دوسرے نعرے سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سینکڑوں مشترکہ آوازوں کی گونج سمندر کی سرکش لہروں کی طرح پردہ سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ماحول میں ان جانی سی دہشت در آئی تھی جس سے سارا جسم تھر تھرانے لگا۔ گہری رات کو نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت کے بیچ یوں لگا جیسے گولیاں چلنے کی آواز آ رہی ہو۔

۲ مارچ ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج ہڑتال ہے۔صبح ناشتے سے فارغ ہو کر سب لوگ اکٹھے گھر سے باہر نکل کر ایلیفنٹ روڈ کے بیچ میں کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے۔اس دوران میں ایک بھی گاڑی، رکشہ حتیٰ کہ کوئی سائیکل بھی سڑک پر چلتی نظر نہیں آئی۔ یوں لگا جیسے یہ سڑک میرے گھر کا صحن ہو۔ ہڑتال کے روز خالی سڑک کے میدان میں چلتے ہوئے ہماری طرح اور لوگ بھی عیاشی محسوس کر رہے تھے۔ محلے کے کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ چلتے چلتے نیو مارکیٹ کی طرف نکل آئے۔ حیرت کی بات ہے آج کچی سبزی والوں نے بھی دکان نہیں کھولی۔ ہمیشہ سے دیکھ رہی ہوں ہڑتال کے روز کم از کم سبزی والے دکانیں کھول کر بیٹھتے ہیں۔آج وہ بھی نہیں بیٹھے۔شیخ مجیب سمیت تمام طلباء مزدور اور سیاسی جماعتوں نے سارے شہر میں، تمام سواریوں، بازاروں، دفاتر، عدالتوں اور کارخانوں میں ہڑتال کی مکمل پابندی کرنے کی درخواست کی ہے۔عوام ان کے احکامات کو تہہ دل سے قبول کر کے ہڑتال پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔

نیو مارکیٹ کی طرف سے مڑ کر، الٹی طرف تک ٹہلتے ہوئے باہر پل تک گئے۔ ہمارے ساتھ کٹی بھی تھی۔راستے میں لوگ اس کے سنہرے بالوں کو ٹیڑھی نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے سوچا اب جلدی سے گھر چلا جائے۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی رومی نے ''ایک اور پیالی چائے کی ہو جائے'' کہتے ہی زور سے پکارا ''س...ب...ح...ا...ن۔''

سبحان کمرے میں داخل ہوا تو میں نے کہا ''پانچ کپ چائے بنالاؤ۔''

سبحان چائے بنا کر لے آیا۔سنٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ کر رومی کی طرف تکتے ہوئے اس نے کہا ''بھیا، تین بجے پلٹن کی میٹنگ میں جائیں گے؟''

رومی نے سنجیدگی سے پوچھا، ''کیوں تم جانا چاہتے ہو کیا ہمارے ساتھ؟''

سبحان منہ بسور کر بولا، ''امی جی اگر اجازت دے دیں۔''

میں نے ہنسی چھپا کر سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے کہا ''جلدی سے کھانا پکا کر فارغ ہو سکو تو چلے جانا۔''

سبحان احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے ہنس دیا اور کچن کی طرف لپکا۔

آواز مدہم کر کے رومی نے کہا" بے چارے میں خاصا سیاسی شعور ہے۔"

رومی چائے ختم کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا" امی، میں ذرا بڑ تلے سے گھوم کر آتا ہوں۔ چھتر الیگ اور ڈکسو (ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین) نے میٹنگ کال کی ہے"۔

میں نے اعتراض کیا" دوبارہ اتنی دور پیدل چل کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو کونسا کسی پارٹی کا رکن ہے۔ تیرا کیا کام ان میٹنگوں سے؟

رومی نے کہا،" امی، کیا اب بھی مسئلہ صرف پارٹیوں تک محدود رہ گیا ہے؟۔ اب تو" وہ اگن پھیل گئی سب طرف۔"

رومی میں یہ ایک عادت ہے کہ باتوں باتوں میں انگریزی اور بنگالی کی نظموں میں سے اشعار اور مصرعوں کا حوالہ دیتا ہے۔ میں نے لاچار ہو کر کہا، جاتے ہو تو جاؤ لیکن واپسی میں دیر مت کرنا۔ جو مرضی آئے کرو مگر کھانا پینا اپنے وقت پر لازمی ہے۔ سمجھ گئے؟"

"اچھا امی" کہہ کر رومی نکل گیا۔

میں نے اخبار کی طرف نظر ڈالی۔ ڈھاکے میں جتنے بھی طلباء، مزدور اور سیاسی جماعتیں ہیں آج سب نے میٹنگ کال کی ہے۔ مشرقی پاکستان چھتر الیگ اور ڈکسو نے مشترکہ طور پر گیارہ بجے بڑ تلے اور تین بجے پلٹن میدان میں۔ نیپ نے گیارہ بجے شہید مینار اور سہ پہر کو پلٹن میدان میں۔ نیپ کے ہمراہ موجود ہیں مشرقی پاکستان چھتر ایونین، ٹریڈ یونین سنٹر اور کسانوں کی تنظیم۔ بیت المکرم کے احاطے میں جاتیو لیگ کا اجلاس سہ پہر ساڑھے تین بجے۔ نئی تنظیم فارورڈ سٹوڈنٹس بلاک کا اجلاس بیت المکرم ہی میں چار بجے۔

تمام پارٹیاں میٹنگ کے بعد احتجاجی جلوس نکالیں گی۔

صدر یحیٰی نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر کے مکھیوں کے چھتے پر روڑہ مارا ہے۔

تین بجے رومی، جامی، شریف، سبحان پلٹن جانے کے لئے نکلے۔ گئے رکشے پر۔ گاڑی نہیں نکالی۔ اتنے رش میں گاڑی نکالنا سہولت کی نسبت جھمیلا زیادہ ہے۔ کٹی نے پوچھا کہ وہ میٹنگ میں جا سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے صبح کے تجربے کو یاد کرتے ہوئے قدرے جھجک کر کہا،" تم نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ بھیڑ میں کیا جانے کب چپٹی ہو جاؤ۔ دیکھو میں بھی تو نہیں جا رہی"۔ کٹی سمجھدار لڑکی ہے۔ اصل بات سمجھ کر منہ بسورتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بارک بھی جانا چاہتا تھا۔ ابا جان اور بچے سو کر اٹھیں گے۔ ان کو بستر سے اٹھوانا، منہ ہاتھ دھلوانا، کھانا کھلوانا..... یہ سارے کام سوچتے ہوئے میں نے اسے جانے نہیں دیا۔ ویسے بھی مجھے ذرا امی کے گھر جانا تھا۔ پیدل جانا مشکل ہے اسی لئے صبح نہیں گئی۔ دو بجے کے بعد سے رکشے چل رہے ہیں۔

ساڑھے چار بجے بابا کو ناشتہ، چائے وغیرہ پلوا کے کچھ دیر ان سے بات چیت کی۔ اس کے بعد بارک کو ان کے پاس بٹھا کر امی کے گھر گئی..... دھان منڈی چھ نمبر روڈ پر۔

۳ مارچ ۱۹۷۱ء بروز بدھ

کل رات ذرا بھی نیند نہیں آئی۔ رات آٹھ بجے اچانک کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ سارا دن مسلسل میٹنگ در میٹنگ ہوتی رہی۔ میٹنگ کے بعد لاٹھی، ڈنڈے، پھٹے اور سریوں کے ساتھ احتجاجی مظاہرے۔ شام کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ شام کے بعد مشعل بردار جلوس بھی نکالے گئے۔ ہم نے ریڈیو پر کرفیو کا اعلان نہیں سنا تھا۔ اس لئے سمجھ نہیں سکے کہ زیادہ تر نعرے کرفیو کے خلاف بلند کئے جا رہے تھے۔ میں سمجھتی رہی دن کے مظاہروں کا ہی تسلسل چل رہا ہے۔ اچانک سائرن کی تیز آواز پر چونک گئی۔ کیا ہوا؟ کیا سلسلہ ہے؟ اِدھر اُدھر فون کر کے معلوم کیا کہ اجراء کرفیو کا سائرن ہے۔

رات گیارہ بجے کے قریب دور سے مائک پر کرفیو جاری ہونے کا اعلان کانوں میں آیا۔ یوں گمان ہوا جیسے "بلاکا" نیو مارکیٹ والی سڑک اور ہمارے گھر سے شمال کی جانب اقبال ہال کے سامنے والی سڑک پر سے آواز آ رہی ہو۔ ساتھ ہی بہت سارے کنٹھوں کے مشترکہ نعرے زیادہ واضح ہو کر سنائی دینے لگے۔ اس کا مطلب ہے کرفیو کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے نعرے لگائے جا رہے ہیں اور مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ عجیب بے چینی سی ہونے لگی۔ سوچا صورت حال کے بارے میں پتا لگانے کے لئے کچھ لوگوں کو فون کر لوں..... گلشن میں دیبا، مدن موہن کو، بساک روڈ پر منورہ کو اور اندرا روڈ کی کملا کو۔

دیبا نے بتایا کہ اس کی طرف سڑکوں پر جلوس وغیرہ نہیں ہے البتہ دور سے نعروں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ "ہمارے پچھلی طرف انڈسٹریل ایریا ہے نا اس لئے۔"

منورہ فون اٹھا کر رو دی۔ "کیا بیت رہی ہے آپا؟" کوئی بھی کرفیو کی پابندی نہیں کر رہا۔ جھنڈ در جھنڈ لوگ سڑکوں پر نکل کر نعرے لگا رہے ہیں۔ پولیس بھی گولیاں چلا رہی ہے۔ گولیاں کھا کر لوگ اور بھی طیش میں آتے جا رہے ہیں۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے ہیں۔ اس سب کچھ کے اندر میرا بھائی بھی تو گیا ہوا ہے۔ اللہ معلوم زندہ بھی ہے یا گولی کا نشانہ بن کر کسی سڑک پر مردہ پڑا ہے۔ کیا صورت بنے گی آپا؟"

منورہ کو روتے سن کر دماغ سن ہو گیا۔ کسی اور کو فون کرنے کا دل نہیں چاہا۔ ساری رات کانوں میں نعروں کی مشترکہ گونج سنائی دیتی رہی۔

صبح اخباروں میں پچھلی رات کے مظاہرے اور گولیوں کے بارے میں تفصیلی خبریں پڑھیں۔

سٹیڈیم، نواب پور، ٹوٹینی سرکلر روڈ، وجہری ساہا سٹریٹ، گرین روڈ، لٹھل باگان، کلا باگان، نیو مارکیٹ، فرم گیٹ.....ڈھاکہ کے تقریباً سارے علاقوں میں کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ متعدد لوگ مارے گئے، ان سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہو کر ہسپتالوں میں بھرتی کئے گئے۔

اخباروں میں ایک اور خبر بھی نظر آئی۔ بکس کے اندر شائع کی گئی ہے:

۱۱۰ نمبر فوجی احکام کا نفاذ۔

''ب'' علاقے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، لفٹننٹ جرنیل صاحبزادہ محمد یعقوب خان نے گزشتہ رات ۱۱۰ نمبر فوجی احکام کے بل بوتے پر پاکستان کی سالمیت یا خودمختاری کے خلاف کوئی خبر، اظہار رائے، یا تصویر کی اشاعت پر پابندی نافذ کردی ہے۔''

احکام کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں دس سال تک کی قید ہوگی۔

اس خبر کو پڑھ رہی ہوں اور سینے میں دم اٹکتا جا رہا ہے۔ سوچا منورہ کو فون کر کے اس کے بھائی کی خیریت معلوم کرلوں۔ بے چارہ گھر واپس پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ فون کے قریب جا کر بھی فون اٹھا نہ سکی۔

رومی کی فکر میں بڑی بے چینی لگی رہتی ہے۔ سارا دن گیند کی طرح پورے شہر میں گھومتا پھرتا ہے۔ جانے کب کیا ہو جائے۔ دوستوں کو بلا کر گھر پر دعوت کرنے کو کہہ رہی ہوں۔ پہلے اچھل کر قبول کرتا تھا۔ اب کہتا ہے وقت نہیں ہے۔

آج بھی تقریباً سارا دن میٹنگ اور مظاہرے چلتے رہے۔ گزشتہ رات گولیوں سے ہلاک ہونے والوں کی آٹھ عدد لاشیں کندھوں پر اٹھائے غمزدہ عوام جلوس کی شکل میں ڈھاکہ کی مختلف سڑکوں پر گردش کرتے رہے۔ بالآخر شہید مینار پر متیں رکھ کر سب نے یک جہتی کے ساتھ مشرقی بنگال کی خودمختاری حاصل کرنے کا عہد کیا۔

سہ پہر کے وقت پلٹن کے عوامی اجلاس میں ان لاشوں کو لے جایا گیا۔ وہاں پر وسیع تر عوامی سمندر نے شہیدوں کے آغاز کردہ مقصد کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اجلاس میں شیخ مجیب نے مکمل عدم تعاون کے لئے کہا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک عوام کے منتخب نمائندوں کے حق میں اقتدار منتقل نہیں کیا جاتا، بنگالی قوم ایک پیسہ بھی ٹیکس نہیں دے گی۔ انہوں نے حکومت سے فوجیوں کو بیرکوں میں واپس بلانے کے لئے کہا اور بنگالی عوام سے پرامن اور منظم طریقے پر بلاتشدد تحریک عدم تعاون جاری رکھنے کے لئے کہا۔

شام کے بعد رومی گھر پہنچا تو اس کی زبانی ساری باتیں سنیں۔ اور بھی سنا ایک نئے جھنڈے کے بارے میں۔ گذشتہ روز پہلی مرتبہ عوامی اجتماع میں اس جھنڈے کی نمائش کی گئی۔ آج پلٹن کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شیخ صاحب کی موجودگی میں ''امار سونار بنگلہ امی تمائی بھالوباسی'' یہ ترانہ گایا گیا۔ اور اس کے بعد آزاد بنگال کا نیا جھنڈا بلند کیا گیا۔

میں نے لرز کر پوچھا، آزاد بنگال کا جھنڈا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ کیسا ہے دیکھنے میں؟''

''ٹھہرو میں ڈرائینگ کر کے بتاتا ہوں۔ایک ٹکڑا کاغذ اور چند رنگین پنسلیں لے کر رومی آزاد بنگال کا جھنڈا بنانے بیٹھ گیا..... ہرے کے اوپر سرخ رنگ کا سورج نما دائرہ۔دائرے کے اندر پیلے رنگ میں مشرقی بنگال کا نقشہ۔''

میں نے کہا''اب تک تو خودمختاری کی بات سنتی آرہی تھی۔منتخب نمائندوں کے ہاتھوں انتقال اقتدار کی بات۔یہ اچانک آزادی کی بات کہاں سے آن پڑی۔''

''تم کوئی خبر نہیں رکھتیں۔آزاد بنگال کا مطالبہ تو بہت پرانا سلسلہ ہے۔بہت عرصے سے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔پچھلے سال نومبر کے طوفان کے بعد سے پھٹ پڑا۔تمہیں یاد نہیں ۱۸ نومبر کو بھاشانی صاحب متاثرہ علاقوں کے دورے پر جانے لگے تو ان کی پرواز روک دی گئی۔بعدازاں حکومت نے انہیں جانے تو دیا مگر اس سارے واقعے پر گھر گھر کس قدر نکتہ چینی ہوئی تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا؟اس واقعہ کے بعد ہی چار دسمبر کا وہ اجلاس جس میں نیپ کے ساتھ جاتیو لیگ اور دیگر کچھ جماعتیں مشترک تھیں۔اسی اجلاس میں بھاشانی صاحب نے مشرقی بنگال کو آزاد اوخودمختار مملکت کی حیثیت دینے کا مطالبہ پیش کیا تھا۔اس کے بعد اب عوامی لیگ کے انتہا پسند سیکشن کی طرف سے آزاد بنگال کے مطالبے کو اجاگر کیا جارہا ہے۔چار خلیفے اعلان آزادی کے لئے بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔''

''چار خلیفے؟''

''جیسے کچھ بھی نہ جانتی ہوں۔ا۔س۔م۔ب، شاہ جہان سراج، عبدل قدوس، مکھن اور نور عالم صدیقی.....ان چاروں طلباء رہنماؤں کو سب چار خلیفے کہتے ہیں۔شاہ جہان سراج ہی نے آج پلٹن کی میٹنگ میں جھنڈا لہرایا تھا۔''

''شیخ صاحب نے کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں بولے۔البتہ زیادہ خوش بھی نہیں ہوئے۔ان کی شکل دیکھ کر پتہ لگتا تھا۔''

''خوش ہوتے بھی کیسے؟فوری طور پر آزادی کا اعلان کر دینا بہت رسکی معاملہ نہیں ہے کیا؟''

''یقیناً رسکی۔مگر امی ہر واقعہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا ہے۔آبشار کی طرح۔آبشار جب بلند پہاڑ سے نیچے کی طرف بہتا ہے مجال ہے جو کوئی قوت اس کی روانی کو روک لے۔ہمارے ملک کے عوام اس وقت اس آبشار کی طرح ایک ناقابل فراموش منزل کی طرف سبک روی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔شائد اب انہیں روکنا ممکن نہ ہو۔''

۴ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

گزشتہ رات بھی ایک جیسے واقعات رونما ہوئے۔ مشتعل عوام نے دوبارہ کرفیو کو نظر انداز کرتے ہوئے مظاہرے کئے۔ فلک شگاف نعروں نے شاہراہیں اور بستیاں ہلا کر رکھ دیں اور لازمی ردعمل کے طور پر گولیاں کھا کر سیاہ تارکول کی سڑکوں کو رنگ دیا۔

آج صبح چھ بجے سے دوپہر کے ڈھائی بجے تک ہڑتال رہی۔ گزشتہ تین روز سے صبح شام میٹنگ اور مظاہروں میں شرکت کر کے صاف پتہ چلتا ہے کہ رومی خاصا تھک گیا ہے۔ آج صبح سے گھر پر ہی بیٹھا ہے۔ میرے دل کو بھی تسلی ہے۔ چنکو آیا ہوا ہے۔ دونوں دوست کھانے کی میز پر بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ گپ شپ کے لئے کھانے کی میز پر بیٹھنا ہی رومی کو زیادہ پسند ہے۔ لاکھ کہہ کر بھی اسے بیٹھک کے صوفوں پر نہیں بٹھا پاتی۔

چند ماہ پہلے ''ویٹنگ فار گوڈو'' میں اداکاری کر کے چنکو نے بڑی تعریف کمائی۔ ہوٹل انٹرکان کے ساؤتھ بال روم میں یہ ناٹک سٹیج کیا گیا تھا۔

فوجیوں کی گولی سے ہلاک ہونے والے شہیدوں کی آج بیت المکرم میں غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی جائے گی۔ نماز کے بعد مزاحمتی مظاہرہ ہوگا۔

بارہ بجے کے قریب چنکو چلا گیا۔ رومی اور شریف نے نہا کر ہلکے سینڈوچ سے لنچ کیا۔ پیدل چل کر بیت المکرم تک جائیں گے اس لئے ہلکا کھانا کھایا۔

سہ پہر کے وقت میں اور جامی رکشے پر نکلے۔ مالی باغ چوک کے ٹریفک آئلنڈ پر فاروق اقبال کی قبر دیکھنے کے لئے۔ دو تاریخ دوپہر کے بعد دوسرے طلباء کے ساتھ فاروق اقبال بھی سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔ موقع پر ملٹری پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ غمزدہ طلباء اور عوام نے اسی چوک کے ٹریفک آئلنڈ پر اسے دفنا دیا۔

سڑک کے مختلف مقامات پر مضبوط رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں اس لئے ہم نے گاڑی نہیں نکالی۔ ایک ایک رکاوٹ کے قریب آ کر رکشہ سے اتر جاتے اور پیدل رکاوٹ کی دوسری طرف جا کر ایک اور رکشے پر سوار ہوتے۔ اس طرف چند رکاوٹیں بڑی عمدہ چیز سے بنائی گئی ہیں..... تیل گاڑی کی بگھیاں۔ جامی نے بتایا دو تاریخ سہ پہر کے وقت مالی باغ لیول کراسنگ پر ایک ریل گاڑی کو روکا گیا۔ اس کے بعد کھینچ تان کے ایک ایک بگھی سے تین چار جگہوں پر رکاوٹیں تیار کی گئیں۔

فاروق کی قبر پر پہنچ کر دیکھا قبر کے گرد رسوں سے ریلنگ بنائی گئی ہے۔ اگر بتی جل رہی ہے۔ چاروں جانب بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ شام ہونے والی ہے۔ چند لوگوں نے موم بتیاں جلا دیں۔ دو مولوی صاحبان قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے دو بڑے سائز کی موم بتیاں جلا کر ان کے سامنے رکھ دیں۔

آج رات کو بھی کرفیو ہے۔

۵ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج بھی چھ سے دو بجے تک ہڑتال ہے۔

شیخ مجیب نے تنخواہیں وصول کرنے میں سہولت کے لئے اور خصوصی نوعیت کے کام جاری رکھنے کے لئے تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر، دوپہر کے ڈھائی بجے سے چار بجے تک کھلے رکھنے کی ہدایت جاری کی ہے۔ راشن کی دکانیں بھی ان ہی اوقات میں کھلی رہیں گی۔

بینکوں کے اوقات بھی وہی ہیں۔ ڈھائی سے چار بجے کے درمیان پیسے نکالے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ایک وقت میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں۔ سوچنے میں ہی مزا آرہا ہے..... دوپہر کے بعد بینک۔ شیخ صاحب کے ایک ایک حکم پر چیزیں کیسے الٹے قدم چلنے لگی ہیں۔

ایمرجنسی سروس کے طور پر ہسپتال، ادویات کی دکانیں، ایمبولنس، ڈاکٹر اور ان کی گاڑیاں، اخبارات اور ان کی گاڑیاں، پانی، بجلی، ٹیلیفون، فائر بریگیڈ کا عملہ، جمعدار اور کوڑا پھینکنے والے ٹرک..... یہ سب ہڑتال کی پابندی سے مستثنا ہیں۔

آج مسجدوں اور مندروں میں خاص دعائیں کی جائیں گی۔ غسل کر کے پونے ایک بجے شریف، رومی، جامی، سبحان سب لوگ محلے کی ایروپلین مسجد میں گئے۔

بعدازاں ڈھائی بجے کھانا کھا کر شریف دفتر کے لئے روانہ ہوئے۔

آج سہ پہر کے چار بجے توپخانہ روڈ پر ادیبوں کی تنظیم کی میٹنگ ہے، میٹنگ کے اختتام پر وہاں سے جلوس کی شکل میں شہید مینار جایا جائے گا۔ میں ساڑھے پانچ چھ بجے کے درمیان سیدھی شہید مینار جاؤں گی۔ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے زیادہ چل نہیں پاتی۔

پچھلے چند دنوں میں ان ہی الجھنوں اور پریشانیوں کے باعث میں کٹی کو بنگلہ نہیں پڑھا سکی۔ آج شریف کے جانے کے بعد اس کو لے کر بیٹھی ہوں۔ کٹی امریکن لڑکی ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ بنگالی کے ڈاکٹر منیر چودھری کے ماتحت ''علم لسانیات میں بنگالی زبان کا درجہ'' کے موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے ایک سکالرشپ پر دسمبر میں ہمارے ملک آئی ہے۔ نو زبانیں جانتی ہے۔ بنگالی ٹوٹی پھوٹی سی بول لیتی ہے۔ مختصر وقت میں بنگلہ سیکھنے کے لئے کسی بنگالی کنبے کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی کٹی نے۔ چنانچہ منیر صاحب نے کہا کہ اسے کوئی بنگالی کنبہ تلاش

کردوں۔ تین چار جگہوں پر کوشش کرنے کے باوجود نہ ملنے پر بالآخر اپنے ہی گھر رکھ لیا ہے اسے۔

ہفتے میں تین دن کٹی کو بنگلہ پڑھاتی ہوں۔ گھر پر سب لوگوں کے ساتھ ہر وقت بنگلہ بولنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ مگر آج اس نے بنگلہ بولنے یا پڑھنے کی ذرہ بھی کوشش نہیں کی۔

براہ راست انگلش میں سوال کر بیٹھی، ''اچھا امی جب میں شروع شروع میں آئی تھی راستے میں مجھے دیکھ کر لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ میرے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ مگر اب مجھے دیکھ کر بے زار سے کیوں ہوتے ہیں؟ خفا ہو کر نہ جانے کیا کچھ کہتے رہتے ہیں۔''

میں مشکل میں پڑ گئی۔ بہت حساس بچی ہے۔ ضدی بھی۔ اک لمحہ خاموش رہ کر ذہن میں جملہ سجا کر میں بولی ''اس سوال کا جواب دینے سے پہلے تمہیں اس ملک کی گزشتہ پچیس تیس سال کی تاریخ اور سیاسی صورتحال کے بارے میں اچھی طرح سمجھانا ہوگا۔''

میٹنگ پر جانا رہ گیا۔ کٹی کو سمجھاتے سمجھاتے شام گزر کر رات ہوگئی۔

۶ مارچ ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

چھ سے دو تک ہڑتال کا سلسلہ جاری ہے۔

شریف اور رومی آج صبح ٹہلتے ٹہلتے ''بلڈ بینک'' جا کر خون کا عطیہ دے آئے ہیں۔ جامی کم سنی کے باعث اور میں خون کی کمی کی وجہ سے نہ جا سکے۔

پچھلے روز کی گفتگو کے بعد سے کٹی گم سم سی ہوگئی ہے۔ شریف وغیرہ عطیہ دینے کے لئے جا رہے تھے تو وہ جس طرح کا منہ بنا کر ان کی طرف دیکھ رہی تھی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بھی خون کا عطیہ دینے کے لئے جانا چاہتی ہو۔ وہ تو شکر ہے کہ اس نے آخر تک منہ نہیں کھولا۔

کٹی کے بارے میں سوچ کر مجھے بہت برا لگ رہا ہے۔ یہاں پر آنے کے پندرہ دن بعد سے ہی اس نے مجھے ''امی'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ مہینے ڈیڑھ سے شریف کو بھی ''ابو'' پکار رہی ہے۔ ہمارے کنبے کے ساتھ وہ گھل مل جانا چاہتی ہے مگر اس کے سنہرے بال اور نیلی آنکھیں راہ چلتے لوگوں کے ماتھے پر بل ڈلوا دیتی ہیں۔ محلے والے بھی اب اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ گھر پر آئے ہوئے مہمان بھی اسے دیکھ کر بے چین سے ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ جب آپس میں بات چیت میں مگن ہوں ایسے وقت میں کٹی آ کر پاس کھڑی ہو جائے تو ہم شش و پنج کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مادری زبان میں جتنا دل کھول کر بات کرنا ممکن ہے، انگریزی بولتے وقت گفتگو میں وہ روانی نہیں رہتی چنانچہ بات چیت میں رخنہ آ جاتا ہے۔ پھر وہ شک کرنے لگتی ہے کہ شائد ہم اسے دیکھ کر گفتگو کا موضوع بدل رہے ہیں۔ بنگلہ میں گفتگو جاری رکھیں تو بھی ساری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں تب الٹا مائنڈ کر بیٹھتی ہے۔ عجیب سی کشمکش میں پڑ گئے ہیں۔

آج دوپہر ایک بج کر پانچ منٹ پر صدر یحیٰ قوم سے خطاب کریں گے۔ شریف ساڑھے بارہ بجے سے ہی غسل سے فارغ ہو کر تیار بیٹھے ہیں۔ صدر صاحب کیا فرمائیں گے؟ سننے کے لئے سب لوگ بے تاب ہیں۔ یکم تاریخ کے اعلان نے تو قیامت بپا کر دی تھی اب دوبارہ وہ کیا کہیں گے اس پر ہم نے بھی بہت قیاس آرائی کی۔ ریس کورس کے اگلے عوامی اجتماع میں شیخ صاحب کونسا لائحہ عمل اختیار کریں گے اس پر بھی عوام کے درمیان بحث و مباحثہ جاری ہے۔ یکم تاریخ کو پربانی ہوٹل میں انہوں نے کہا تھا کہ بنگال کے عوام کے لئے اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل کرنے کے لئے وہ اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سات تاریخ کے

اجلاس میں اعلان کریں گے مگر ان چند دنوں کے اندر تو ہوا مختلف سمت میں چلنے لگی ہے۔ اتنے جلسے، جلوس، مزاحمتی مظاہرے ہو رہے ہیں..... کرفیو کی خلاف ورزی کے نتیجے میں فوج کی گولیوں سے سینکڑوں لوگ ہلاک ہوئے ہیں..... اب اس کے بعد شیخ صاحب کس بات کا اعلان کریں گے..... اس بارے میں عوام میں اختلاف رائے موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کل وہ آزادی کا اعلان کر دیں گے اور کوئی رائے پیش کرتا ہے کہ نہیں، ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ عوام کے منتخب نمائندہ ہیں۔ اکثریت حاصل کرنے والی جماعت کے رہنما ہیں۔ مطالبوں کی بنیاد پر وہ حکومت قائم کریں گے۔ آزادی کا اعلان حکومت سے بغاوت کے مترادف ہوگا۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگلے روز کے اجلاس سے خائف ہو کر یحییٰ آج عوام سے خطاب کرنے والے ہیں۔

خطاب سننے کے بعد لوگوں کے جذبات مجروح اور مشتعل ہوئے ہیں۔ میں نے ہنس کر شریف سے کہا، ''تم کیا توقع کر رہے تھے کہ یحییٰ ''آؤ سکھی آدھے آنچل پر بیٹھو'' کہہ کر مجیب کو حکومت قائم کرنے کی دعوت دیں گے؟''

''اس حد تک تو توقع نہیں تھی مگر کم از کم اتنے خشک لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ کریں گے ایسا بھی نہیں سوچا تھا۔ پورے مسئلے کے لئے قصوروار ٹھہرا کر ہمیں جس طرح سے انہوں نے برا بھلا کہا ہے اس کے ہم بالکل بھی مستحق نہیں ہیں۔ موجودہ صورتحال کے ذمہ دار تو وہ خود ہی ہیں۔

''جو بھی ہو..... خوفزدہ وہ ہوئے ہیں۔ سنا نہیں کہ ۲۵ مارچ کو اجلاس بلانے کا اعلان کیا ہے۔''

رومی نے اختلاف کا اظہار کیا، ''اور فوج کے ذریعے ہمیں سیدھا کرنے کی جو دھمکی دی ہے، اس کا کیا ہوگا.....؟''

انہی باتوں پر غور و فکر کرتے ہوئے دوپہر کا کھانا مکمل ہوا۔ شریف اور رومی کو باہر جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر میں نے کہا، ''کہاں جایا جا رہا ہے؟''

''دفتر۔''

''دفتر؟ آج تو سنیچر ہے۔ ہاف ڈے آفس! دوپہر کے بعد دفتر کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

رومی نے ہنس کر جواب دیا، امی بھول گئی ہو؟ آج کل تو دوپہر کے بعد ہی دفتروں میں کام ہو رہا ہے۔''

میں نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہاف ڈے کے روز ہاف ڈے نہیں ہوگا؟''

یقیناً۔ ہاف چھٹی تو صبح سے گزار چکے ہیں۔ اب ہاف آفس..... دیکھ نہیں رہی آج کل کیسی الٹی گنگا بہہ رہی ہے!''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں؟..... میں بھی دفتر جا رہا ہوں۔ تم کیا بھول رہی ہو کہ میں ابو کے دفتر میں ڈرائنگ کرنے کے لئے جاتا ہوں؟ اس کے علاوہ اب تو نبی چچا کے ساتھ بھی کام کرتا ہوں۔''

واقعی بھول رہی تھی۔ رومی پچھلے سال ایف ایس سی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد سے شریف کے دفتر میں ڈرائنگ کا کام سیکھنے کے لئے جاتا ہے۔ رزلٹ نکلنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخل ہوگیا ہے..... پچھلے سال اکتوبر کے مہینے میں۔ اسی وقت کالج میں بتادیا گیا تھا کہ کلاسیں مارچ ۱۷ء سے ہوں گی لہٰذا فارغ بیٹھے رہنے کی بجائے شریف کے دفتر میں کام سیکھ رہا ہے۔ وہ کام بھی ہر وقت کرنا اسے اچھا نہیں لگتا ہے چنانچہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ سے خصوصی اجازت لے کر یونیورسٹی میں اکنامکس کی کلاسوں میں بھی جاتا ہے۔ مارچ میں تو یہ ہنگامے شروع ہوگئے ہیں۔ پڑھائی لکھائی کا پہلے ہی برا حال تھا، اب تو ستیاناس ہوگیا ہے۔

بنگلہ اکیڈمی میں آج ڈھائی بجے فنکاروں کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا ہے۔ میں اگرچہ فنکار بھی نہیں ہوں اور ادیب بھی نہیں تاہم ڈھاکہ میں مستقل رہنے کی وجہ سے زیادہ تر فنکار اور ادیبوں کے ساتھ میری بے تکلفی ہے اس لئے فنی اور ادبی جلسے، سیمینار، تحریک وغیرہ میں مجھے بطور ''آبزرور'' مدعو کیا جاتا ہے۔ مگر آج رکاوٹ پیش آئی۔ سوچا تھا کہ بابا کو جگانے کی ذمہ داری جامی پر ڈال کر تین بجے تک نکل جاؤں گی۔ بابا نے اچانک پونے تین بجے جاگ کر آواز دی، ''ذرا سننا ماں.....''

''کیا ہوا؟''

''پلنگ کیوں ہل رہا ہے؟''

سمجھ گئی۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ بلڈ پریشر بڑھنے سے انہیں لگتا ہے کہ پلنگ، دیواریں، چھت، سب کچھ ہل رہا ہے۔ رومی پر غصہ آیا۔ کل رات کو اس نے بابا کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک انہیں ملک کی سیاسی صورتحال کے بارے میں سمجھایا ہے۔ بابا نابینا ہیں، عمر تقریباً نوے سال ہے۔ بلڈ پریشر کی وجہ سے ہر کام میں انہیں سہارا دینا پڑتا ہے۔ اس پر یہ کہ کسی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان ہوجائیں تو بلڈ پریشر ساتویں آسمان تک جا پہنچتا ہے۔ ان کے سامنے بنگالیوں کی قومی بقا کی جدوجہد کے بارے میں ساری داستان بیان کرنے کی اتنی کیا ضرورت پڑگئی تھی؟ پڑوس کے ڈاکٹر اے کے خان صاحب بھی ڈھاکہ میں موجود نہیں ہیں..... پوسٹنگ پر راجشاہی گئے ہیں۔ آج کل کبھی ڈاکٹر نورالاسلام اور کبھی ڈاکٹر رب، بابا کو دیکھ جاتے ہیں مگر ابھی تو ان کے آرام کا وقت ہے۔ پانچ بجے سے پہلے بلانا درست نہیں ہے لہٰذا فون پر شریف ہی کو جلدی گھر آنے کے لئے کہا۔

پانچ بجے کے بعد ڈاکٹر نورالاسلام کو فون کیا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر رب گھر ہی پر مل گئے۔ ''اس وقت تو میری گاڑی گھر پر نہیں ہے آپ ایسا کیجئے کہ رومی کو بھیج دیجئے مجھے لے جانے کے لئے۔'' ڈاکٹر رب نے فون پر کہا۔

ماضی میں رومی کئی مرتبہ گاڑی پر جا کر انہیں لاتا رہا ہے۔ رومی کو گاڑی لے کر جانے کے لئے کہتے ہی اس نے کہا، ''اس وقت تو اس سڑک پر گاڑی لے کر جانا ممکن نہیں ہے۔ ابھی اس سڑک سے جلوس گزرے گا۔''

ڈاکٹر رب کا گھر میر پور روڈ پر مین روڈ کے اوپر ہی ہے۔ گزشتہ کئی دنوں سے شام کے وقت تمام جلوس اس سڑک پر سے گزر کر بنگلہ بندھو کے مکان کے سامنے جا کر ختم ہوتے ہیں۔

۷ مارچ ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج سہ پہر کو رمنا ریس کورس گراؤنڈ پر عوامی اجتماع ہے۔ گزشتہ کئی دنوں سے شہر میں ہر طرف ہر شخص اس جلسہ عام کے بارے میں انتھک غور وخوض اور بحث ومباحثہ میں مبتلا ہے۔ ہر آدمی دلچسپی، بے چینی، فکر اور خوف کے مارے مرا جا رہا ہے۔ اگرچہ میں اجلاس میں نہیں جاؤں گی، گھر پر بیٹھ کر ریڈیو پر خطاب سنوں گی مگر مجھ پر بھی بے چینی کی اس بیماری نے اثر کیا ہوا ہے۔

سبحان نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آج جلدی کھانا پکانے کے لئے کہا تھا۔ شریف نے کہا ہے کہ بارہ بجے تک کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کریں گے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے نکلیں گے ورنہ قریب کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ بدبخت سبحان نے گیارہ بجے گوشت جلا ڈالا۔

میں نے بارک سے رومی اور جامی کی شرٹ استری کرنے کے لئے کہا تھا۔ سبحان چولہے پر گوشت چڑھا کر بارک کے ساتھ استری کروانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ صاحب بھی آج شیخ صاحب کی تقریر سننے کے لئے جائیں گے چنانچہ ذاتی نگرانی میں اپنی قمیض پتلون استری کروا رہے تھے اور اسی دوران گوشت جل گیا۔ اب کیا علاج کرتی میں اس شخص کا؟ جلدی سے انڈوں کا آملیٹ اور دال پکا کر شریف لوگوں کے لئے کھانا تیار کیا۔

اپنی لاپرواہی پر ڈھیروں ڈانٹ ڈپٹ سن کر بھی سبحان نے ذرہ پروا نہیں کی۔ باورچی خانے میں سب کچھ اسی طرح بکھرا ہوا چھوڑ کر شرٹ پینٹ پہن کر سب کے ساتھ شیخ صاحب کا خطاب سننے کے لئے نکل گیا۔

آج ان کے ساتھ بارک بھی گیا ہے۔ اس سے پہلے کسی میٹنگ میں اسے جانے نہیں دیا تھا۔ آج روکنا زیادتی تھی۔

کٹی کے کمرے میں جا کر اس کا بارہ بینڈ کا قیمتی ریڈیو مانگ کر اپنے کمرے میں لے گئی، اسے بھی اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ بابا دوپہر کا کھانا کھا کر سو چکے تھے۔ ریڈیو لے کر مزے سے اپنے بستر پر لیٹی۔ تھوڑی دیر میں کٹی بھی آ گئی۔ ریڈیو آن رکھ کر دونوں لیٹے لیٹے بات چیت کرتے رہے۔ ریڈیو پر "امار سونار بنگلہ" ترانہ بجنے لگا۔ ہم نے بات چیت بند کر کے پوری توجہ ریڈیو کی طرف کر دی۔ ارے! کیا ہوا؟ آواز بالکل بند۔ مسئلہ کیا ہے؟

آواز گم ہوئی تو بس گم۔ بجلی تو نہیں گئی؟ بتی کا بٹن دبا کر دیکھا کرنٹ ہے۔ ریڈیو خراب ہو گیا؟ ناب

گھما کر دیکھا تو دوسرے سنئر آ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟

احمق سے بن گئے۔ میں نے کہا ''چلو ذرا چھت پر چلیں۔ دونوں چھت پر گئے۔ مشرق کی جانب سیدھا ماپا جائے تو ریس کورس گراونڈ یہاں سے صرف آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔ مختلف نعروں کی غیر واضح آواز سنائی دے رہی ہے۔ آسمان پر ہیلی کاپٹر گردش کر رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر کیوں؟ سلسلہ کیا ہے؟

واقعات سب معلوم ہوئے شریف لوگوں کے لوٹنے پر۔

کالنگ بیل کی آواز سن کر دوڑی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی رومی دونوں ہاتھ اٹھا کر ڈرامائی انداز میں ''اس بار کی جدوجہد نجات کی جدوجہد ہے۔ اس بار کی جدوجہد آزادی کی جدوجہد ہے۔'' کہتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا۔ دیکھا تو فقیر الدین صاحب بھی ساتھ آئے ہوئے تھے۔ فقیر الدین شریف کے سکول کے زمانے کے دوست ہیں۔ ان کا پیشہ کاروبار اور سیاست ہے۔ اگرچہ خود وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ منسلک نہیں ہیں تاہم سیاسی حلقوں کے بارے میں ان سے زیادہ باخبر ہمارے جاننے والوں میں کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔

دھپ کر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے فقیر نے کہا، بھابی چائے پلوایئے۔ ایک ساتھ تین کپ۔ گلا سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔''

''چہرہ بھی تو سوکھ کر کن کھجورا ہو گیا ہے۔ کیا کرتے پھرتے ہیں آج کل؟ کھاتے پیتے بھی ہیں یا نہیں؟''

شریف مسکراتے ہوئے بولے، لیڈروں کی دم پکڑ کر دوڑتے دوڑتے اسے نہ نہانے دھونے کی فرصت ہے نہ کھانے پینے کی۔'' موقع ملتے ہی شریف فقیر کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ میں نے سبحان کو چائے بنانے کا حکم دیا۔ خود صوفے پر بیٹھی۔ ''لیگ پلنگ (Leg Pulling) اس وقت رہنے دیجئے۔ میٹنگ کے بارے میں بتایئے ریڈیو کیوں بند ہو گیا ہے؟ یوں لگا جیسے سر پر ہیلی کاپٹر گردش کر رہا تھا۔''

رومی نے کہا ''ہیلی کاپٹر تو یکم تاریخ کے اجلاس میں بھی تھا۔ وہ لوگ شاید گارڈ آف آنر دینے کی ریاضت کر رہے ہیں۔''

سب لوگ ہنس پڑے۔ ریڈیو ہاتھ میں اٹھا کر قدم قدم چلتے ہوئے کٹی آ کر پاس کھڑی ہوئی۔ دھیمی آواز میں بولی، ''ریڈیو اب بھی خاموش ہے۔''

میں نے کہا، ''کٹی یہاں پر آ کر بیٹھو۔ تم کتنا بنگلہ سمجھ لیتی ہو آج امتحان لوں گی۔ یہاں پر بیٹھ کر بنگلہ میں ہماری بات چیت سنو۔ بعد میں پوری بات بتانا ہو گی۔ ریڈیو کھلا رہنے دو۔''

کٹی مسکراتے ہوئے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ ہم نے ایک گھٹن سے رہائی حاصل کی..... اس وقت چہک چہک کر مادری زبان میں گفتگو کئے بغیر چین نہیں آئے گا۔

ریس کورس کے جلسہ عام میں تیس لاکھ کے لگ بھگ لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ لاٹھیاں اور راڈ کندھوں پر اٹھا کر جلوس کی شکل میں دور دراز سے لوگ آئے تھے۔ ٹنگی، جیدپور، ڈیمرا کے علاقوں سے تو آئے ہی تھے، چوبیس گھنٹے کا پیدل راستہ طے کر کے گھوڑا سال سے بھی بڑی تعداد میں لوگ آئے تھے رومالوں میں ستو اور گڑ باندھ کر۔

نابینا لڑکوں کے جلوس کی شکل میں اجلاس میں آنے کی بات سن کر دم بخود رہ گئی۔ بہت سی عورتیں اور طالبات جلوس کی شکل میں میدان میں پہنچیں، شیخ صاحب کی تقریر سننے کے لئے۔

''مگر شیخ صاحب نے سب کو مایوس کیا ہے۔'' رومی کی اس بات پر سب سے زیادہ احتجاج کیا فقیر نے، ''دماغ خراب ہے تمہارا۔ کل کے چھوکرے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ شیخ صاحب نے جو کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے اور بالکل ٹھیک کیا ہے۔''

وہی پرانی بحث جو پچھلے کئی دنوں سے ہر طرف سن رہی ہوں۔ ایک گروہ چاہتا ہے کہ شیخ صاحب آزادی کا اعلان کریں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکومت سے بغاوت ہوگی۔ اس کا شمار علیحدگی پسند تحریک میں ہوگا۔

رومی نے حسب عادت دھیمے لہجے میں سختی لا کر کہا۔ ''آپ لوگ دیواروں کی لکھائی پڑھنے کے اہل نہیں۔ دیکھا نہیں آج اجلاس میں کتنے لاکھ لوگ آزاد بنگلہ کا جھنڈا ساتھ لے کر آئے تھے؟ عوام اب آزادی چاہتے ہیں۔ یہ ان کی روح کی چاہت ہے ورنہ صرف چھ دن کی کارکردگی کی بنیاد پر ہر طرف اتنے لوگ آزاد بنگلہ کا نقشے سمیت جھنڈا سلوانے جیسا ایک پیچیدہ کام کرانے میں مصروف ہو گئے۔ دوسرے سارے کام چھوڑ کر۔ اور پھر اس جھنڈے کو لہراتے ہوئے دن کی روشنی میں جلوس برپا کرتے ہوئے کیوں آئے؟''

بحث کی بو آ جائے تو نکتہ چیں فقیر ہمیشہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ وہ بولے، ''سمجھ رہا ہوں کہ تم بھی چار خلیفوں کے گروہ کے آدمی ہو۔''

رومی نے کہا، ''میں کسی گروہ کا آدمی نہیں ہوں۔ کسی جماعت کا کتبہ اٹھا کر نہیں پھرتا مگر میں عمومی عقل رکھنے والا، عزت اور ذلت کی حس رکھنے والا باشعور انسان ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ شیخ صاحب نے آج با آسانی ڈھاکے پر قبضہ حاصل کرنے کا موقع کھو دیا ہے۔''

میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''اس طویل بحث میں ملوث ہونے سے پہلے میں تم لوگوں سے ایک چھوٹی سی بات جاننا چاہتی ہوں۔ شیخ صاحب کا خطاب نشر کیا جائے گا۔ دن بھر ریڈیو پر یہ اعلان نشر کرنے کے باوجود نشر کیوں نہیں کیا گیا؟ ریڈیو بالکل ڈیڈ سٹاپ کیوں ہو گیا؟ اس بات کا جواب سننے کے بعد میں کچن میں چلی جاؤں گی۔ پھر تم لوگ ساری رات چہکتے رہنا۔''

شیخ صاحب کی تقریر نشر کرنے کے لئے ریڈیو کے ملازمین تو تیار ہی تھے۔ عین وقت پر مارشل لاء اتھارٹی نے تقریر نشر کرنے سے روک دیا۔ بس فوراً ریڈیو سٹیشن کے تمام کارکن ہاتھ سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ شیخ صاحب کی تقریر نشر کرنے نہ دی جائے تو کوئی بھی پروگرام نشر نہیں کریں گے۔ چنانچہ ریڈیو بالکل خاموش ہو گیا۔''

جامی اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا اچانک بول اٹھا، ''جانتی ہو امی، آج شام کے جہاز سے ٹِکا خان ڈھاکہ پہنچے ہیں۔ گورنر کی حیثیت سے۔''

ایک ہفتے کے اندر دو مرتبہ گورنر تبدیل ہوئے۔ یکم تاریخ کو وائس ایڈمیرل ایس ایم حسین کو بدل کر لیفٹیننٹ جرنیل صاحبزادہ یعقوب خان کو متعین کیا گیا تھا۔ اب چھ دن کے اندر انہیں ہٹا کر لیفٹیننٹ جرنیل ٹکا خان

کولایا گیا ہے۔ کس بات کی علامت ہے یہ؟

آج رات کو ریڈیو نے دوبارہ زبان نہیں کھولی۔

۸ مارچ ۱۹۷۱ء بروز پیر

کل شام کے بعد ریڈیو سٹیشن کے لان پر کسی نامعلوم فرد نے بم پھینکا ہے۔

کل رات تک ریڈیو بند رہنے کے بعد آج صبح سے نشریات دوبارہ شروع ہوگئی ہیں۔ صبح کے آٹھ بجے شیخ صاحب کی تقریر کی ریکارڈنگ نشر کی گئی۔

شریف کے خالہ زاد بھائی نے صبح فون کر کے بتایا کہ پرسوں ان کی منجھلی بیٹی ایمن آگ سے جل گئی۔ اسے ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال کی تیسری منزل پر نیو کیبن میں رکھا گیا ہے۔

شام کے وقت ہسپتال گئی..... ایمن کو دیکھنے کے لئے۔ بے چاری کی قسمت اچھی تھی کہ بہت زیادہ نہیں جلی..... چہرہ بچ گیا۔ اس کیبن میں ٹٹنی آپا، چھبی آپا، ڈولی آپا کی خالہ اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ سب کے سب ایمن کو دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے مگر ایمن کی طرف چند منٹ کے لئے توجہ دینے کے بعد تمام لوگ شیخ صاحب کی گزشتہ روز کی تقریر کے بارے میں اظہار خیال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی خود مختاری یا آزادی کی بحث میں ملوث نہیں ہوا..... وہ لوگوں کی زبانی اور ریڈیو پر تقریر سننے کے بعد شیخ صاحب کی پر اعتماد تقریر نے لوگوں کو کس حد تک مسحور اور متحرک کر دیا ہے، اس پہلو پر ہی زیادہ تر بات چیت کرتے رہے۔

آج یوم عاشورہ ہے۔ محرم کا جلوس اتنی دیر میں امام باڑے سے نکل کر عظیم پور قبرستان کی سڑک پر جا پہنچا ہوگا۔ عظیم پور کالونی کی ایک نمبر بلڈنگ کے سامنے والی سڑک سے گزر کر جلوس قبرستان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی سڑک پر میلہ بھی لگتا ہے۔ ہر سال ہم بچوں کو لے کر میلے میں جاتے ہیں۔ بچے اپنے پسند کے کھلونے خریدتے ہیں۔ ہم چھری، بیلن وغیرہ جیسی گھریلو چیزیں خریدتے ہیں۔

مگر اس سال لڑکوں کا بھی میلے میں جانے کا موڈ نہیں ہے ہمارا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے بنگال کے ہر گھر میں کربلا برپا ہے۔ کتنے ماں فاطمہ کے دل کے ٹکڑے، کتنے بی بی سکینا ؤں کے جوان خاوند سڑکوں پر گولی کھا کر بے جان ہو رہے ہیں..... بنگال کے ہر گھر میں روزانہ عاشورے کی آہ وزاری، مرثیہ اور ماتم جاری ہے مگر شاعر نے تو کہا کہ ''قربانی چاہتا ہے عاشورہ آہ و زاری نہیں۔'' شائد اسی لئے بنگال کے جاں باز جیالے قربانی کا جذبہ لے کر گھر کا سکھ حرام کر کے سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے ہیں۔

گزشتہ شام بیت المکرم سے اتنا بڑا مشعل بردار جلوس نکلا تھا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم نے اگرچہ نہیں دیکھا تھا..... شریف، فقیر اور رومی لوگوں نے بحث میں مگن ہو کر گیارہ بجا دیئے تھے۔ میری سہیلی رقیہ نے فون پر اس جلوس کے بارے میں بتایا۔ ان کا مکان دھان منڈی آٹھ نمبر مین روڈ پر ہے۔ ان کے گھر کے سامنے یعنی میر پور روڈ پر سے گزر کر سارے جلوس بنگلہ بندھو کے مکان تک جاتے ہیں۔ رقیہ نے کہا، سچی بات تو یہ ہے کہ ان مشعل برداروں کو دیکھ میرا بھی دل کرنے لگا کہ سڑک پر اتر جاؤں۔"

۱۰ مارچ ۱۹۷۱ء بروز بدھ

خودمختاری اور آزادی کے درمیان میز کرسی کے محاذ پر جہاد باللسان زوروں پر جاری ہے۔ سات دن تک باہر گھومنے کے بعد، کچھ دنوں سے رومی گھر پر ہی دوستوں کو اکٹھا کر کے کھانے کی میز کو گھنٹوں تک چہچہاتا گلزار بنا کر رکھنے لگا ہے۔ اس سے میری اور سبحان کی محنت تو بڑھی ہے..... بار بار چائے، ناشتہ وغیرہ سپلائی کرنا معمولی بات نہیں ہے لیکن میری روح کو تسکین رہتی ہے۔ غل غپاڑا، گھر کے کمروں کو الٹ پلٹ..... جو کچھ مرضی آئے کرتا رہے کم از کم میری آنکھوں کے سامنے تو رہتا ہے۔ رومی باہر نکل جائے تو میری جان ہتھیلی پر رہتی ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک گولی کا فاصلہ ہے۔ کس وقت کہاں سے تیکھی سیٹی بجاتی ہوئی آ ٹکرائے کون بتا سکتا ہے؟

تمام تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لئے بند ہیں۔ جامی کو کرنے کے لئے کچھ نہیں ملتا ہے۔ رومی سے ساڑھے تین سال چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے جلسے جلوس میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ رومی اور اس کے ساتھیوں کی گفتگو میں شرکت کرنے کے لئے بھی اس کی عمر اور علم دونوں کم ہیں۔ یوں بھی رومی کے اکثر دوست اس سے عمر میں دو تین چار سال بڑے ہیں۔ پڑھائی میں بھی دو تین کلاس اوپر کے طالب علم ہیں۔ رومی اور اس کے ساتھیوں کی گفتگو کے موضوعات کارل مارکس، لینن، ماؤزے تنگ وغیرہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں جامی شرکت نہیں کر پاتا۔ صرف جب چے گویرا کا تذکرہ ہو تو لپک کر قریب آ کے بیٹھتا ہے۔

جامی کے دوستوں میں سے صرف ٹٹو کو ہی اکثر آتے ہوئے دیکھتی ہوں باقی دوستوں کی کوئی خبر نہیں ہے شائد ان کی مائیں نکلنے نہیں دیتی ہوں گی۔ ٹٹو کو ایک بات کی آسانی ہے، اس کے والدین ہمارے ''فیملی فرینڈز'' ہیں لہٰذا ٹٹو اگر ہمارے گھر پر آنے کے لئے ضد کرے تو اس کے امی ابو اسے گاڑی پر چھوڑ جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ٹٹو اور جامی کی کیفیت اس طرح کی ہے: ''جلسے جلوسوں میں اگر جاتے نہیں تو کم از کم دونوں دوستوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا موقع دو۔''

نوجوان لڑکے بھی آزادی اور خودمختاری کے مسئلے پر متفق نہیں ہو پا رہے ہیں اور ادھر اسی سالہ بوڑھے بھاشانی گزشتہ روز پلٹن کی میٹنگ میں آزادی کا مطالبہ کر بیٹھے ہیں۔ کل سہ پہر کے وقت آزاد بنگلہ متحدہ تحریک کمیٹی کے اہتمام پر منعقد ہونے والے اجلاس میں مولانا بھاشانی چیئرمین کی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ حکومت اگر متفقہ طور پر ۲۵ مارچ تک مشرقی بنگال کو آزادی نہ دے تو ۵۲ء کی طرح وہ مجیب کے ساتھ متحد ہو

کرآزادی کی تحریک شروع کردیں گے۔ بھاشانی کی تقریر کا ایک جملہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا ہے۔ انہوں نے کہا، ''پاکستان کا وزیراعظم بننے کے مقابلے میں بنگال کا ''ہیرو'' ہونا کہیں زیادہ باعث فخر ہے۔''

انگریزی ادب کے معروف شاعر ملٹن کی نظم ''پیراڈائز لاسٹ'' کی وہ مشہور سطریں یاد آگئیں:

"It is better to reign in hell than to serve in heaven."

''جنت میں غلامی کرنے سے دوزخ کی حکمرانی کرنا بہتر ہے۔''

بینک سے رقم نکلوانے کا نیا وقت مقرر ہوا ہے.....نو بجے سے بارہ بجے تک۔ اب شیخ مجیب کی ہدایات پر تاج الدین اخبارات کے ذریعے مختلف مسئلوں پر احکامات جاری کرنے لگے ہیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

کٹی کو لے کر مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ اس کے لئے اس بوڑھی عمر میں نئے سرے سے معلومات عامہ کی کتابیں پڑھ کر اطلاعات اکٹھی کرنی پڑ رہی ہیں۔ اتنے جلسے، جلوس، مظاہرے دیکھ کر بھی اسے اطمینان نہیں ہو رہا ہے کہ مشرقی بنگال کے عوام کے مطالبے برحق ہیں۔ کٹی کہتی ہے کہ تم لوگ زبانی تو کہتے ہو کہ تمہارا استحصال ہو رہا ہے، مغربی پاکستان والے تمہارے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں، تمہارے پیسوں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں، مگر ان شکایات کے حق میں فیکٹس اور فگرز کہاں ہیں؟ کس کس کھاتے میں تمہارا استحصال ہو رہا ہے؟ اعداد و شمار دکھا کر ثابت کرو.....

سنو ذرا! میں نے کوئی اعداد و شمار یاد کر رکھے ہیں؟ مگر کٹی سے تو یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ مجھے اتنا یاد نہیں ہے تم کتابیں اخبارات اور جریدے پڑھ کر خود معلوم کر لو۔ چنانچہ گزشتہ چوبیس سالوں کا اقتصادی تنازعہ، استحصال اور ناانصافیوں کے اعداد و شمار اکٹھے کر رہی ہوں۔ پائی پائی کا حساب لگا کر کٹی کو دکھا دوں گی..... چاول، آٹا، نمک، سونا..... مختصراً ہر شعبے میں مشرقی پاکستان کے وسائل اور آمدنی کی اصل کھپت مغربی حصے میں ہو رہی ہے اور مشرقی حصے کو دانستہ کھوکھلا کیا جا رہا ہے۔ شیخ صاحب کا انتخابی پوسٹر ''سونار بنگلہ ویران کیوں؟'' ڈھونڈ رہی ہوں۔ کٹی کو وہ پوسٹر دکھا سکتی تو میرا مقصد بارہ آنے حاصل ہو جاتا۔ اس پوسٹر میں ایک ایک پیسے کا حساب لگا کر جلی حروف میں ناانصافی اور استحصال کے سارے اعداد و شمار درج ہیں۔

کاش کسی کے پاس سے ایک کاپی مل جاتی.....

۱۴ مارچ ۱۹۷۱ء بروز اتوار

بنگالی عوام کی تحریک خودمختاری کے ساتھ یک جہتی کا اعلان کرتے ہوئے ڈھاکہ کے شاعر اور ادیبوں نے ایک تحریکی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ کمیٹی کے کنوینر ہیں حسن حفیظ الرحمان۔ ارکان ہیں: سکندر ابوظفر، احمد شریف، شوکت عثمان، شمس الرحمٰن، بدرالدین عمر، رانش داس گپتا، سعید عتیق اللہ، برہان الدین خان جہانگیر، رکن الزمان خان، عبدالغفار چودھری، صوفیہ کمال، ظہیر ریحان، عبدالغنی ہزاری اور بہت سے دوسرے افراد۔

کمیٹی کئی روز پہلے ہی تشکیل دی جا چکی تھی۔ آج شام پانچ بجے بنگلہ اکیڈمی کے احاطے میں ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ سر احمد شریف نے اجلاس کی صدارت کی۔

''بنگلہ دیش کی خودمختاری کی تحریک میں ادیبوں کا انقلابی کردار'' کے موضوع پر آنکھیں کھول دینے والا مقالہ پڑھا: علاؤالدین آزاد، برہان الدین خان جہانگیر، حسن حفیظ الرحمٰن، رابعہ خاتون، رانش داس گپتا اور چند دوسرے ادیبوں نے زبانی گفتگو کی۔

میں ادیب بھی نہیں ہوں اور مقرر بھی نہیں۔ پچھلی قطار میں بیٹھ کر گفتگو سنتی رہی۔ اجلاس کے اختتام پر تمام لوگ جلوس کی شکل میں شہید مینار کی طرف روانہ ہوئے۔ بنگلہ اکیڈمی سے شہید مینار زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میرے گھٹنوں کے درد میں بھی کچھ دنوں سے آرام ہے۔ ہمت کر کے میں بھی جلوس میں شامل ہو گئی۔

فنکار لوگ بھی دوسروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ مارچ کے شروع ہی سے ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم..... تمام شعبوں کے فنکار عدم تعاون کی تحریک میں یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلسے جلوس اور عوامی نغموں کے پروگراموں کا اہتمام کرتے آ رہے ہیں۔ حال میں مختلف تنظیموں سے فنکاروں کا چناؤ کر کے فنکاروں کی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

علی منصور کمیٹی کے صدر ہیں۔ سکریٹری ہیں سید عبدالہادی، خزانچی ہیں لیلیٰ ارجمند بانو۔ ارکان ہیں: مصطفیٰ زمان عباسی، زہدالرحمٰن، فردوسی رحمٰن، بشیر احمد، خان عطاء الرحمٰن، بارین مجمدار، الطاف محمود، غلام مصطفیٰ، قمرالحسن، آجت رائے، حسن امام، کمال لوہانی، جی اے منان، عبدالاحد، سمرداس، گوہر جمیل اور رزاق کے علاوہ بہت سے دوسرے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سنٹر پر فوج کے کنٹرول کے خلاف ''مشتعل فنکاروں کی تحریکی کمیٹی'' متحرک ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء بروز پیر

تمغے مسترد کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ بصری فن کے استاد زین العابدین نے ہلال امتیاز کا خطاب رد کر دیا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ بنگلہ کے سربراہ منیر چودھری نے ستارۂ امتیاز رد کر دیا ہے۔

ناٹور سے منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے نمائندے ڈاکٹر شیخ مبار حسین نے تمغہ پاکستان اور فرید پور کے صوبائی اسمبلی کے نمائندے شیخ مشرف حسین نے تمغہ قائداعظم رد کر دیا ہے۔

روزنامہ پاکستان کے ایڈیٹر ابوالکلام شمس الدین نے ستارۂ خدمت اور ستارۂ امتیاز کے اعزازات مسترد کر دیے ہیں۔ اور بھی کئی معزز شخصیات نے مختلف خطابات و اعزازات مسترد کیے ہیں۔

سارا ملک تحریک آزادی میں مشتعل ہو چکا ہے۔ ہر طرف احتجاج کا طوفان برپا ہے۔ صورتحال کی شدت پر غیر ملکی ملازمین خوف زدہ ہونے لگے ہیں۔ مغربی جرمنی اور برطانیہ کی حکومتوں نے اپنے کچھ شہریوں کو مشرقی بنگال سے ہٹانا شروع کر دیا ہے۔

رومی جرمن کلچر سنٹر میں جرمن زبان سیکھا کرتا تھا۔ اسی توسط سے جرمن زبان کی ایک ٹیچر کے گھر اس کا آنا جانا تھا۔ اس میڈم سے پتہ لگا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک روز رومی کو اپنے گھر چائے پر بلایا تھا۔ واپس آ کر رومی نے بتایا کہ فی الحال وہ بنکاک جا رہی ہیں، اس کے بعد ان کا سفر کس طرف کو ہوگا، ابھی انہیں خود بھی معلوم نہیں ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے گلشن کے مکان کے کرائے دار بھی چلے جائیں گے۔ ۶۵ء کی جنگ کے دوران بھی سب لوگ بنکاک ہی چلے گئے تھے۔

ہمارے کرائے دار ایک امریکی صاحب ہیں۔ میں نے ان کی بیگم کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ امریکی حکومت نے ابھی تک اپنے شہریوں کو منتقل کرنے کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔ ''ہم لوگ فی الحال کہیں پر بھی نہیں جا رہے ہیں۔ ڈھاکہ میں ہی رہیں گے۔ اقوام متحدہ کے کارکنوں کو بھی ڈھاکہ سے کہیں منتقل کرنے کا فی الحال کوئی منصوبہ نہیں بنا ہے۔ چنانچہ ابھی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا فکر کرنے کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟ ہم تو اپنی سرزمین پر ہی بیٹھے ہیں۔ پیر پھسلنے کا ہمیں کوئی خوف نہیں ہے۔ خوفزدہ اگر کوئی ہو تو تم لوگ ہی ہو گے۔ ۶۵ء کی جنگ کے دوران جس طرح

سے سب بنکاک کی طرف بھاگ گئے تھے وہ بات ابھی بھولی تو نہیں ہے۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملکی صورتحال میں شدید بحران پیدا ہو رہا ہے۔ فضا میں خدشات کے سیاہ بادل دن بدن گھنے ہو رہے ہیں۔

طوفان سے متاثرہ علاقوں میں امداد فراہم کرنے کے لئے گندم کا ایک امریکی جہاز چٹاگانگ پہنچا تھا۔ اسے پورٹ پر لنگر ڈالنے نہیں دیا گیا ہے۔ اسلام آباد سے جاری کردہ ہنگامی ہدایت کے تحت اس کا رخ کراچی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس واقعہ پر بہت شور مچا ہے۔ کیپٹن منصور علی نے اخبارات میں بیان جاری کیا ہے کہ اصل حقائق پر سے پردہ ہٹانے کے لئے تحقیقات کرائی جائیں۔ حکومت نے جوابی بیان کے ذریعے دعویٰ کیا ہے کہ کسی گندم بردار جہاز کا چٹاگانگ پورٹ پر لنگر ڈالنے کا سرے سے کوئی منصوبہ ہی نہیں تھا۔

عظیم بھائی کو کسی طرح بھی فلائٹ کا ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے چار ہفتوں سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ دو ٹیلی گرام بھیج چکے ہیں۔ اس کے بعد ٹرنک کال بھی کی ہے۔ ٹیلی فون پر باس کا لہجہ سن کر بے چارے گھبرا گئے ہیں..... لگتا ہے کہ نوکری نہیں رہے گی حالانکہ سنا ہے کہ پی آئی اے کی فلائٹ پر روزانہ سیکڑوں غیر بنگالی مغربی پاکستان جا رہے ہیں۔ اس بارے میں اخباروں میں بھی خبر چھپی ہے۔ بنگالیوں کو ٹکٹ نہیں مل رہا ہے حالانکہ روزانہ کثیر تعداد میں غیر بنگالی مشرقی بنگال سے باہر جا رہے ہیں۔ خاص طور پر تاجر حضرات.... ان لوگوں نے فروری سے ہی اپنے بیوی بچوں کو یہاں سے باہر بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اب خود بھی چلتے بن رہے ہیں۔ دوسری طرف سینکڑوں سلہٹی بنگالی لندن سے چھٹیاں گزارنے کے لئے ملک میں آ کر پھنسے ہوئے ہیں۔ بکنگ نہیں مل رہی ہے۔ حتیٰ کہ پی آئی اے انہیں دوسری ایئر لائنوں میں ٹکٹ لینے کی سہولت بھی نہیں دے رہی ہے۔

آج شام کی فلائٹ سے سخت حفاظتی انتظامات میں صدر یحییٰ ڈھاکہ پہنچے ہیں۔

۱۶ مارچ ۱۹۷۱ء بروز منگل

رومی کے لئے سخت پریشان ہوں۔ کئی روز تک دوستوں کے ساتھ گھر پر بیٹھ کر لاتعداد مغلئی پراٹھے ہضم کرنے، بحث مباحثوں کے ذریعے گھر کے فرش سے لے کر چھت تک ہر حصے کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کے بعد اب پھر دوبارہ باہر بھاگ دوڑ کرنے لگا ہے۔ کہاں پر جاتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ جنوں میں کچھ کھاتا بھی ہے یا نہیں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ آج ان کے ڈریسنگ روم کی صفائی کرتے وقت دو موٹے موٹے بھدی شکل کے ہاؤن دستے دریافت ہوئے۔ بچپن میں دادی کو ہاؤن دستے میں پان کوٹ کر کھاتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ وہ ہاؤن دستہ چھوٹا اور خاصا نفیس تھا۔ مگر یہ دونوں تو کافی بڑے اور بھدی شکل کے ہیں۔ دو دو ہاؤن دستے وارڈ روب کے اندر چھپا کر کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ کیا ہوگا ان سے؟ رومی گھر پر نہیں تھا۔ جامی نے منہ بسور کر اعتراف کیا کہ بم اور پٹاخے بنانے کے لئے ہاؤن دستہ لازمی اوزار ہے۔ بم.... پٹاخے....؟ کیا کوٹو گے ہاؤن دستے پر؟ مصالحے کہاں پر ہیں؟ جامی کا چہرہ فق ہو گیا۔ دونوں ہونٹ بھینچ کر انگلی سے اشارہ کیا.... کپڑوں کے پیچھے الماری کی تہہ میں پلاسٹک کے چند پھولے ہوئے بیگ۔ سب کا منہ سُتلیوں سے بندھا ہوا ہے۔

میرا جسم کانپنے لگا۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ کیا کروں؟ کیا کہوں؟ سارا ملک آزادی کے مطالبے میں مشتعل ہو چکا ہے۔ ڈھاکہ، راجشاہی، چٹاگانگ..... ہر جگہ پر اس تقاضے کو سر آنکھوں پر رکھتے ہوئے امن پسند بنگالی موت سے بازی لڑتے ہوئے ڈنڈے سریے غرضیکہ جو کچھ بھی فوری طور پر دستیاب ہوا، ہاتھوں میں اٹھا کر گولیوں کے روبرو کھڑے ہو رہے ہیں۔ گھر گھر اپنے ہاتھوں سے بم، پٹاخے بنا کر مخالفین پر پھینک رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اپنے بیٹے کو آنچل کے نیچے باندھ کر رکھنے کی کوشش کیسے کروں؟ کیا میں چاہوں گی کہ وہ صرف دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر آزادی کے مسئلے پر بحث و تکرار کرتا رہے؟ بال کی کھال نکال کر خوش رہے۔

مجھے پتہ نہیں چلا کہ رومی کس وقت گھر لوٹا ہے۔ جامی نے یقیناً اسے ساری بات بتائی ہوگی۔ آہستہ سے میرے کمرے میں داخل ہو کر، بتی جلا کر انتہائی اطمینان کے ساتھ بولا، ''امی مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا، ''مجھے بھی تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

رومی قریب آ کر پلنگ پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، ''بچپن سے تمہیں یہی تعلیم دی ہے کہ کوئی ایسا کام مت کرنا جو ہم سے چھپا کر کرنا پڑے۔ اگر کسی بات پر ہم سے تمہیں اختلاف بھی ہو تو پہلے گفتگو کے

ذریعے ہمیں اپنی رائے پر قائل کر کے پھر وہ کام کرنا۔"

رومی نے حسب عادت اپنے دھیمے لہجے میں کہا، "میں نے چھپا کر کچھ نہیں کیا ہے امی۔ ابو سب کچھ جانتے ہیں۔ ابو نے خود ہی بنی انکل کے ساتھ بات چیت کرادی تھی۔ تمہیں تو پہلے ہی کہا ہے کہ میں بنی انکل کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ تاہم کیا کام کرتا ہوں تفصیل سے بتانا ممنوع ہے۔"

میں نے رومی کو سینے سے لگا کر کہا، "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے رومی۔"

ایک لمحہ خاموش رہ کر رومی نے سنجیدگی سے کہا، "اب ہم ڈرنے کے مرحلے میں نہیں رہے ہیں امی۔ پیچھے ہٹنے کے لئے اب کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے۔"

"تو جو کچھ بھی کہے رومی.... دیکھنا کہ سب کچھ پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ آج یحییٰ اور مجیب کے درمیان بات چیت کا آغاز ہوا ہے۔ کسی نہ کسی فیصلے تک وہ ضرور پہنچ جائیں گے۔"

ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلا کر رومی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جامی نے سیڑھیوں کے نیچے سے چیخ کر کہا، "امی، بھیا، بھاگ کر آؤ۔ خبریں شروع ہوگئی ہیں۔"

ہم دونوں دوڑ کر نیچے اتر گئے۔ ٹی وی کے پردے پر شیخ مجیب کی گاڑی ایوان صدر سے نکل رہی ہے۔ سفید گاڑی پر سیاہ جھنڈا لہرا رہا ہے۔ احتجاج کا سیاہ جھنڈا لہرا کر شیخ مجیب پاکستان کے صدر کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے پاکستان کی حکومت نے کبھی بھی بنگالیوں کے سیاہ جھنڈے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس مرتبہ تسلیم کرنا پڑا ہے۔

۱۷ مارچ ۱۹۷۱ء بروز بدھ

صبح کی چائے پیتے ہوئے سارے اخباروں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ صورتحال اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو تین تاریخ سے ہی گھر پر تین چار اخبار رکھنے شروع کر دیئے ہیں تا کہ سب لوگ ایک ساتھ مطمئن رہ سکیں۔

سب کی نظر مجیب، یحییٰ ملاقات کی خبر پر ہے۔ کوئی خاص خبر نہیں چھپی ہے۔ ملاقات کے کمرے سے باہر نکل کر صحافیوں کے سوال کے جواب میں شیخ صاحب نے صرف اتنا کہا ہے کہ انہوں نے ملک کے سیاسی مسائل پر گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ گفتگو جاری رہے گی کیونکہ جو مسائل درپیش ہیں، چند منٹوں کے اندر ان کا حل تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔

آج بروز بدھ صبح کے دس بجے وہ دوبارہ گفتگو کے لئے بیٹھیں گے۔

رومی نے اچانک سر اٹھا کر کہا، ''امی یہ خبر دیکھی ہے؟''

''کون سی خبر؟''

رومی نے اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا روزنامہ ''آزادی'' میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس خبر کو پڑھا۔ سرخی ہے:

''کیا آپ جانتے ہیں؟''

''دارالحکومت ڈھاکہ میں اس وقت فوج کے کتنے اعلیٰ افسر موجود ہیں؟''

مختصراً خبر یہ ہے: صدر یحییٰ کے ساتھ مسلح افواج کے سربراہ جرنیل عبدالحمید، پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جرنیل پیرزادہ، میجر جرنیل عمر کے علاوہ دیگر چھ بریگیڈیئر ڈھاکہ میں آئے ہیں۔ تاہم اس بارے میں سرکاری تصدیق حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ صدر کے پی آر او نے صحافیوں کے سوال کے جواب میں صرف پیرزادہ اور عمر کے ڈھاکہ آنے کی خبر کی تصدیق کی ہے۔

''کیا خیال ہے امی؟''

''مجھے تو بات زیادہ مناسب نہیں لگی ہے۔ دوستانہ گفتگو کے لئے آتے ہوئے اپنے ساتھ اتنے سارے سپہ سالاروں کو لانے کا مقصد کیا ہے؟''

میرا دل ایک دم دھڑک اٹھا۔ ڈانٹنے کے لہجے میں میں نے کہا، ''تم لوگ تو افواہوں کے پیچھے بھاگتے

ہو۔اس خبر کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔لوگ امکانات کی بنیاد پر من گھڑت باتیں کر رہے ہیں گفتگو تو ابھی صرف ایک روز چلی ہے۔دو چار دن تک صبر کرو، دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اسی آس میں رہنا امی۔تم میں کیا ذرا بھی سیاسی بصیرت نہیں ہے؟" رومی کی بات ادھوری رہ گئی۔ دروازے پر گھنٹی بجی۔جامی نے لپک کر دروازہ کھولا اور چیخ کر بتایا "امی.....نیوگی انکل آئے ہیں۔" میں نے بھی چیخ کر جواب دیا، "ارے واہ! بہت اچھے دن آئے ہیں۔مجھے آپ کی شدید ضرورت ہے۔"

اوجت نیوگی کمرے میں داخل ہو کر ہنستے ہوئے بولے، "ایسا محسوس کر کے ہی تو دیکھئے کہ آ گیا ہوں۔"

شریف اور میں اٹھ کر بیٹھک میں چلے گئے۔رومی اور جامی نیوگی صاحب کو آداب کر کے دوسری منزل پر چلے گئے۔

میں نے کہا، "دادا آج میں نے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔بیٹھنا ہوگا بہت دیر تک اور ٹھیک ٹھیک جواب بھی دینا ہوگا۔"

نیوگی دادا ہنستے ہوئے بولے، "خدا خیر کرے۔ایسی کیا خوفناک بات پوچھنے والی ہیں کہ ٹھیک ٹھیک جواب دینا پڑے گا؟"

شریف کچھ دیر تک بات چیت کرنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔"مجھے دفتر پہنچنا ہے.... چلتا ہوں....آپ لوگ خوفناک قسم کی بات چیت کرتے رہیے۔"

شریف کے جانے کے بعد میں نے کہا، "میں بہت واضح جملوں میں صرف دو سوال کروں گی۔ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے گا۔"

دادا پھر سے ہنس کر بولے، "پوچھیے۔میں اپنی قابلیت کے مطابق جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے تھوڑی دیر تک سر نیچا کر کے اپنے ذہن میں جملہ بنا لیا، اس کے بعد واضح لہجے میں رک رک کر کہا، "پہلا سوال....ملک میں خون خرابہ ہونے کے امکانات ہیں یا نہیں؟ دوسرا سوال....میری تقدیر میں بیٹے کا غم ہے یا نہیں؟"

سوالات سن کر نیوگی دادا دم بخود ہو کر بیٹھے رہے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا، "کیا ہوا؟" جواب کیوں نہیں دیتے ہیں؟

نیوگی دادا تھوڑا سا ہنسے۔یوں لگا کہ خاصی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔کھانس کر اپنا گلا صاف کیا، پھر کہنے لگے، "ایسے مسئلوں پر یقین کے ساتھ کوئی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔"

میں نے اصرار کیا، "کیوں ممکن نہیں ہے؟ آپ اتنے بڑے نجومی ہیں، اتنے سالوں سے مختلف موضوعات پر پیش گوئی کر رہے ہیں۔کیا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ ملکی حالات پر آپ نے غور و فکر نہیں کیا ہے؟"

"غور یقیناً کر رہا ہوں مگر....."

"مگر وگر کو چھوڑیئے۔آپ نے کیا سوچ بچار کی ہے مجھے بتایئے۔"

''خون خرابے کے امکانات کافی تھے مگر لگتا ہے کہ بلا ٹل جائے گی۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔''اور میرے دوسرے سوال کا جواب؟''

نیوگی دادا دوبارہ مشکل میں پھنس گئے۔تھوڑی دیر خاموشی سے کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے۔کئی لمحے اسی طرح گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ بولے،''آپ تو جانتی ہیں کہ مریخ تصادم کا ستارہ ہے...اسے ذرا دیکھ بھال کر رکھئے گا۔''

میں اپنی بات پر ڈٹی رہی۔''دیکھ بھال کر رکھنے کی باتیں رہنے دیجئے۔مجھے یہ بتایئے کہ میرے نصیب میں بیٹے کا سوگ ہے یا نہیں؟اگر ہو تو لوہے کا کمرہ تعمیر کروانے سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔''

اوجت نیوگی تھوڑی دیر تک نجانے کیا سوچتے رہے۔اس کے بعد دھیمی آواز میں بولے،''نہیں... آپ کے نصیب میں بیٹے کو کھونے کا دکھ نہیں ہے۔پھر بھی ذرا احتیاط کیجئے گا۔''

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے سینے پر سے چٹان سی ہٹ گئی ہو۔میں نے علم نجوم،پیش گوئی جیسی کسی چیز پر کبھی یقین نہیں کیا ہے۔اوجت نیوگی کے ساتھ ہماری وابستگی علم نجوم یا پیش گوئیوں کے حوالے سے نہیں ہے،ہمارا تعلق ادبی بات چیت اور سماجی واقفیت کا ہے۔ان کے افسانوں کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔تازہ ترملکی صورتحال کے پس منظر میں رومی کے مشکوک اور دیوانوں جیسے چال چلن نے دل سے خود اعتمادی کا ستون جانے کب اور کیسے کمزور کر دیا ہے کہ اوجت نیوگی کی پیش گوئی پر یقین اور بھروسہ کرنا چاہ رہی ہوں۔

۱۸ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

ڈھاکہ ٹیلی ویژن نے خودمختاری کی تحریک کو نئے نغموں کی پیشکش کے ذریعے روح بخشی ہے۔ ایسی عمدہ پیشکش پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ ڈھاکہ کے اول درجے کے جتنے معروف فنکار ہیں.... فردوسی رحمٰن، سبینہ یاسمین، شہناز بیگم، انجمن آراء بیگم، سید عبدالہادی، خوندکر فاروق احمد، رابندر ناتھ رائے اور بہت سے دوسرے... مل کر جب گاتے ہیں.... ''سنگرام، سنگرام، سنگرام.... چلتا رہے گا مسلسل، اور ان فنکاروں کے چہرے کئی ہزار عوام کا چہرہ بن جاتے ہیں تب یوں لگتا ہے کہ کمرے میں، سینے کے اندر طوفان برپا ہو گیا ہے اور اس طوفان کی مستی پورے ملک میں پھیل رہی ہے۔

معصومہ سے سوال کیا کہ کس طرح سے ایسا شاندار کارنامہ سرانجام دیا گیا ہے اور کس نے یہ شاہکار تخلیق کیا ہے؟

معصومہ نے کہا، ''یہ سارا منٹو ماما کا کرشمہ ہے۔''

منٹو، یعنی مصطفیٰ منور کو ایک روز پکڑا، ''منٹو بتاؤ نا..... کس طرح سے ایک ایک چہرہ ہزار چہرے بن جاتے ہیں؟''

مصطفیٰ منور نے حسب عادت شرما کر انکساری کے ساتھ ہنس کر سر کھجایا۔ ''کوئی خاص کاریگری نہیں ہے۔ مشینیں تو ہمارے پاس خاص نہیں ہیں.... شیشے وغیرہ سے بہت جتن کر کے گزارا کیا ہے، بس۔''

منٹو ایسا ہی ہے.... اپنے کسی کارنامے کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ کہنا پڑ جائے تو اسی طرح سے شرما جاتا ہے۔

منٹو کے کارناموں میں شامل جدید طرز پر فلمائے گئے کئی دوسرے نغمے بھی آج کل ٹی وی سے نشر کیے جاتے ہیں۔ یہ نغمے جب ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں تو ڈھاکہ کے گھروں میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے پرسکون ناظرین کے دلوں میں جوش کی موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہیں۔ باہر سڑکوں پر، میدانوں میں، بندرگاہوں پر، جنکشنوں میں جو جیالے خونریز تصادم میں ملوث ہیں دوڑ کر ان کی صف میں جا کر کھڑا ہونے کو دل کرتا ہے۔

۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج رومی ایک نیا سٹیکر لے کر آیا ہے۔ ''بنگلہ کا ایک ایک حرف ایک ایک بنگالی کی روح ہے۔'' بنگلہ میں لکھا ہوا یہ جاذب نظر سٹیکر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ رومی نے بہت احتیاط کے ساتھ یہ سٹیکر گاڑی کے پچھلے شیشے پر چپکایا۔ اس سٹیکر کا ڈیزائن معروف فنکار قمر الحسن نے تیار کیا ہے۔ ویسے وہ اپنے آپ کو مصور کی بجائے روائتی ''پٹ ساز'' کہتے ہیں۔ چند روز پہلے انہوں نے ''بنگال کے پٹ سازوں کی سوسائٹی'' کے نام سے ایک تنظیم تشکیل دی ہے۔ اس تنظیم کا ایک اجلاس بھی ہو چکا ہے۔ اجلاس کی صدارت سید شفیق الاسلام نے کی ہے جو شریف کے دوست انجینئر ایس آر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔

''بنگال کے پٹ سازوں کی سوسائٹی'' کے اجلاس میں کنول کے پھول کو انقلابی بنگال کی ''علامت'' کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ مشرقی بنگال کی خود مختاری کی تحریک کو عوام میں وسیع تر مقبولیت دینے کے لئے مصوروں نے کارٹون، پوسٹر، سٹیکر وغیرہ شائع کر کے ملک گیر سطح پر تقسیم کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔

رومی کا لایا ہوا سٹیکر شائد اسی لائحہ عمل کا پہلا اقدام ہو۔

۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء بروز پیر

چھٹی کا دن ہونے کے باوجود گزشتہ کل گھر کے کسی فرد کو ایک لمحے کے لئے آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سارا دن اتنے مہمان آتے رہے کہ چائے ناشتہ فراہم کرتے کرتے سبحان، بارک اور قاسم تھک گئے۔ تھکی ہوئی میں بھی بہت تھی لیکن ملک گیر سطح پر تیزی سے درپیش آنے والے واقعات معلوم کرنے کے جنون میں دوسروں کے ساتھ میں بھی اس قدر مصروف رہی کہ وقت کیسے گزر گیا پتہ بھی نہیں چلا۔

صبح کے نو بجے میری بڑی نند لیلیٰ باجی اور ان کے شوہر اکرام بھائی آئے۔ وہ ہر اتوار کو بابا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے باقاعدگی سے آتے ہیں۔

رومی اور جامی آج صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی ناشتہ کر کے کہیں نکل گئے ہیں۔ شریف اور میں اس وقت تک کھانے کی میز پر بیٹھ کر اخبارات دیکھ رہے تھے۔ اکرام بھائی نے لیلیٰ باجی سے کہا تم اوپر بزرگوار کے پاس جاؤ میں ان کے ساتھ کچھ باتیں کرلوں۔ لیلیٰ باجی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئیں۔ اکرام بھائی قریب آ کر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کی وجہ ہے۔ رومی کی حرکتیں دیکھ کر تقریباً ایک ہفتہ پہلے میں نے اکرام بھائی سے کہا تھا کہ آپ رومی کو اپنے پاس بلا کر اس سے ذرا بات کریں.... وہ کیا سوچتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اکرام بھائی نے اپنے گھر پر بلوا کر دو دن رومی سے بات کی ہے۔

مجھے زبان سے کوئی سوال نہیں کرنا پڑا کیونکہ میں سمجھ گئی ہوں کہ اکرام بھائی اسی بارے میں بات کرنے کے لئے میرے پاس آ کر بیٹھے ہیں۔

انہوں نے کہا، ''رومی کے ساتھ بات چیت کر کے میں تو لاجواب ہو گیا ہوں۔ اس کی عمر کتنی ہو گی؟ ابھی سے اتنا مطالعہ کر چکا ہے! پہلے میں سمجھتا تھا کہ امیر زادہ ہے، گاڑی پر گھومتا پھرتا ہے، تنگ پتلونیں پہن کر روانی سے انگلش بولتا ہے اور بس.... مگر اب تو دیکھ رہا ہوں کہ زبردست بچہ ہے.... مارکس اور اینگلس کو تو گھول کر پی چکا ہے۔ اس عمر کا اتنا ذہین اور روشن خیال نوجوان میں نے پہلے نہیں دیکھا ہے۔''

اکرام بھائی کی ایسی ہی عادت ہے.... ڈانٹتے وقت ایسی جھاڑ پلا دیں گے کہ بس خیر نہیں اور جب تعریف کرنے پر تل جائیں تو چاند ستارے ایک کر دیں گے....

میں نے بھیگتی ہوئی آنکھوں سے کہا، ''اتنی جو تعریفیں کر رہے ہیں اتنا شاندار ذہن لے کر یہ لڑکا جان سے بچ جائے بات تو تب ہے وہ تو اس قدر جنون میں آتا جا رہا ہے کہ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ اسے تھوڑا سا اور سمجھا کر دیکھئے۔ ابھی تو وہ بچہ ہے۔ پچھلے سال ہی ایف ایس سی پاس کیا ہے۔ طالب علمی کے اہم مراحل تو ابھی سامنے پڑے ہیں۔''

اکرام بھائی سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے، ''ملک کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ یحییٰ، مجیب بات چیت کا کیا نتیجہ نکلے گا ابھی واضح نہیں ہو رہا ہے۔ پھر گزشتہ روز بھٹو صاحب بھی بارہ مشیروں کو ساتھ لے کر ڈھاکہ آئے ہیں۔''

''لگتا ہے کہ وہ لوگ بہت خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ اخبار میں دیکھ رہی تھی کہ سخت سیکورٹی کے ساتھ طیارے سے اترے ہیں۔ ہوٹل انٹرکان میں ٹھہرے ہیں۔ وہاں پر بھی سیکورٹی کے انتظامات بہت سخت ہیں۔''

شریف نے کہا، ''کل آتے ہی بھٹو نے یحییٰ کے ساتھ دو گھنٹے تک بات چیت کی ہے حالانکہ یحییٰ جس روز ڈھاکہ آئے تھے اس پورے دن میں مجیب کی خبر تک نہیں لی تھی۔ دوسرے روز دوپہر کے ڈھائی بجے جا کر کہیں دونوں کی ملاقات ہوئی۔''

اکرام بھائی نے کہا، ''جانے کیوں اس ساری کارروائی کے اندر سے سازش کی بو آتی ہے۔''

دروازے پر گھنٹی بجی۔ قاسم نے دروازہ کھول دیا۔ مرتضیٰ بھائی اور مصطفیٰ بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔

ہم کھانے کی میز سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ اطمینان سے بیٹھ کر خیریت معلوم کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا ''ملک کے حالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

شریف نے کہا، ''بظاہر تو گرم ریت پر دانے بھن رہے ہیں۔ یحییٰ، مجیب، بھٹو بات چیت کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ.... ڈاکٹر، انجینئر، سی ایس پی، ای پی سی ایس.... سب اپنے اپنے بینر کے نیچے متحد ہو کر جلسے کر رہے ہیں، مظاہرے کر رہے ہیں۔ جیدیو پور میں فوج عوام پر گولی چلاتی ہے، ٹنگی اور نرائن گنج میں اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ میر پور، چٹاگانگ، پاربتی، سید پور میں بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان خونریز تصادم ہو رہے ہیں۔ فوج بہاریوں کو اکسا کر ان کی مدد کر رہی ہے۔''

مصطفیٰ بھائی نے کہا، ''تمہارے خیال میں کل کسی قسم کے تصادم کا خدشہ ہے؟''

شریف نے کہا، ''لگتا تو نہیں البتہ جیدیو پور کے واقعہ نے عوام کو نئے سرے سے بھڑکا دیا ہے۔ میر پور میں صورتحال بہت گرم ہے۔ دوسری طرف بنگالی بھی بہت خونخوار ہو چکے ہیں۔ پرسوں یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں چھاترا یونین کے عوامی بہانی کی پرجوش پریڈ منعقد ہوئی ہے۔ پریڈ کے اختتام پر پانچ سولڑکے اور لڑکیوں نے سڑک پر مارچ پاسٹ کیا اور سڑک کے دونوں طرف ہزاروں تماشائی کھڑے ہو کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تالیاں بجاتے رہے۔ چنانچہ کل تک صورتحال کس طرف کا رخ بدلے، پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ کل پلٹن کے میدان میں جوائی بنگلہ عوامی بہانی کی پریڈ ہوگی۔''

اگلے کل ۲۳ مارچ یوم مزاحمت کے طور پر منایا جائے گا۔ اس سلسلے میں پورے ملک میں شدید اشتعال اور اضطراب پھیل چکا ہے۔ وسیع پیمانے پر عوامی حمایت اور حرکت موجود ہے۔ ''کینڈریو چھاترا پرشد'' ۲۰ مارچ ہی کو یوم مزاحمت کی کال اور پروگرام دے چکے ہیں۔ بھاشانی نیپ نے اس دن کو یوم نجات کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت حاصل کرنے کے مقصد سے ڈھاکہ کے مختلف چوکوں پر روزانہ جلسوں کا اہتمام کر رہی ہے۔ طلباء اور مزدوروں کی دیگر جماعتوں کے علاوہ دوسری سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں کی رضا کار باہنی نے بھی یوم مزاحمت کی زبردست تحریک شروع کر رکھی ہے۔

مرتضیٰ بھائی نے کہا، ''بھابی آپ نے غور کیا کہ آج کے اخبار میں آزاد بنگال کے جھنڈے کی تصویر چھپی ہے؟''

میں نے کہا، ''ظاہر ہے.... درحقیقت میں خود بھی کافی سارے جھنڈے خرید کر لائی ہوں.....''

''اتنے ساروں کا کیا کریں گی؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا، ''جو لوگ آخری وقت میں بازار جا کر خرید نہیں پائیں گے ان کو دے دوں گی۔''

''سچ!..... دکھایئے تو سہی ایک جھنڈا۔''

میں دوسری منزل پر جا کر تین چار جھنڈے اٹھا لائی۔ سب نے ایک ایک جھنڈا ہاتھوں میں اٹھا لیا اور تہہ کھول کر مسرت بھری نظروں سے گھورتے رہے۔ میں نے کہا، ''آپ لوگ ایک ایک جھنڈا لے جایئے، کل بلند کیجئے گا۔''

سارے بخوشی جاتے ہوئے ایک ایک جھنڈا ساتھ لے کر گئے۔

بارہ بجے شریف کے دوست اور کولیگ انجینئر بانکا اور منظور آئے۔ بانکا کا اصل نام ایس آر خان ہے۔ مگر ''بانکا'' اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ لوگ اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ میں نے ان کو بھی ایک ایک جھنڈا تحفہ دیا۔ اسی رفتار سے رات کے دس بجے تک بہت سے مہمان آتے رہے۔

دوپہر کے کھانے پر کٹی نے کہا، ''امی مجھے جھنڈا نہیں دیں گی؟''

''ضرور دوں گی۔''

آج کٹی یہاں سے چلی جائے گی۔ فی الحال گلشن میں ایک امریکی کنبے کے ساتھ رہے گی۔ عوامی تحریک کے نتیجے میں عوام امریکہ سے جس حد تک بے زار ہو چکے ہیں اب مزید کسی بنگالی گھرانے میں رہنا اس کے لئے تشویشناک ہے۔ دو روز پہلے ہی دھان منڈی میں امریکی کونسل جنرل کے گھر پر بم پھینکا جا چکا ہے.... تاہم کوئی بھی اس واقعے میں ہلاک یا زخمی نہیں ہوا۔ کٹی کے تحفظ کے لئے ہی اس کا یہاں سے چلے جانا ضروری ہے۔ شام کے وقت مسٹر چائلڈر کٹی کو لے جانے کے لئے آئے۔ کٹی بہت غمگین ہو کر یہاں سے رخصت ہوئی۔

آج ایک اور وجہ سے بھی دل اداس ہے.... سبحان آج نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسے کھانے پکانے کا کام کرنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ تحریک میں شرکت کرنا چاہتا ہے.... بے شک کرے.... مگر ہمارے

گھر کا کھانا کون پکائے گا۔؟

۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج یوم مزاحمت ہے۔

صبح سویرے گھر کے سب لوگوں نے چھت پر جا کر مزاحمتی کالے جھنڈے کے برابر میں ہی ایک اور بانس پر آزاد بنگلہ کا نیا جھنڈا بلند کیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ خوشی، اضطراب، امنگیں، خوف.... سب کا ملا جلا احساس۔

ناشتے کے بعد سب لوگ گاڑی پر باہر نکلے۔ شہر بھر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ ہر جگہ تمام مکانوں کی چھتوں پر کالے جھنڈے کے ساتھ سبز، سرخ اور زرد رنگ کا نیا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ میں نے لہراتے ہوئے جھنڈوں کی بہت سی تصویریں اتاریں۔ گھومتے گھومتے دھان منڈی دو نمبر روڈ پر بانکا کے گھر پر جا کر رکے۔ وہاں پر تھوڑی دیر تک بیٹھنے کے بعد بانکا کے گھر کے بالکل سامنے سڑک کی الٹی طرف ڈاکٹر خالق کے گھر پر گئے۔ ڈاکٹر خالق کے گھر پر ان کی سالی مدیرا اور ان کے شوہر نیوی کے ریٹائرڈ کمانڈر معظم کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ نیوی سے ریٹائر ہونے کے بعد معظم نے آج سے دو سال قبل ایک سیاسی جماعت تشکیل دی ہے.... خاصا طویل سا نام ہے۔ معظم کے ساتھ جب بھی ملاقات ہوتی ہے وہ ہنستے ہوئے کہتے ہیں، ''شیخ صاحب کے چھ نکات ہیں مگر میرا ایک ہی مطالبہ ہے..... مشرقی بنگال کی آزادی۔''

آج معظم ہنس کر بولے، ''آج تو شیخ صاحب بھی ''ایک دفعہ'' کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

آج انہیں اپنے ہی مکان پر آزاد بنگلہ کا جھنڈا بلند کرنا پڑا ہے۔''

مسز خالق نے سوال کیا، ''تم لوگ پلٹن گئے تھے پریڈ دیکھنے کے لئے؟''

''نہیں۔ ہم بس سڑکوں پر ہی گھومتے رہے..... نیا جھنڈا دیکھتے ہوئے۔ دفتروں کی عمارتوں پر بھی آزاد بنگلہ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ انٹر کانٹینٹل میں بھی۔ وہاں پر اتنے فوجیوں کی موجودگی میں جھنڈا لہرانا کس طرح سے ممکن ہوا؟''

معظم نے کہا، ''بنگال کی سرزمین ناقابل تسخیر ہے..... بنگالیوں کا دل بھی۔''

غیر ملکی سفارت خانوں میں بھی نیا جھنڈا بلند ہوا ہے۔ اتنا مزیدار لگا یہ منظر دیکھنے میں۔ سب سے

زیادہ مزا آیا شہید مینار کے سامنے پہنچ کر۔ قمرالحسن کا ڈیزائن کیا ہوا ایک زبردست پوسٹر دیکھا۔ مینار کی سیڑھوں پر ترتیب سے لگا ہوا ہے۔ پوسٹر پر ایک چہرہ بنا ہوا ہے۔ نیچے لکھا ہوا ہے ''ان کا خاتمہ کرو۔'' پوسٹر پر بنے ہوئے چہرے کی شکل صدر یحیٰ سے ملتی ہے۔''

''سچ؟ ہمیں بھی جانا پڑے گا دیکھنے کے لئے۔''

ٹیلی ویژن کی نشریات آج ختم ہی نہیں ہو رہی ہیں۔ عام دنوں میں ساڑھے نو بجے تک نشریات ختم ہو جاتی ہیں مگر آج جیسے جشن کا دن ہو۔ پروگرام ختم ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ سوکنت کی نظموں پر مبنی دو خوبصورت پروگرام پیش کئے جا چکے ہیں۔ دوسری پیشکش میں، پس منظر میں سوکنت کی نظم ''دیا سلائی'' پڑھی گئی ساتھ ہی ٹی وی کے پردے پر ماچس کی لاتعداد تیلیاں یکے بعد دیگرے سلگتے ہوئے دکھائی گئیں۔ ایک تیلی کی آگ سے دوسری تیلی سلگتی ہے اور آخر میں ساری تیلیاں اکٹھی مشعل کی طرح جلتے ہوئے پوری سکرین پر پھیل جاتی ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ المعمون کا ایک ڈرامہ شروع ہوا۔ ''لوٹوں گا پھر سے''۔ ۶۹ء کی عوامی تحریک کے دوران شہید ہونے والے ایک نوجوان کی بھولی ہوئی یاد تازہ ہو گئی۔ ۷۱ء کی عوامی تحریک کے دوران یہ ڈرامہ ۲۳ مارچ کی رات کے پونے گیارہ بجے شروع ہو کر ۲۴ مارچ کے پہلے پہر میں ختم ہوا۔ رات کے بارہ بج کر نو منٹ پر اناؤنسر فیروز الدین نے نشریات کا اختتامی اعلان کرتے ہوئے کہا:

اس وقت ''بنگلہ دیش'' کے معیاری وقت کے مطابق رات کے بارہ بج کر نو منٹ ہوئے ہیں..... آج ۲۴ مارچ بروز بدھ..... ہماری نشریات اب کل تک کے لئے ختم ہوتی ہیں۔''

اس کے بعد پردے پر پاکستان کا چاند ستارے والا جھنڈا لہرانے لگا اور پس منظر میں پاکستان کے قومی ترانے کی دھن بجنے لگی۔

اتنی دیر میں ساری بات واضح ہوئی..... ۲۳ تاریخ کو یوم مزاحمت کے حصے کے طور پر مناتے ہوئے اٹل بنگالیوں نے ٹی وی کے پردے پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے سے اجتناب کیا..... چنانچہ بارہ بجے تاریخ بدلنے کے بعد ہی نشریات کا خاتمہ کیا گیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

۲۳ مارچ کے پررونق یوم مزاحمت کے بعد سے ایک سیاہ سائے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ چاروں طرف سے تباہ کن خبریں سنائی دے رہی ہیں۔ یحییٰ، مجیب، بھٹو بات چیت کوئی بھی حل تلاش کرنے میں اب تک ناکام ہے۔ شیخ مجیب روزانہ ایوان صدر جا رہے ہیں بات چیت کرنے کے لئے۔ باہر نکل کر صحافیوں سے کہہ رہے ہیں کہ گفتگو آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف وہ متحرک جنگجو عوام سے مراعات کی حصولی کے لئے جدوجہد جاری رکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ گھر گھر قلعے قائم کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

کچھ دنوں سے سننے میں آ رہا ہے کہ روزانہ کثیر تعداد میں سفید لباس میں فوجی آ کر ہوائی اڈے پر اتر رہے ہیں۔ اس خبر پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل کانپ اٹھتا ہے۔ چٹاگانگ کے دو تین دوستوں سے ٹیلی فون پر معلوم ہوا ہے کہ اسلحے سے لدے ہوئے بحری جہاز مغربی پاکستان سے آ کر چٹاگانگ بندرگاہ پر لنگر انداز ہو رہے ہیں۔ اسلحے کی اس ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے جیالے بنگالی سڑکوں پر جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ ان کے عزائم کو کچلنے کے لئے فوج ان پر ہلا بول رہی ہے۔

رومی کے چہرے پر دو تین دن کی بڑھی ہوئی داڑھی ہے۔ سر کے بال نوچ کر رومی نے کہا، ''امی آپ کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ یحییٰ، مجیب بات چیت کی ناکامی یقینی ہے۔ وہ تو صرف وقت لینے کا بہانہ ہے۔ وہ ہمیں آزادی نہیں دینا چاہتے۔ آزادی ہمیں چھین کر لینا پڑے گی۔ مسلح جدوجہد کے ذریعے۔''

میں سہم گئی۔ ''کیا کہہ رہے ہو! پاکستانی فوج کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ ان کے خلاف کس چیز سے مسلح جنگ کرو گے؟''

''بالکل درست! میرا بھی یہی سوال ہے۔'' رومی نے بے چینی سے کہا۔ ''سفید گاڑی پر کالا جھنڈا لہرا کر شیخ صاحب روزانہ ایوان صدر جا رہے ہیں مگر گفتگو میں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ دوسری طرف طیارے بھر کر روزانہ سادہ لباس میں ہزاروں فوجی آ کر اتر رہے ہیں۔ چٹاگانگ میں اسلحے کے جہاز لنگر انداز ہو رہے ہیں اور اس طرف بے باک بنگالی لاٹھیاں اٹھا کر روزانہ بنگلہ بندھو کے گھر کے سامنے جا کر انہیں سلام کر کے امنڈتے دل لے کر اپنے گھروں میں واپس آ کر پیٹ بھر کے مچھلی چاول کھا کر اطمینان کی نیند سو رہے ہیں۔ پلٹن کے میدان میں مصنوعی بندوقوں کے ساتھ پیریڈ کر رہے ہیں۔ کیا اب بھی ہم الف لیلیٰ کی دنیا میں بس رہے ہیں؟ بچگانہ

حرکات کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"تو اب حل کیا ہے؟"

"حل شائد اب کچھ بھی نہیں ہے"

"اس طرح سی مت کہو۔تم شیخ صاحب کی سیاست سے اتفاق نہیں کرتے اس لئے یہ بات کر رہے ہو۔تم لوگ تو جنگجو ہو۔صرف مار دھاڑ کی بات سمجھتے ہو۔شیخ صاحب مثبت لائحہ عمل پر تحریک چلا رہے ہیں۔یحییٰ کے ساتھ بات چیت ناکام بھی ہو جائے تو اسی طرح پر امن عدم تعاون کی تحریک کے ذریعے عوامی مطالبہ ضرور منوالیا جائے گا۔"

"امی تم کون سے احمقوں کی جنت کی بات کرتی ہو؟ صرف چند ایک پہلوؤں پر غور کر کے دیکھو۔ مشرقی پاکستان میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے پاکستان کی حکومت کے خلاف ہو رہا ہے۔عام نقطۂ نظر سے یہ ملک دشمنی ہے۔ملک کے حاکم عالیٰ یعنی صدر مملکت بذات خود موجود ہیں حالانکہ ملک چل رہا ہے شیخ مجیب کے اقوال کے مطابق۔لوگ دفتر، بینک، عدالت سب کچھ شیخ صاحب کے مقرر کردہ وقت پر چلا رہے ہیں۔اس کے بعد دیکھو پاکستانی حکومت کی بدحالی....ٹکا خان کو حلف دلانے کے لئے کسی بھی جج کو آمادہ نہیں کیا جا سکا۔چنانچہ ٹکا خان گورنر کے عہدے پر فائز نہیں ہو سکے۔مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام چلا رہے ہیں۔صدر صاحب ڈھاکہ پہنچے تو ان کی رہائش گاہ کے سامنے مظاہرہ ہوا۔مسلح افواج کو کوئی بھی بنگالی اشیائے خورد و نوش فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں۔کتنے دن تو انہیں دال روٹیوں پر گزارا کرنا پڑا۔بالآخر ہوائی جہاز پر مغربی پاکستان سے کھانے پینے کا سامان منگوانا پڑا۔اتنا کچھ بیت جانے کے بعد بھی یحییٰ حکومت منہ بند کر کے خاموش بیٹھی ہے۔مگر کیوں؟ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ وہ صرف وقت لے رہے ہیں۔وہ گفتگو کے نام پر ہمیں بہلا رہے ہیں۔شیخ صاحب نے بہت دیر کر دی ہے۔اس لائحہ عمل پر ہم ٹھہر نہیں سکیں گے۔"

میں نے خفا ہو کر کہا، شیو کر کے صابن اور ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح نہا لو بیٹا۔دماغ بہت گرم ہو رہا ہے۔"

رومی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔میں کھوکھلی سی ہو گئی۔جیسے اپنے دل پر بھی کوئی زور نہ رہا ہو۔

آج رابندر اسنگیت کے فنکار عتیق اور بولو کے گھر پر رات کے کھانے کی دعوت ہے۔ایسی صورتحال میں دعوت پر جانے کو دل نہیں کرتا۔گھر پر بیٹھے رہنے سے بھی گھٹن ہوتی ہے۔ڈھاکہ کلب میں شریف کی میٹنگ تھی لہٰذا عتیق کے گھر پر میں اکیلی گئی۔وہاں پر عنایت اللہ خان اور ان کی بیگم لینا کے چھوٹے بھائی ظل الرحمٰن اور ان کی امریکن بیوی مارگریٹ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔اور بھی آئے ہوئے تھے عتیق کے دوست حلیم اور ان کی بیگم مونی۔ فتح اور ان کی بیگم۔سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا.....کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟۔

معلوم ہوا ہے کہ صدر یحییٰ کسی کو اطلاع کئے بغیر خاموشی سے طیارے پر بیٹھ کر مغربی پاکستان چلے گئے ہیں۔سڑکوں پر اتنے میں فوجی اتر آئے ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر فوجیوں کو کیوں اتارا جا رہا ہے۔

ساڑھے نو بجے معصومہ ٹی وی کے دفتر سے واپس آئی۔کچھ دنوں سے بڑے بھائی رفیق الاسلام کا گھر

چھوڑ کر منجھلے بھائی عتیق الاسلام کے گھر پر رہ رہی ہے۔ وہ آئی آندھی میں گرے ہوئے پرندے کی طرح نڈھال چہرہ لے کر۔ سب کے دل میں جو اندیشہ ہے اس کے دل میں بھی وہی خوف... بلکہ اس نے ٹی وی سٹیشن پر ہم سے زیادہ خبریں سنی ہیں۔ معصومہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھی۔ کہنے لگی بہت زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔ اپنے کمرے میں چلتی ہوں۔ بہت دیر کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کے لئے نہیں آئی۔

ہم لوگوں کو بھی بھوک نہیں تھی۔ کسی طرح کھانا ختم کیا سب نے۔ ساڑھے دس بجے شریف نے فون کیا۔ ''بھئی اب دیر کیوں کر رہی ہو؟ شہر میں حالات اچھے نہیں ہیں۔ بہت سی جگہوں پر لوگ نئے سرے سے رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ سڑکوں پر آرمی کی گاڑیاں چکر لگا رہی ہیں۔ بس اب جلدی سے آجاؤ۔''

سو گئی تھی۔ دھماکے کی آواز سے نیند ٹوٹ گئی۔ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ رومی جامی بھاگ کر میرے کمرے میں آئے۔ کیا ہوا؟ دو تین قسم کی آوازیں ہیں۔ بھاری بم کا دھماکہ، مشین گنوں کی متواتر ٹھا ٹھا اور چیں کر کے ایک اور تیکھی آواز۔ آسمان پر بار بار کوئی شے روشن ہوتی ہے۔ کمرے کے اندر تک اجالا ہو جاتا ہے۔ ہم سب لوگ بھاگ کر چھت پر گئے۔ ہمارے گھر سے جنوب کی طرف میدان کے اس پار اقبال ہال ہے۔ ساتھ ہی محسن ہال، کچھ دوسرے ہال کے علاوہ یونیورسٹی کوارٹرز کی چند بلڈنگیں۔ زیادہ تر آوازیں اسی طرف سے آرہی ہیں۔ ساتھ ہی بہت سے انسانوں کے چیخنے کی آوازیں۔ زیادہ دیر چھت پر رکنا ممکن نہیں ہوا۔ چیں کی آواز نکال کر آگ کے شعلے کی طرح کوئی شے اس طرف اڑتی ہوئی آرہی ہے۔ رومی نے لپک کر سیاہ اور آزاد بنگال کا نیا جھنڈا اتار لیا۔

اچانک یاد آیا نچلی منزل میں بارک اور قاسم ہیں۔ جلدی سے سب نیچے اتر آئے۔ کچن کے اندر سے صحن کی طرف کا دروازہ کھولتے ہی ہمارا السیشن کتا کمی تیر کی طرح اندر آ کر ہمارے پیروں پر لوٹتے ہوئے مریل سی آوازیں نکالنے لگا۔ صحن کی طرف منہ کر کے بارک اور قاسم کا نام پکارا ہی تھا کہ دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر روتے روتے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ میں نے کہا، تم لوگ اپنے بستر لے کر اندر کے کمرے میں چلے آؤ۔

کمی کو کسی طرح بھی گھر کے اندر سے صحن پر اتارنا ممکن نہیں ہوا۔ اتنی گولیوں کی آواز اور مختلف رنگ کی چمکیلی روشنیاں دیکھ کر گھبرا گیا ہے۔ رومی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا ''گھبراؤ مت، تم ہمارے ساتھ اوپر رہو گے۔'' اس کو اوپر لے کر جانا بھی ممکن نہیں ہوا۔ شدید خوف کے مارے وہ بس کونے تلاش کرتا رہا۔ بالآخر سیڑھیوں کے نیچے ایک کونے میں دم دبا کر لیٹ گیا۔

ڈرائنگ روم میں جا کر فون اٹھایا۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈیڈ پڑا ہے۔ اوپر کی منزل پر چلے آئے۔ بابا کی آواز سنائی دی۔ رومی بابا کا ہاتھ تھام کر ہلکی آواز میں پتہ نہیں ان کے کان میں کیا کچھ کہتا رہا۔

بقیہ رات پھر نیند نہیں آئی۔ دوبارہ چھت پر گئی۔ دور افق پر شعلوں کا رنگ نظر آرہا ہے۔ مختلف اطراف سے گولیوں کی آواز آرہی ہے۔ مختلف رنگ کے ٹریسر ہوائیاں آسمان پر ہولی کھیل رہے ہیں۔ دور سے آتی ہوئی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب ہر طرف سے دہکتے ہوئے شعلوں کے مینار بلند تر واضح تر ہوتے جا رہے ہیں۔

کسی کی زبان پر کوئی بات نہیں ہے۔ رومی اور جامی چہرہ زرد کئے ہوئے خاموشی کے ساتھ ستلیوں کا بندھن کھول کر ایک ایک کر کے پلاسٹک کے تھیلے کموڈ میں انڈیلتے رہے۔ تھوڑا سا ڈال کر فلش کر کے ذرا سا انتظار کرنے کے بعد دوبارہ انڈیلتے ہیں اور پھر سے فلش کرتے ہیں۔ ایک ساتھ سارا مصالحہ ڈالنے سے کموڈ بند ہونے کا خطرہ ہے۔ جامی نے برتن مانجنے کے پوڈر سے تین تین مرتبہ ہاون دستہ دھویا۔ ایک بار مانج کر سونگھتا ہے.... پھر سے مانجنے لگتا ہے۔

یہ کام مکمل کرنے کے بعد رومی نے مارکس، اینگلس کی کتابیں، ماؤزے تنگ کی عسکری تحریریں۔ سب کچھ ایک پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالا۔ ہم سوچنے لگے کہ کتابوں کو کہاں پر چھپایا جائے۔ مٹی کے نیچے دفنانے سے کتابیں خراب ہو جائیں گی۔ آخر میں یاد آیا بارک لوگوں کے کمرے کے پیچھے صحن کی دیوار میں ایک جگہ پر شگاف سا ہے۔ پڑوسی ہیشام صاحب کی دیوار کی وجہ سے یہ شگاف سا بنا ہے۔ یہاں پر کتابوں کا پیکٹ رکھ دیا جائے تو چھپا بھی رہے گا اور خراب بھی نہیں ہوگا۔

افق پر روشنی کی پہلی لکیر پھیلتے ہی رومی نے احتیاط کے ساتھ وہاں جا کر کتابوں کا پیکٹ رکھ کر اوپر سے ناریل کے چند خشک پتے ڈال دیئے۔

۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

چھ بجے کے قریب کانپتی ہوئی کمزور سی آواز کانوں میں آئی۔ ''آپا! آپا! چونک کر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کہ باغ کے اندر ایک پودے کے نیچے سکڑ کر کمال عطاالرحمٰن بیٹھا کانپ رہا ہے۔ یونیورسٹی میں بنگالی ادب کا آنارس کا طالب علم ہے۔ محسن ہال میں رہتا ہے۔ بھاگ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ رومی اور جامی دروازہ کھول کر عطاء کو سہارا دے کر اندر لے آئے جو انتہائی سہما ہوا، تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔ اس نے ساری رات ہال کی نچلی منزل پر ایک باتھ روم کے اندر دس بارہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گزار دی تھی۔ ٹریسر ہوائیوں کی روشنی کی وجہ سے رات کے وقت باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ سحر کے وقت روشنی نکلنے کے بعد ٹریسر چلنا بند ہوئے تب وہ لوگ باتھ روم سے نکلے اور میدان سے گزرتے، خندق عبور کرتے، ریلوے لائن کے اوپر سے چاروں ہاتھ پیروں پر رینگتے ہوئے فرار ہو کر آئے ہیں۔

کمال کی طبیعت بحال ہونے کے بعد ریڈیو آن کیا۔ قرآن کی تلاوت ختم ہونے کے بعد ایک ہی دھن بار بار بجنے لگی.... میرے ایک پسندیدہ نغمے کی دھن۔ سات بجے پڑوسی اے کے خان کے گھر فون کرنے کے لئے گئی مگر ان کا فون بھی ڈیڈ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں گلی کے دوسرے مکانوں سے لوگ محتاط انداز میں باہر جھانکنے لگے۔ سب کے چہروں پر خوف طاری ہے.... رات سب نے جاگ کر گزاری ہے۔ اصل واقعہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ سب کے فون ڈیڈ پڑے ہیں۔

گھر واپس آ کر ریڈیو آن کیا۔ سامنے رکھ کر کھانے کی میز پر بیٹھی رہی۔ جامی کو آواز دے کر کہا، ''بارک کو ساتھ لے کر دادا کو جا کر جگا دو۔ ان کا منہ ہاتھ دھلوا کر ناشتہ کرا دو۔'' قاسم کٹھ پتلی کی طرح چلتا ہوا آیا اور میز پر ناشتہ لگا گیا۔ ناشتے کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا.... سب کا ہاتھ چائے کی پیالی کی طرف بڑھ گیا۔

ساڑھے نو بجے کے قریب ریڈیو پر دھن بجنا بند ہوئی۔ خشک اور غیر بنگالی لہجے میں کسی نے پہلے اردو اور پھر انگلش میں اعلان کیا: ''آئندہ احکامات تک کرفیو جاری رہے گا۔ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والے کو کیا سزا دی جائے گی یہ نہیں بتایا گیا۔ اناؤنسر نے بتایا کہ مارشل لاء جاری کیا جا چکا ہے اور پھر مارشل لاء ضابطے پڑھ کر سنانے لگا۔ اناؤنسر کا لہجہ اور تلفظ سن کر محسوس ہوا کہ جیسے وہ کوئی سپاہی ہوگا۔ فوجی حکومت کو اس سے زیادہ کوئی قابل شخص دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسی سے کام چلوا رہے ہیں۔

غیر معینہ مدت تک کے لئے کرفیو جاری کیا گیا ہے.....ویسے بھی فوج نے جس طرح سے اندھیر مچا رکھا ہے کہ کرفیو نہ نافذ کریں تو کس میں اتنی مجال ہے کہ باہر نکلے۔ گولیوں کی آوازیں مسلسل جاری ہیں۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے دھیمی پڑ جاتی ہیں۔ آگ کے شعلے دیکھنے کے لئے اب چھت پر جانے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ دوسری منزل کی کھڑکی سے واضح نظر آ رہا ہے۔ نیلے رنگ کے آسمان کا ایک حصہ سیاہ دھوئیں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔

کمی کی آہ وزاری نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کا السیشن مزاج ہی بدل گیا ہے۔ مسلسل گولیوں اور دھماکوں کی گونج سن کر اتنی اعلیٰ نسل کا کتا اس قدر خوفزدہ ہو جائے گا کسے معلوم تھا۔ اسے کچھ بھی کھلانا ممکن نہیں ہوا ہے۔ ہم سب نے باری باری اسے قریب بلا کر گردن میں بازو ڈال کر تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا ہے۔

بابا کی وجہ سے بھی کافی پریشانی ہے۔ پاکستانی فوج کس قصور کے بدلے میں اپنے ہی ملک کے شہریوں کو اس طرح سے مار رہی ہے یہ بات انہیں سمجھاتے ہوئے منہ سے جھاگ نکل آیا ہے مگر ان کی تسلی نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کا بلڈ پریشر نہ ہائی ہو جائے۔

ٹیلی فون.....ریڈیو بے جان..... باہر کرفیو.....گولیوں اور دھماکوں کی آواز سے کان کے پردے پھٹنے لگے ہیں۔ شہر پر کیا بیت رہی ہے معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک ہی چشم دید گواہ اور سکوپ خبر رساں کمال عطاالرحمٰن موجود ہے۔ صبح سے میرے سوالات کے جواب میں ایک ہی قصہ بار بار دہرا کر وہ بے چارہ بھی تنگ آ گیا ہے۔

''اچھا کمال.....رات کے بارہ بجے تم کیا کر رہے تھے؟''

''میں؟ میں ایک مقالہ لکھ رہا تھا..... بنگلہ ادب میں حب الوطنی کا عنصر.....۲۷ تاریخ کو ریڈیو پر پڑھنے کے لئے۔''

''گولیاں چلنے کی آواز تم نے پہلی بار کس وقت سنی؟''

''بارہ بجے۔ شائد دو چار منٹ اوپر ہو گئے ہوں گے۔ میرے ایک دوست نے آ کر کہا، ''تم اب تک ہال میں کیوں بیٹھے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ شہر میں سنگین حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ کیمپس پر حملہ کرنے کے لئے فوج آ رہی ہے۔ میں بھاگ کر گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی یہاں سے نکل جاؤ۔'' مگر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت گولیاں چلنے کی شدید آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں چاروں جانب روشنی پھیل گئی۔ ٹریسر روشن ہوتا ہے اور ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ میرا کمرہ پانچویں منزل پر ہے۔ میں جلدی نیچے اتر آیا۔ حاجی محسن ہال کے شمال میں اقبال ہال ہے اور اس کے بازو میں ایس ایم ہال۔ آوازوں سے یوں لگا جیسے بھاری توپ کے گولوں سے اقبال ہال اڑایا جا رہا ہو۔ ہمارے ہال کی طرف بھی گولیاں اڑ کر آ رہی تھیں۔''

''تمہارے ہال پر حملہ نہیں ہوا؟''

''ہم تو ہر لمحہ یہی سوچ رہے تھے کہ ابھی شائد محسن ہال پر بھی حملہ آور ہوں گے۔ مگر اس طرف وہ نہیں آئے۔''

''تمہارے اندازے کے مطابق کہاں کہاں پر حملہ کیا گیا ہے؟''

''ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ میرے خیال میں ایس ایم ہال، جگن ناتھ ہال اور شہید مینار پر.... کیونکہ زیادہ تر آوازیں اسی سمت سے آ رہی تھیں۔

''تمہارے خیال میں اقبال ہال، ایس ایم ہال کو بالکل تباہ کر دیا گیا ہے؟ تمام لڑکوں کو مار دیا گیا ہے؟''

'' کیسے بتاؤں؟ ہم تو نچلی منزل کے باتھ روم میں چھپے ہوئے تھے۔ آوازوں سے لگا کہ بھاری گولے بھی برسائے جا رہے ہیں۔ محسن ہال کے اوپر سے بھی گولیاں گزر رہی تھی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی جھنکار سنتے رہے ساری رات۔''

ایک مرتبہ کمال اٹھ کر باتھ روم گیا تو رومی نے مجھ سے کہا، ''امی اس سے اور سوال مت کریں۔ دیکھ نہیں رہیں کہ وہ کتنا پریشان ہو رہا ہے!''

''وہ تو محسوس کر رہی ہوں۔ مگر چاروں جانب کیا ہو رہا ہے اندازہ لگانا چاہ رہی ہوں۔''

''اندازہ لگانے کو اور کیا باقی رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی رہا ہے۔''

میں خاموشی سے رومی کی طرف دیکھنے لگی۔ رومی نے آنکھیں دوسری طرف ہٹالیں۔ کل رات سے وہ زیادہ بول نہیں رہا ہے۔ دم بخود ہو کر رہ گیا ہے۔ میں سوچ ہی ہوں کہ رومی کا اندازہ کتنا سچ نکلا۔

رومی یقیناً سوچ رہا ہوگا کہ امی نے اب کے منہ کی کھائی۔ اب خود ہی احمقوں کی جنت سے نکل آئیں گی۔

انسان کب تک گھر کے اندر بیٹھا رہ سکتا ہے؟ ایک بار اٹھ کر باہر گاڑی کے پاس برآمدے تک گئی۔ ہماری گلی اندھی ہے۔ ایلیفنٹ روڈ سے اتر کر ہمارے گھر تک آ کر راستہ ختم ہو گیا ہے اور گلی کے اس آخری سرے پر ڈاکٹر اے کے خان کا مکان ہے۔ اندھی گلی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں پر باہر کے لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس گلی کے رہنے والے اکثر گلی میں کھڑے ہو کر گپ شپ لگاتے ہیں، جیسے یہ گلی ہم سب کا مشترکہ صحن ہو۔ ۱۹۵۹ء میں یہاں پر مکان تعمیر کروا کر شفٹ ہونے کے بعد سے ڈھاکہ میں جتنی مرتبہ بھی کرفیو لاگو کیا گیا ہے ہم سب نے مکان کے سامنے کی اس گلی میں نکل کر گپ شپ کے ذریعے وقت گزارا ہے مگر آج گھر کے برآمدے سے اتر کر گلی میں قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ فضا میں ابھی تک مسلسل گولیوں کی آواز گونج رہی ہے۔ بیچ بیچ میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے جیسے انسانی چیخوں کی بھی آواز آ رہی ہے مگر واضح سمجھ نہیں آتی ہے یا شائد محض وہم ہو! گولیوں کی اس قدر بوچھاڑ کے بعد کوئی انسان چیخنے کے لئے زندہ بھی ہے؟ تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی کوے، چیل یا دوسرے کسی پرندے کی بھی آواز تک نہیں آ رہی ہے۔

صحن کی دیوار کے اندر پورے جسم کو رکھ کر گیٹ سے صرف سر نکال کر باہر جھانکا۔ بائیں طرف کی سڑک بالکل سنسان پڑی ہے۔ کافی دیر تک دیکھتے رہنے سے شائد فوج کی کوئی جیپ یا ٹرک گزرتا نظر آ جائے۔ فوجیوں کی گاڑی کو گزرتے دیکھنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔ میرے عین سیدھ میں حسین صاحب کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دروازے کے برابر کمرے کے اندر رکھی ہوئی کرسی پر بھی وہ آ کر بیٹھتے ہیں اور کبھی اٹھ کر باہر

برآمدے تک آتے ہیں جلدی سے دوبارہ اندر چلے جاتے ہیں۔ یہاں سے نظر آ رہا ہے کہ وہ کافی دیر سے کمرے کے اندر اور باہر کے برآمدے کے بیچ بے چینی سے چکر لگا رہے ہیں۔

میں مکان کے اندر آنے کے لئے گیٹ سے پیچھے مڑی۔ گاڑی کے شیشے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک گئی۔ شیشے پر رومی کا لگایا ہوا وہی سٹیکر چمک رہا ہے.... ایک ایک بنگلہ کا حرف ایک ایک بنگالی کی روح ہے۔ جلدی سے مکان کے اندر آ کر رومی کو آواز دی۔ ''جلدی سے جا کر گاڑی کے شیشے پر سے سٹیکر اتار ڈالو۔''

ٹھیک سر شام بجلی چلی گئی۔ بہت خوب! اب ساری کسر پوری ہو گئی ہے۔ گولیوں کی آواز میں ذرا کمی آئی ہے۔ مکی بھی جیسے تھوڑا سا سنبھل گیا ہے۔ کمرے کے اندر سے نکل کر صحن کے کونے میں اپنی چوکی پر جا کر بیٹھا ہے۔ تھوڑا بہت کھایا بھی ہے۔

میں نے چار پانچ موم بتیاں نکال کر نیچے اور اوپر کی منزل پر مختلف کمروں میں جلا کر رکھ دیں۔ آج صبح سے بارک اور قاسم ہمارے قریب قریب ہی گھوم رہے ہیں۔ شام ہونے پر میں نے بارق اور قاسم سے کہا، ''تم لوگ ابھی سے اپنے بستر وغیرہ لا کر گیسٹ روم میں رکھ چھوڑو۔'' وہ دونوں احسان مند ہو کر اپنے بستر اٹھانے کے لئے چلے گئے۔ گیسٹ روم میں بستر رکھ کر ہمارے قریب آ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ یوں لگا گویا ہم سب نوح کی کشتی پر سوار ہوئے ہوں۔

گھر پر کوئی اچھا ریڈیو بھی موجود نہیں ہے۔ اس سال ۲۰ فروری کی رات کے آخری پہر میں ہم سب لوگ شہید مینار کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اس وقت موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے گھر میں چور گھس آیا تھا۔ بہت سی قیمتی چیزوں کے ساتھ ہمارا اچھا والا ریڈیو بھی چرا کر لے گیا۔

اتنے دنوں تک کٹی کے ریڈیو سے کام چلا رہے تھے۔ اس کے گلشن چلے جانے بعد سے ہم رومی جامی کے، انجر پنجر ہلے ٹو ان ون سے گزارہ کر رہے ہیں مگر اس پر بی بی سی نہیں آتا ہے۔ آکاش بانی نے آج صرف اتنا کہا ہے کہ ڈھاکہ کی سڑکوں پر فوج اتاری گئی ہے۔ ٹی وی چل نہیں رہا ہے، چنانچہ کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ جلدی کھانا کھا کر نوکروں کو فارغ کر دیا۔ ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمروں میں جانے والے تھے کہ اچانک رومی ٹھٹھک گیا۔ ''مکی کی کوئی آواز نہیں آ رہی ہے۔ شائد پورا نارمل ہو گیا ہے۔''

ہم سب دوبارہ سے سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے۔ باورچی خانے کے اندر سے دروازہ کھول کر پیچھے کی طرف سے صحن میں اتر گئے۔ صحن کے کونے میں مکی کے بیٹھنے کی جگہ تک پہنچ کر موم بتی کی کانپتی ہوئی روشنی میں دیکھا کہ مکی مرا پڑا ہے۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

کل بھی رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ گولیوں کی آواز، شعلوں سے نکلنے والے دھوئیں کی کالی گھٹاؤں نے شہر بھر میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ صبح کے وقت گولیوں کی آواز تھوڑی دیر کے لئے بند رہی۔ تب سب نے گھروں سے منہ باہر نکال کر تاک جھانک شروع کی۔ بارق اور قاسم ہمت کر کے گیٹ سے باہر نکل کر گلی میں کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں بھاگے بھاگے اندر آ کر کہنے لگے۔ ''اماں، سڑک پر لوگ ہیں، گاڑیاں، رکشے چل رہے ہیں۔''

حیرت ہے! ریڈیو پر تو کرفیو ہٹانے کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ ریڈیو کی آواز اونچی کر کے جلدی سے ناشتہ لگانے کو کہہ کر کپڑے بدلنے لگ پڑی۔ ساڑھے آٹھ بجے ریڈیو پر کرفیو ہٹانے کا اعلان سنتے ہی رومی اور میں گاڑی پر باہر نکل آئے۔ کمال رخصت ہو کر اپنے بھائی کی طرف چلا گیا۔ جامی بابا کے پاس گھر پر رکا۔ شریف نے کہا، ''میں رکشے پر بانکا کی طرف سے ہو آتا ہوں۔''

ایلیفنٹ روڈ پر پہنچ کر میں نے کہا، ''پہلے امی کی طرف چلو۔ اس کے بعد ہسپتال۔''

رومی نے کہا، ''امی مجھے دو گھنٹوں کے لئے گاڑی چاہئے ہوگی۔''

''لے جانا۔ پہلے ضروری کام نپٹا لیں۔''

نیو مارکیٹ میں سبزیوں کے بازار کے سامنے پہنچ کر ''اوگاڈ!'' کہہ کر رومی نے بریک پر پاؤں رکھا۔ سامنے کچے سامان کا پورا بازار جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں سے اب تک دھواں نکل رہا ہے۔ میں نے چیخ کر کہا، ''انسان بھی جلے ہیں! وہ دیکھو چھاؤنی کے پیچھے!''

رومی نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ''امی پلیز، اس طرف مت دیکھو۔'' اس نے دائیں طرف میر پور روڈ پر گاڑی کو گھما لیا۔

ڈھاکہ کالج کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ سامنے سے اچھل اچھل کر چلتا، چاروں طرف نظریں گھماتا وحید آ رہا ہے۔ جوبلی کے بھائی کا لڑکا وحید، رومی سے دو تین سال بڑا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ رومی نے بریک دبا کر اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔

''کہاں پر جا رہے ہو بابو بھائی؟''

''جیش لوگوں کے گھر پر، وہ لوگ زندہ بھی ہیں یا نہیں معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ ہوں تو آج

ہی اپنے گھر پر لے آؤں گا۔ دھان منڈی کا علاقہ کسی حد تک محفوظ ہے۔"

میں نے کہا، "پہلے چھ نمبر روڈ پر چلو۔ امی کی خیریت معلوم کرنے کے بعد میں بھی چلوں گی جوبلی کی طرف۔"

دھان منڈی کی طرف اتنی تباہی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود دو نمبر روڈ پر ای پی آر کیمپ سے جو آوازیں آئی ہیں ان ہی نے امی اور لالو کی راتوں کی نیند حرام اور چہرہ فق کر دیا ہے۔ ان کی خیریت معلوم کر کے دریافت کیا کہ انہیں بازار سے کوئی سودا چاہئے ہے یا نہیں۔ اس کے بعد چند منٹوں کے اندر ہی دوبارہ سڑک پر اتر آئے۔ نیل کھیت کے یونیورسٹی کوارٹرز کی ۲۵ نمبر بلڈنگ میں بنگلہ کے پروفیسر رفیق الاسلام رہتے ہیں۔ رفیق، وحید کے پھوپھا ہونے کے علاوہ ہمارے بھی قریبی دوست ہیں۔ ان کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو رفیق بڑھی ہوئی داڑھی، سرخ آنکھیں اور الجھے خشک بال لئے دوڑ کر ہمارے قریب آئے۔ ہانپتے ہوئے رونے جیسے لہجے میں بولے، "آپا ہم برباد ہو گئے ہیں جلدی سے ہمیں یہاں سے لے چلو۔"

رفیق کی بیوی جوبلی، ان کے بچے برسن اور میگھ.... سب کا برا حال ہے۔ پچیس نمبر بلڈنگ کے پیچھے ہی اقبال ہال ہے چنانچہ شیل اور مورٹر کے بکھرے ہوئے پرزے اور ہیوی مشین گن کی گولیاں.... سب کچھ آ کر اس بلڈنگ کی دیواروں اور کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتا رہا ہے۔ کھڑکی سے اندر داخل ہو کر کمرے کے دوسری طرف کی دیواروں میں بھی گولیاں لگی ہیں۔ رفیق کے کنبے کے تمام افراد دو راتیں اور ایک دن تک پلنگ کے نیچے فرش پر سر ٹیک کر پڑے رہے ہیں۔

جوبلی وحید سے لپٹ کر رونے لگی۔ وحید نے تسلی دی۔ "مت رو جیش.... تم لوگوں کو ابھی اپنے گھر لے جائیں گے۔"

میں نے کہا، جوبلی تم لوگ جلدی سے ایک دو سوٹ کیسوں میں ضروری سامان ڈال لو۔ میرے دیور کی لڑکی ہسپتال میں ہے، اس کو دیکھ کر واپسی پر تم لوگوں کو بابو لوگوں کے گھر پر اتار دیں گے۔"

پچیس نمبر بلڈنگ سے نکل کر ہسپتال جاتے ہوئے، سڑک پر لوگ گروہ در گروہ بکسے، تھیلے، گٹھڑیاں سر پر، کندھوں پر اٹھائے ہوئے مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے نظر آئے۔ سامان سمیت سواریوں کو لے کر رکشے چھوٹے جا رہے ہیں۔ سڑک پر ایک بھی خالی رکشا نظر نہیں آیا۔ کبھی کبھی راہ گیر پرائیویٹ کاروں کو روکنے کے لئے ہاتھ اٹھا رہے تھے۔ دو تین بچوں والے ایک کنبے نے ہماری گاڑی کو روک کر کہا، "مہربانی کر کے ہمیں ذرا مالی باغ اتار دیں۔ رکشا نہیں مل رہا ہے۔"

میں نے ٹالنے کے لئے کہا، "ہسپتال میں مریض کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد رشتہ داروں کو ادھر سے ادھر لے کر جانا ہے۔ ہمیں معاف کیجئے، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

بے چاروں کی مدد نہ کرنے پر بہت افسوس ہوا مگر اس وقت مالی باغ تک جانے کے لئے حقیقتاً ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔

ہسپتال کے آؤٹ ڈور گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے رومی نے ایک مرتبہ پھر سے "اوہ گاڈ!"

کہہ کر بریک دبایا۔ قریب ہی شہید مینار کے مینار گولوں کی ضربوں سے ٹوٹ کر زمین پر گرے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ کیا کیا ہے انہوں نے! شہید مینار پر ہاتھ اٹھایا ہے! سر پر جالیوں والا ہیلمٹ پہن کر چاروں طرف فوجی کھڑے ہیں۔ میں نے دبی ہوئی آواز میں رومی سے کہا، ''گاڑی اندر لے چلو، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

گاڑی پارک کر کے آؤٹ ڈور کی طویل راہداری سے گزر کر بھاگے بھاگے اندر پہنچے۔ سارا ہسپتال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ کوئی زخمی رشتہ دار یا دوست کو لے کر آیا ہے۔ کوئی گمشدہ عزیزوں کا پتہ کرنے آیا ہے۔ خوفزدہ ہو کر کوئی پناہ ڈھونڈنے آیا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر جا رہے تھے کہ اچانک رکنا پڑ گیا.... شعبہ بنگلہ کے پروفیسر حئی کی بیوی ایسہ بیگم، بیٹی حسین جہان، ان کے بڑے بھائی اور بھابی کے علاوہ ان کے گھر کے تمام دوسرے افراد راہداری میں کھڑے ہیں۔ ایسہ بھابی اور حسین جہان دونوں مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ حئی سر کئی سال پہلے ہی ٹرین کے حادثے میں فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کا کنبہ ابھی تک یونیورسٹی کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ ان کی چونتیس نمبر بلڈنگ شہید مینار کے بالمقابل ہے۔ روتے روتے حسین جہان نے جو کچھ کہا میں سنتی رہی اور میرے حواس گم ہو گئے۔

''فوج نے ہماری بلڈنگ میں گھس کر مار پیٹ کر کے سب کا بھرکس نکال دیا ہے...'' سر منیر الزمان مارے گئے ہیں۔ سر جوتر مئی شدید زخمی ہوئے ہیں....''

میں سہم گئی۔ ''ہمارے سر منیر الزمان؟''

''نہیں بنگلہ کے نہیں سٹیٹسکس کے.... ہائے خالہ ہماری بلڈنگ خون میں ڈوب گئی ہے....''

''تمہارے فلیٹ میں تو نہیں گھسے تھے؟''

''ہم نے باہر کے دروازے پر تالا لٹکا دیا تھا اور اندر تمام لوگ پلنگ کے نیچے سکڑ کر پڑے رہے ہیں بہت دیر تک دروازہ دھکیلتے رہے ہیں مگر ہم نے چیں تک نہیں کی۔ لہٰذا وہ سمجھے کہ اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ سو ہم بچ گئے.... آج کرفیو ہٹتے ہی ہم سب نے ایک ساتھ آ کر ہسپتال میں پناہ لی ہے۔''

ان کے ساتھ کھڑے ہو کر دو چار منٹ باتیں کرنے کے بعد تیسری منزل کے نیوکیبن کی طرف بھاگے۔ اتنے بڑے ہسپتال کی تمام کشادہ راہداریوں میں دہشت زدہ لوگوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو دھکیل کر رش کے اندر سے آگے بڑھنے کے لئے راستہ بنانا پڑتا ہے۔

ایمن کے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا کہ اتنی دیر میں انور بھی پہنچ چکے ہیں۔ ایمن ادھ مری سی ہو کر بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ ایمن کی والدہ شیلی ہمیشہ سے خوش طبع اور صبر کرنے والی خاتون ہیں۔ چہرے پر ہمیشہ ہنسی کھلی رہتی ہے۔ آج بھی ان کا تحمل دیکھ کر تعجب ہوا۔ اتنے قیامت خیز سانحات کا اثر ان کی رت جگی آنکھوں، الجھے ہوئے بالوں اور سلوٹ زدہ ساڑھی میں تو نظر آتا ہے مگر ان کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ہے۔ ہسپتال میں پانی، کھانے پینے کا انتظام کچھ بھی نہیں ہے۔ شہید مینار پر مسلسل گولہ باری کے نتیجے میں ہسپتال کا ایک حصہ تقریباً تباہ

مکی کی لاش کے بارے میں سب لوگ بھول ہی چکے تھے۔ بھولتے بھی کیسے نہ..... صبح سے کس قدر بھاگ دوڑ کرتے رہے ہیں!

پورے ڈھاکہ میں سب لوگ دوڑ بھاگ میں مصروف ہیں۔ جس واقف کار سے بھی ملاقات ہوتی ہے رک کر دو گھڑی ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر کے ایک طرف کو بھاگ نکلتے ہیں۔ جتنے زیادہ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے اور ان پر بیتی ہوئی داستان سن رہی ہوں اتنا ہی دل بھاری چٹان تلے دبتا جا رہا ہے۔ رومی اب بے چین ہونے لگا ہے۔ مجھے گھر پر اتار کر دوستوں کی خبر لینے کے لئے بھاگے گا۔

مکی کی لاش کے بارے میں جب خیال آیا تو اس وقت کرفیو شروع ہونے میں صرف تیس چالیس منٹ باقی تھے۔ اتنی سی دیر میں جمعدار ڈھونڈ کر لانا ناممکن نہیں تھا پھر بھی ایک بار کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بارق اور قاسم کو جمعدار ڈھونڈنے بھیج دیا۔ ان سے تاکیداً کہہ دیا کہ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرفیو شروع ہونے کے بعد سڑک پر نظر آنے والے کسی بھی فرد کو فوجی گولی مار دیں گے۔ اسی خوف میں وہ دونوں دس منٹ کے بعد ہی لوٹ کر آ گئے۔ آ کر کہنے لگے، جمعدار کہیں پر بھی نہیں ہے!''

ایک اور فکر سر پر سوار ہو گئی۔ اب کل سے پہلے مکی کی لاش پھنکوانا ممکن نہیں ہوگا۔ اتنی دیر میں گل سڑ کر بدبو چھوڑ دے گی۔ ایک تو اتنی افسوس ناک خبریں سن کر دل پہلے ہی خراب ہو رہا ہے اس پر یہ ایک اور مصیبت۔

شریف رکشے پر بانکا کے گھر گئے تھے۔ وہاں سے ان کے ساتھ گاڑی پر کافی ساری جگہوں پر گھوم کر بہت ساری خبریں اکٹھی کر لائے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کا نامور مدھر کنٹین جلا کر راکھ کر دیا گیا ہے۔ مدھو دادا بھی نہیں رہے ہیں..... پاک فوج کی گولی سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ سٹیٹسٹکس ڈپارٹمنٹ کے منیر الزمان صاحب کے علاوہ دوسرے بہت سے اساتذہ کو پاک آرمی نے ہلاک کر دیا ہے.... ڈاکٹر جی سی دیو، ڈاکٹر ایف آر خان، مسٹر مکندر... سنا ہے کہ کلکتہ ریڈیو نے اپنی خبروں میں بتایا ہے کہ فوج کی گولی سے ڈاکٹر نیلمہ ابراہیم اور بیگم صوفیہ کمال ہلاک ہو گئے ہیں۔ نیلمہ آپا اور صوفیہ کمال آپا کی موت کی خبر سن کر میں رو پڑی۔

راجر باغ پولیس لائن پر زبردست تصادم کے بعد زیادہ تر بنگالی پولیس مین جان بحق ہو گئے ہیں۔ چند مجاہد بھاگ جانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ راجر باغ پولیس لائن کی دیواریں پاک فوج کی گولیوں سے چھلنی ہو چکی ہیں۔

پاک آرمی نے ''دی پیپل'' کا دفتر جلا دیا ہے۔ اتفاق کے دفتر کو بھی انہوں نے نذر آتش کر دیا ہے۔ ڈھاکہ کے تمام بازاروں اور کچی بستیوں میں آگ لگا دی گئی ہے.... آئر بازار، ٹھتاری بازار، نیا بازار، سکھاری پٹی.... سب جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔

شریف بانکا کے پاس سے ایک براہ راست خبر سن کر آئے ہیں:

بانکا لوگوں کے مکان سے دو مکانوں کے فاصلے پر ''ایسٹ پاکستان رائفلس'' کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ گہری

ہوگیا ہے۔ کسی کھڑکی کا کوئی شیشہ ثابت نہیں بچا ہے۔ دیواریں گولیوں سے چھلنی ہوگئی ہیں۔ بہت سے ڈاکٹروں نے کنبے سمیت ہسپتال کے اندر پناہ لی ہے۔ میں نے حیرت زدہ ہوکر سوال کیا، ''مریض کو کس طرح سے سنبھالا ہے؟ اور تم نے ان دنوں کے دوران کیا کھایا ہے؟'' تھکے ہوئے ہونٹوں پر ہنسی پھیلا کر شیلی نے کہا، بڑی مشکل میں وقت گزارا ہے۔ ڈبل روٹی بسکٹ اور ''ڈاب'' کے پانی سے گزارا کرتی رہی ہوں، اور ڈاکٹروں کی غیر موجودگی کی وجہ سے.... خیر اتنا نہیں گھبرائی....''

دل ہی دل میں شیلی پر رشک کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

باہر آکر رومی نے کہا، ''امی میں ذرا صاد کی طرف جانا چاہتا ہوں۔''

صاد عندلیب رومی کا واحد دوست ہے جو عمر میں رومی سے بڑا نہیں ہے اور دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے ہیں۔

''رفیق لوگوں کو پہلے بابو لوگوں کے گھر پر پہنچا دیں، کچھ سودے وغیرہ خرید کر تمہاری نانی کی طرف دے آئیں اس کے بعد تم گاڑی لے کر چلے جانا۔''

مجھے گھر پر اتارنے کے لئے گاڑی گیٹ سے اندر لیتے ہی سامنے گاڑی کے برآمدے پر بدیع الزمان سائیکل پر سے اترتا ہوا نظر آیا۔

بدیع الزمان بنگلہ اکیڈمی میں نوکری کرتا ہے۔ بہت سالوں سے ہمارے ساتھ اس کے قریبی تعلقات ہیں۔ راجر باغ پولیس لائن کے قریب اس کے سسر عبدالقدوس بھوئیاں کا اپنا مکان ہے۔ بدیع الزمان کی بیوی اپنے دو مہینے کے بچے کے ساتھ اپنے باپ کے گھر پر تھی۔ بدیع تھا ایلیفنٹ میں اپنے چچا کے گھر پر۔ آج صبح کرفیو ہٹنے کے بعد اس نے اپنے سسر کے گھر جا کر سنا کہ گزشتہ دو راتوں اور ایک دن کے دوران وہاں پر قیامت گزر گئی ہے۔

راجر باغ پولیس لائن کی پولیس فورس نے جان کی بازی لگا کر پاکستانی فوج کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے بھوئیاں صاحب کے مکان سمیت آس پاس کے کئی مکانوں میں پوزیشن لی۔ وہ لوگ فرار ہوتے وقت پورے مکان کے اندر اسلحہ، یونیفارم وغیرہ ادھر ادھر پھینک گئے ہیں۔ اب ان کے لئے اس مکان میں رہنا بالکل بھی محفوظ نہیں ہے چنانچہ بدیع الزمان کسی اور محفوظ مقام کی تلاش میں نکلا ہے۔ وہ پہلے اپنے صحافی رشتہ دار کے جی مصطفیٰ کے عظیم پور کے مکان پر گیا تھا مگر خود کے جی مصطفیٰ کی وجہ سے ان کا اپنا مکان بھی محفوظ نہیں ہے بلکہ وہ خود ہی کسی اور مقام پر منتقل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔

بدیع الزمان اپنی ایک اور واقف کار مسز مہر دلا ور حسین کے گھر پر بھی گیا تھا۔ ان کے بچوں کو بدیع نے کچھ عرصہ پڑھایا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ صرف بچے سمیت کاجل کو رکھ سکتی ہیں۔ اب باقی لوگوں کے لئے کسی انتظام کی تلاش میں ہے۔

میں نے کہا، ''امی کے گھر کی نچلی منزل خالی پڑی ہے، وہاں پر تم سب لوگ آرام سے رہ سکو گے۔'' لہٰذا بدیع کو لے کر دوبارہ امی کے گھر پر گئی۔ امی کے ساتھ بات کر کے بدیع الزمان لوگوں کی رہائش کا بندوبست کر دیا۔

رات کو وہاں پر گولیاں چلنی شروع ہوئیں تو بانکا اور ان کی بیگم کے بڑے بھائی قیوم دیکھنے کے لئے چھت پر گئے۔ وہاں پر شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ ٹریسر کی روشنی اور گولوں کے بکھرتے ہوئے ٹکڑوں کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک چھت پر نہیں رک سکے۔ گولیوں اور دھماکوں کی گونج سے ان کا مکان بھی کانپ رہا تھا۔ بانکا کے گھر کے تمام افراد سیڑھیوں کے نیچے دبک کر بیٹھے رہے۔

سویرے چار بجے کے قریب ای پی آر کے چند جوان بھاگ کر ان کے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے گیراج کے پیچھے زمین کے نیچے ایک کمرہ بنا ہوا ہے۔ اس کمرے کے اندر ان لوگوں کو پناہ دی گئی مگر ای پی آر ہیڈ کوارٹر سے اتنا قریب چھپے رہنے پر بھی شائد انہیں اطمینان نہیں ہو رہا تھا چنانچہ صبح کی روشنی پوری طرح نکلنے سے پہلے ہی وہ لوگ چھپتے چھپاتے دوسری جگہ پر چلے گئے۔

بانکا کے گھر کی چھت سے جھنڈا اتارنے کا خیال کسی کو نہیں آیا تھا۔ ۲۶ تاریخ کی صبح کو مشین گن فٹ کئے ہوئے ٹرکوں پر فوجی دھان منڈی کی سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ بانکا لوگوں کی چھت پر جھنڈا لہراتا دیکھ کر فوجی ان کے مکان پر گولیاں برسانے لگے۔ پہلے بانکا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں ان کے مکان کو گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں جب جھنڈے کے بارے میں یاد آیا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر سینے کے بل چل کر بڑی مشکل سے وہ جھنڈا اتار کر لے آئے۔

سب سے افسوس ناک خبر یہ ہے کہ ڈاکٹر خالق کے ہم زلف کمانڈر معظم کو پاک آرمی نے ہلاک کر دیا ہے۔ سائنس لیبارٹری روڈ پر "کارموفوم" کے بڑے سے سائن بورڈ لگے ہوئے تین منزلہ مکان کی دوسری منزل پر وہ رہا کرتے تھے۔ عام طور پر رات کے وقت وہ گھر پر نہیں رہتے تھے کیونکہ اگرتلہ معاملے کے جانے پہچانے ملزم اور بنگلہ دیش کی آزادی کے طلبگار سیاست دان ہونے کی وجہ سے پہلے سے ہی فوج نے ان پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ معظم کی تقدیر خراب تھی کہ اس رات کو وہ گھر پر ہی تھے یا شائد ان کی موت نے ہی انہیں گھر پر رکھا ہوا تھا۔

معظم کی موت کی خبر سن کر بہت رنج ہوا۔ صرف تین روز پہلے ۲۳ مارچ کو ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ اتنے ہنس مکھ، پر رونق اور پر امید شخص تھے، اور ان کا حشر یہ ہوا!

شیخ مجیب کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی کچھ بھی نہیں بتا پا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ انہیں مار دیا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں! انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ عوامی لیگ کے رہنماؤں میں سے کون کون سے لوگ ہلاک ہو گئے ہیں اور کون سے لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں اس بارے میں بھی کسی کے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے۔ فون خراب پڑا ہوا ہے ورنہ ایسے لوگوں کو فون کیا جا سکتا تھا جن کو اس بارے میں شائد کوئی علم ہو۔

سر بھاری ہو رہا تھا چنانچہ اوپر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد رومی آ کر پاس بیٹھا۔ میرے جسم پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر اس نے کہا، "امی اب بھی ہمیں پوری صورتحال کا اندازہ تو نہیں ہو سکا ہے۔"

میں نے اس کی طرف کروٹ لے کر کہا، "اس کا کیا مطلب ہے؟"

چند جگہوں پر ہی ہم جا سکے ہیں۔ جن سے ہم نے کچھ سنا ہے انہوں نے بھی اپنی آنکھوں سے سارا

کچھ نہیں دیکھا ہے۔ کچھ دیکھی ہوئی اور کچھ سنی ہوئی باتوں سے ہمیں جتنا معلوم ہو سکا ہے مجھے خدشہ ہے کہ اصل صورتحال اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ مکمل صورتحال کا اندازہ لگانے کے لئے لگتا ہے کہ ابھی کئی دن لگ جائیں گے۔"

میں چیخ کر رو پڑی۔ "اس سے زیادہ نہیں جاننا چاہتی۔ جتنا جان چکی ہوں اسی سے کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ یا اللہ یہ ہم پر کیا غضب ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ لوگ کیا انسان ہیں یا حیوان؟"

"وہ لوگ حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کے صلے میں انہیں دوزخ میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔"

۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء بروز اتوار

گزشتہ رات کو بھی سو نہیں سکی۔ شام سے شروع ہو کر سحر تک گولیاں چلتی رہی ہیں۔

کل شام کے وقت بجلی آ گئی مگر فون اب تک خراب پڑا ہے۔ بجلی کی بجائے اگر فون ٹھیک ہو جاتا تو زیادہ تسکین ملتی۔ میں نے شریف سے کہا، ''آج جس طرح سے بھی ہو فون ضرور ٹھیک کروانا پڑے گا۔ اپنے دوست لقمان سے ذرا بات تو کر کے دیکھو.....''

شریف نے تنگ آ کر کہا، ''پاگل ہوئی ہو؟ فوج نے جہاں پورے شہر کی ٹیلی فون لائنیں کاٹ دی ہیں، وہاں تمہارے اکیلے کا فون کیا جادو کے زور پر ٹھیک ہو گا؟''

صبح کے آٹھ بجے کرفیو میں وقفہ شروع ہوتے ہی قاسم اور بارق کو بھیج دیا..... جس طرح بھی ہو.... جتنے پیسوں پر بھی آمادہ کرنا پڑے کسی جمعدار کو پکڑ کر لے آؤ۔

جامی نے ضد شروع کر دی ہے کہ کل چونکہ وہ گھر سے نہیں نکلا ہے چنانچہ آج اسے ضرور باہر جانا ہے۔

میں نے کہا، ''ٹھیک ہے چلے جاؤ، مگر اکیلے نہیں! رومی کے ساتھ جاؤ۔''

رومی نے اعتراض کیا، ''مجھے دوسری طرح کے کام ہیں۔''

میں ناراض ہو کر رومی سے کچھ کہنے جا رہی تھی کہ اس سے پہلے ہی دروازے پر گھنٹی بج اٹھی۔ جامی کے دروازہ کھولنے پر جو اندر داخل ہوئی وہ دیوانی سی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے مسٹر چائلڈر دروازے سے باہر برآمدے پر ہی کھڑے رہے۔

کٹی!

اس کی طرف بڑھتے ہی وہ دوڑ کر میرے قریب آ کر سینے سے لپٹ گئی۔ تقریباً دو منٹ تک اسی طرح لپٹی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بھیگی ہوئی پلکیں اٹھا کر اس نے کہا، ''تم لوگوں کو دیکھنے کے لئے آئی ہوں۔''

تین منٹ کے اندر شریف، رومی، جامی سب کی خیریت معلوم کر کے مسٹر چائلڈر کے ساتھ واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد گلشن سے منی بھائی آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا شیخ مجیب زندہ ہیں۔ انہیں گرفتار کر کے ''نامعلوم مقام'' پر لے جایا گیا ہے۔ عوامی لیگ کے رہنما اور طلباء رہنماؤں میں سے اکثر لوگ جان بچا کر

فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

شریف نے کہا، ''چلئے تھوڑی دیر کے لئے ڈھاکہ کلب سے ہو کر آتے ہیں۔''

رومی نے کہا، ''آج بارہ بجے سے دوبارہ کرفیو شروع ہو جائے گا، یہ بات مت بھول جانا۔''

''بارہ بجے کیوں؟ کل تو سہ پہر کے تین بجے تک وقفہ تھا۔''

''شائد کل اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کو آمد و رفت کرتے دیکھ کر فوج نے وقت گھٹا دیا ہے۔''

جامی نے کہا، ''ابو میں آپ لوگوں کے ساتھ ڈھاکہ کلب چلوں؟''

منی کے بھائی کی گاڑی پر شریف اور جامی، ان کے ساتھ ڈھاکہ کلب چلے گئے۔ میں نے رومی سے کہا، ''مجھے صرف پانچ منٹ کے لئے ایک مرتبہ ہسپتال سے گھما لاؤ، پھر تم اپنے کام پر نکل جانا۔ ایمن اور شیلی کے لئے تھوڑا سا کھانا لے کر جانا چاہتی ہوں۔''

رومی نے منہ پھلا کر کپے جیسا بنا لیا لیکن مجھے لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو لیا۔

میں نے کہا، ''شہید مینار والی سڑک پر سے چلو واپسی پر بنگلہ اکیڈمی کے سامنے سے ہوتے ہوئے آنا۔ سنا ہے کہ اکیڈمی کی دیواریں گولوں کی ضربوں سے گر گئی ہیں اور ریس کورس کا کالی مندر بھی تباہ کر دیا گیا ہے۔''

شہید مینار کے قریب آ کر رومی نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ دائیں طرف نظر گھما کر دیکھا کہ کل کا اوپر کا جو حصہ ٹوٹ کر بھی اپنی جگہ پر اٹکا ہوا تھا، آج وہ بھی بے نشان ہو چکا ہے۔ پچھلی رات کی کارروائی نے باقی کسر پوری کر دی ہے۔ صرف بنیادوں کا نشان باقی رہا ہے۔ بنیاد کو وہ لوگ جڑ سے اکھاڑ نہیں سکے ہیں۔ میں نے آواز ذرا چڑھا کر کہا، ''شہید مینار! تمہاری اس بے حرمتی کا بدلہ ہم ضرور لیں گے۔''

رومی جبڑا اکڑا کر ہونٹ پر ہونٹ دبا کر شہید مینار کے سامنے سے گزر کر ہسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

ایلیفنٹ روڈ کے اوپر ہی گلی کے سرے پر مجھے اتار کر رومی چلا گیا۔ گیٹ کے قریب حسین صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کے چہرے پر فکر جھلک رہی ہے۔ انہوں نے کہا، ''سنا ہے کہ محلے کے کس گھر میں کتنے نوجوان لڑکے موجود ہیں اس کی فہرست تیار ہو گی۔''

یہ بات سن کر میں چونک اٹھی۔ یاد آیا کہ مین روڈ سے جنوب کی طرف ایک گلی کے اندر کچھ غیر بنگالی لڑکے رہتے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ان کے ساتھ رومی کا ایک مرتبہ جھگڑا ہوا تھا۔ ان کے توسط سے رومی اور جامی کا نام لازماً فہرست کے شروع میں ہی درج ہو جائے گا۔

گھر پر آ کر ریڈیو آن کر کے لاچار ہو کر بیٹھی رہی۔ شریف یا رومی کے لوٹنے سے پہلے کچھ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اچانک کھڑکی سے کوئی شے اندر فرش پر آ کر گری۔ چونک کر اس طرف نظر ڈال کر دیکھا تو اخبار پڑا ہوا نظر آیا۔ بھاگ کر کھڑکی کے قریب جا کر آواز لگائی ''بدرالدین! بدرالدین! تم خیریت سے تو ہو؟''

۱۹۵۶ء سے جب ہم عظیم پور کے مکان میں رہتے تھے بدرالدین اس وقت سے ہمیں اخبار دے کر جاتا ہے۔ زرد چہرے پر افسردہ ہنسی سجا کر بدرالدین نے کہا، ''بس جی، اللہ کی مہربانی اور آپ لوگوں کی دعا ہے۔''

''اور کوئی اخبار نہیں نکلا ہے؟''

''نہیں۔ یہی ایک.....''

''جس روز جتنے اخبار نکلیں ہمیں سارے دے جانا۔''

''بہتر ہے۔'' بدرالدین چلا گیا۔ اخبار کھول کر دیکھنے کی جلدی میں بدرالدین سے پوچھنا بھول گئی کہ گزشتہ چند دن اس کے کیسے گزرے ہیں۔

۲۵ تاریخ کی سیاہ رات کے بعد آج پہلی مرتبہ کوئی اخبار شائع ہوا ہے... پاکستان.....وہ بھی صرف دو صفحے۔ آٹھ کالمی دو انچ چوڑی سرخی: ''یحییٰ براڈ کاسٹس۔'' ۲۶ تاریخ کی شام کو یحییٰ نے ریڈیو پر جو تقریر کی تھی اس کی پوری عبارت شائع کی گئی ہے۔ خطاب کے نیچے باقی دو صفحوں پر مشتمل مارشل لاء کے ضوابط ترتیب وار چھاپے گئے ہیں۔ ایک کنارے پر چھوٹی سی سرخی لگی ہے: مجیب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

صبح ریڈیو پر اعلان کیا گیا تھا کہ آٹھ بجے سے بارہ بجے تک کے دوران کرفیو میں وقفہ رہے گا۔ ابھی پونے بارہ بجے وقفے کا وقت پانچ بجے تک کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سے ہمیں سہولت ہو گئی ہے.....رومی اور جامی کو آج ہی منی بھائی لوگوں کی طرف چھوڑ کر آنے کا وقت مل جائے گا۔ منی بھائی کہہ رہے تھے کہ گلشن کا علاقہ قدرے محفوظ ہے۔

جامی ڈھاکہ کلب جا کر بہت پریشان ہوا ہے۔ ڈھاکہ کلب پر فوجیوں نے حملہ کیا تھا۔ چند بیروں کی لاشیں صبح تک اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ جامی نے شائد زندگی میں پہلی مرتبہ مردہ انسانوں کی پھولی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ اچھا ہی ہوا ہے.....! گلشن میں ٹٹو کے ساتھ رہنے سے طبیعت سنبھل جائے گی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد گاڑی پر رومی اور جامی کو لے کر شریف اور میں گلشن گئے۔ آج سڑکیں کل کی نسبت سنسان ہیں۔ صبح سے لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ بارہ بجے کرفیو لاگو ہو جائے گا۔ اسی لحاظ سے سب نے باہر کا کام نپٹا کر گھروں کے اندر پناہ لے لی ہے۔ آخری وقت پر وقفے کی معیاد میں اضافہ کرنے کے باوجود سنسان سڑکوں پر دوبارہ سے اتنی چہل پہل شروع نہیں ہوئی ہے۔

رومی اور جامی کو گلشن میں چھوڑ کو واپسی پر اکرم بھائی اور شیلی آپا سے ملنے کے لئے عظیم پور میں ان کے گھر پر گئے۔

۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء بروز پیر

ریڈیو پر آج صبح ہی اعلان کر دیا گیا ہے کہ آٹھ بجے سے پانچ بجے کے درمیان کرفیو میں وقفہ رہے گا۔
صبح گلشن گئے رومی اور جامی کو گھر پر لانے کے لئے۔ آج رومی کی سالگرہ ہے۔ دوپہر کو کم از کم کوئی اچھا کھانا پکا کر ان کو کھلا دوں گی۔ منی بھائی کے گھر پر پہنچ کر دیکھا کہ وہاں پر کٹی آئی ہوئی ہے۔ گلشن کے زیادہ تر گھروں میں کوئی نہ کوئی غیر ملکی رہتا ہے لہٰذا وہاں پر چلنے پھرنے کی ذرا آسانی ہے۔ فوج کی دہشت بھی کم ہے۔
واپسی پر سوچ رہی تھی کہ کچے بازار تو سب جلا کر راکھ کر دیئے ہیں.... آج بھی کیا دال اور آلوؤں سے گزارا کرنا پڑے گا؟ راستے میں ائیر پورٹ روڈ پر قطار در قطار دکانوں کے بیچ میں گوشت کی ایک چھوٹی سی دکان کھلی دیکھی جس میں بکرے کی ایک اکلوتی ران لٹک رہی تھی۔ فوری طور پر گاڑی رکوا کر اس ران کو خرید لیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا، ''رومی تمہاری قسمت بہت اچھی ہے کہ گوشت مل گیا۔''
گھر پہنچ کر دیکھا کہ چنکو اور قیصر آ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، ''اچھا ہی ہوا کہ تم لوگ آ گئے ہو۔ آج رومی کی سالگرہ ہے۔ تم لوگ اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔''
اس کے بعد تین تین چولہے جلا کر قاسم اور بارق کو کام سے لگا کر اور خود بھی تیز تیز ہاتھ چلا کر پلاؤ، قورمہ اور چنے کا حلوا تیار کر لیا۔ گلشن سے واپس آتے وقت دیبا نے اپنے باغ سے چند ٹماٹر اتار کر دیئے تھے۔ ان کا سلاد تیار کیا۔
کھانے کے بعد ڈکار لیتے ہوئے جامی نے کہا، ''بھیا کے جنم دن پر بہت لذیذ کھانا پکا ہے۔ ایسی آفت کے دنوں میں اس سے بہتر اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے؟''
کھانے پینے سے فارغ ہو کر رومی اور جامی کو دوبارہ گلشن میں چھوڑ آئے ہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء بروز منگل

صوفیہ کمال آپا، نیلمہ ابراہیم آپا زندہ ہیں۔ کلکتہ ریڈیو سے ان کی موت کے بارے میں غلط خبر نشر کی گئی تھی۔ ان کے زندہ ہونے کی خبر سن کر دلوں کو بہت سکون ملا۔

شعبہ انگریزی کے جوتر مئی گہہ ٹھاکر اور ان کی بیگم بسنتی کی خیریت معلوم کرنے کے لئے چونتیس نمبر بلڈنگ پر گئی۔ پانچ دن گزر جانے کے بعد بھی سامنے کے چھوٹے سے برآمدے پر خون کا خشک دھبہ جما ہوا ہے۔ حسین جہان لوگوں کے فلیٹ کے دروازے پر اب تک تالا لٹک رہا ہے۔ بسنتی لوگوں کے دروازے پر دستک دینے کے بعد ایک بوڑھے سے آدمی نے دروازہ کھول کر بتایا کہ گھر پر کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ کہاں پر گئے ہیں اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ اکیلے میڈیکل کالج ہسپتال جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے ہیں لوگوں کی زبانی پاکستانی افواج کی کارروائیوں کی نئی نئی خبریں کانوں میں آ کر روح کو زخمی کرتی جا رہی ہیں۔ شب و روز ڈراؤنے خواب کی طرح گزرتے جا رہے ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں بھی تو پھیل رہی ہیں۔ ایک ایک افواہ سنتی ہوں اور خوف کے مارے لرزنے لگتی ہوں.... جیسے آج گیارہ بجے کے قریب منی بھائی رومی اور جامی کو ساتھ لے کر آئے۔ رومی اور جامی گلشن میں رہنا نہیں چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اب مزید دوڑنے کی کوئی وجہ نہیں رہی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سب لوگ گفتگو کر رہے تھے۔ بارق کو چوک کی دکان پر چائے کی پتی خرید لانے کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لوٹا تو خوف سے اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، ''اماں، چوک پر ایک بہاری آدمی پوچھ رہا تھا کہ رومی بھائی گھر پر ہیں یا نہیں۔''

بس فوراً افراتفری پڑ گئی۔ رومی اور جامی کو وقت ضائع کئے بغیر گاڑی پر بٹھا کر دوبارہ گلشن بھیج دیا۔

ڈھائی بجے کے قریب ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھا کر اوجت نیوگی صاحب آ کر حاضر ہوئے۔ ہم لوگ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کے منہ پر چار پانچ روز کی بڑھی ہوئی داڑھی ہے، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ جسم پر میلا کچیلا مسخ لباس ہے، گال اندر کو دب گئے ہیں اور سر کے بال الجھے ہوئے ہیں۔ حیرانی کی کیفیت کٹ جانے پر میں اچانک پاگلوں کی طرح سے ہنسنے لگ پڑی.... ''اور سنایئے نیوگی دادا! خون خرابے کا امکان ٹل گیا ہے؟''

شریف نے آہستہ سے ڈانٹ کر کہا۔ ''پاگل ہو گئی ہو کیا؟ انہیں دو منٹ چین سے بیٹھنے کا موقع تو

دو....تشریف رکھئے مسٹر نیوگی۔'' شریف نے ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

''اتنے دن کہاں پر رہے ہیں؟''

سدھسواری میں ایک صاحب کے بیل خانے کے برابر میں ایک تاریک سی ٹن کی کوٹھڑی میں انہوں نے گزشتہ چار پانچ روز گزارے۔ مچھر دانی نہیں تھی، مچھروں کے مارے بالکل بھی نہیں سو سکے۔ کھانا پینا نہ ہونے کے برابر میسر آیا۔ چائے تو بالکل بھی نہیں ملی حالانکہ وہ دن میں پندرہ بیس کپ چائے پینے کے عادی ہیں۔

پہلے انہیں دوسری منزل پر رومی لوگوں کے کمرے میں لے کر گئے۔ زیادہ دیر تک نیچے بٹھا کر رکھنا محفوظ نہیں ہے.... اگر اچانک کوئی آ جائے! ان سے نہا کر کپڑے تبدیل کر لینے کے لئے کہہ کر کھانے کا انتظام کرنے کے لئے نیچے اتر آئی۔ کھانے کے بعد ایک پیالی چائے کی ان کے ہاتھ میں تھما کر شریف نے اور میں نے ان کے سامنے ہی گفتگو کی کہ اس محلے کے جو حالات ہو رہے ہیں ان کی روشنی میں، انہیں گھر پر رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اگر کوئی انہیں پہچان لے تو مصیبت برپا ہو جائے گی۔ دھان منڈی چھ نمبر روڈ پر امی اور لالو رہتے ہیں۔ ان کے گھر کی تیسری منزل میں وہ سب سے زیادہ محفوظ رہیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکے گی کیونکہ امی کے گھر پر کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔ بدیع الزمان لوگ اسی مکان کی نچلی منزل میں رہ رہے ہیں مگر وہ لوگ اندر سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے اس قدر خاموشی کے ساتھ رہتے ہیں کہ باہر سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اندر اتنے سارے لوگ رہ رہے ہیں.... بدیع کا کنبہ، اس کے سسر کا کنبہ، کے جی مصطفیٰ کا کنبہ۔

ساڑھے تین بجے اوجت نیوگی کو ساتھ لے کر امی کے گھر پر گئے۔ گاڑی مکان کے سامنے سے لے کر نہیں گئے.... بدیع لوگوں میں سے کوئی اگر دروازہ کھول کر اچانک باہر آ جائے! پہلے میں نے گھر کے سامنے جا کر اطمینان کر لیا کہ نچلی منزل کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد امی کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ لالو نے آ کر دروازہ کھولا تو میرا اشارہ ملنے پر شریف نیوگی دادا کو ساتھ لے کر سیدھا مکان کے اندر داخل ہوئے۔ امی اور لالو نے نیوگی دادا کو بخوشی اپنے گھر پر رکھ لیا۔

وہاں سے فارغ ہو کر بھوتر گلی میں گئی.... بھتیجا کلیم اور چچازاد دیور نجلو اور ہدا لوگوں کے گھر پر، ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے۔

آج صبح ایک صفحے کا مارننگ نیوز نکلا ہے۔ پیچھے کا ورق سفید ہی رہ گیا ہے۔ چند غیر ملکی خبروں کے علاوہ مشرقی بنگال کی صرف دو خبریں چھپی ہیں: ''مجیب ۶۶ء سے ہی ملک کو تقسیم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا'' اور دوسرا بھٹو کا بیان: ''پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔''

۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء بروز بدھ

صبح شریف خود نکلے امی لوگوں کے لئے خریداری کرنے۔ اوجت نیوگی صاحب ان کے گھر پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ذرا زیادہ مقدار میں سودا خرید کر دے آئیں گے۔

شریف کے نکل جانے کے بعد تھوڑی دیر میں امی خود ہی رکشے پر بیٹھ کر آ گئیں۔ خیریت تو ہے؟

امی نے کہا کہ اگر میں اوجت نیوگی صاحب کے لئے دو وقت کا کھانا پکا کر بھیج دیا کروں تو بہتر رہے گا، کیونکہ امی لوگوں کے گھر پر کوئی نوکر نہیں اور ان کی طبیعت بھی اتنی اچھی نہیں رہتی ہے۔ بعض مرتبہ تو وہ لوگ ایک سالن سے ہی گزارا کر لیتے ہیں لیکن نیوگی صاحب کے لئے تو ذرا بہتر انتظام کرنا پڑا کرے گا۔

ایک اور کام بڑھ گیا..... اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روزانہ دو مرتبہ ناشتے دان میں کھانا لے کر جاتے وقت اس گھر کے آس پاس کوئی دیکھ نہ لے۔ ہمارے گھر پر بھی بارق اور قاسم کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ کھانا کہاں پر جا رہا ہے۔ خیر ان سے تو کہہ دوں گی کہ ہسپتال میں کسی بیمار رشتہ دار کے پاس کھانا بھیجا جا رہا ہے۔

۳۱ تاریخ کو دو اور اخبار نکلے ہیں.... روزنامہ پاکستان اور پروادیس... دونوں اخباروں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں۔ پروادیس کے ایک مضمون کے اندر کے ایک جملے نے سینے پر ضرب لگائی:

''امن پسند نہتے شہریوں کو جن تشدد پسند مسلح افراد نے پریشان کر رکھا تھا ان کے خلاف اقدامات کامیابی کے ساتھ مکمل کر لئے گئے ہیں۔''

مارننگ نیوز میں سرخی لگی ہے:

ملک کی بقا کے لئے کئے گئے یحییٰ کے اقدامات کی تعریف کی گئی ہے۔ اور:

ملک کی فلاح کے لئے درست اقدام اٹھانے پر یحییٰ کو مبارک باد۔

رنج اور لاچاری کے احساس میں دونوں اخبار پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

یکم اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

حکومت اب ہر چیز کو "نارمل" دکھانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی ہے۔ ۲۷ تاریخ کی صبح سے ریڈیو پر ہدایات دی جارہی ہیں کہ تمام شہری اپنے اپنے دفتروں میں کام پر لوٹ جائیں۔ روزانہ پانچ بجے سے کرفیو لاگو کردیا جاتا ہے۔ ۲۷ تاریخ سے ٹی وی نشریات کو دوبارہ جاری کردیا گیا ہے مگر پروگرام دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے جن بھوتوں کا ناٹک چل رہا ہو۔ تمام اناؤنسر اور خبریں پڑھنے والے گویا کاٹھ کے پتلے ہوں۔

ٹیلی فون ٹھیک ہو چکا ہے۔ وہ بھی شائد کاروبار زندگی کو "نارمل" دکھانے کے لئے ہی ٹھیک کردیا گیا ہوگا۔ مگر فون کا ڈائل گھمانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ آج کل بلکہ جس وقت بھی موقع ملے ریڈیو کی سوئی گھماتی رہتی ہوں۔

پرسوں ہمسایوں نے بتایا کہ ان کے کسی جاننے والے نے آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات سنی ہیں تاہم اس نے خود ابھی تک نہیں سنیں۔ ابھی تک کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملا ہے جس نے اپنے کانوں سے نشریات سنی ہوں۔ دوسروں کی زبانی نشریات کے بارے میں بہت سے لوگوں نے سنا ہے۔

رومی اور جامی کو گزشتہ کل گلشن سے لے آئی ہوں۔ وہاں پر ان کا دل نہیں لگتا ہے۔ اس کے علاوہ صورتحال دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ اب چونکہ حکومت کاروبار زندگی کو نارمل دکھانا چاہتی ہے سو وہ کم از کم گھروں میں گھس کر نوجوان لڑکوں کو کھینچ کر باہر نہیں نکالیں گے البتہ سڑکوں پر نکلنے والے لڑکوں پر ڈھائے جانے والے جن خوفناک واقعات کا تذکرہ سن رہی ہوں ان سے بھی کلیجہ یخ اور ہاتھ پیر سن ہو جاتے ہیں۔ لولو رنجو اور کچھ دوسرے لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ انہوں نے ترپال سے ڈھکے ہوئے بڑے ٹرکوں پر بہت سے نوجوانوں کو بیٹھے دیکھا ہے جن کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ان نوجوانوں کو فوجی کہاں پر لے کر جاتے ہیں، اس بات کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ اس واقعے پر شہر میں کچھ دن تک بہت شور مچا۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے اس کی زبان پر وہی ایک تذکرہ۔

خوف کے مارے رومی اور جامی کو اکیلے باہر نکلنے نہیں دے رہی ہوں۔ ڈرائیور موجود نہ ہو تو رومی جامی کو پیچھے بٹھا کر خود ہی گاڑی چلاتی ہوں۔ خواتین کو گاڑی چلاتے دیکھ کر فوجی کچھ نہیں کہتے۔ انہیں سارا غصہ بس ابھرتی عمر کے نوجوانوں پر ہے۔ سڑک کے ایک کنارے پر سر نیچا کر کے چلنے والا بھی اگر کمسن ہو تو خیر نہیں۔ گشت کرنے والے فوجی اچھل کر اس کی گردن دبوچ لیں گے پھر اسے یا تو ٹرک پر لاد لیں گے یا کم از کم رائفل کے بٹ

سے دوضربیں لگا کر چھوڑ دیں گے۔

سڑک پر چلتی ہوئی بہت سی گاڑیوں پر غور کر رہی ہوں کہ اردو میں نمبر پلیٹ لکھی ہوئی ہے۔ ایلیفنٹ روڈ کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں سے بہت سی دکانوں کا سائن بورڈ بھی تبدیل کر کے اردو حروف میں سائن بورڈ لکھ کر لگایا گیا ہے۔ میں نے ایک دکان والے سے دریافت کیا، ''سائن بورڈ کیوں تبدیل کیا ہے؟'' دکان دار نے جواب دیا، ''مکانوں پر، دکانوں پر اور گاڑیوں پر آئندہ سے اردو کا کتبہ، سائن بورڈ اور نمبر پلیٹ استعمال کرنا ہو گا.....اوپر سے آرڈر آیا ہے۔

اس کے بعد سے جس سے بھی معلوم کرتی ہوں وہی کہتا ہے کہ ''ہاں، ہاں! ہم نے بھی یہی سنا ہے۔ ایلیفنٹ روڈ پر سائن بورڈ لکھنے والی دو دکانوں پر گاڑیوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ دکان کے اندر سائن بورڈ لکھنے کے لئے ٹن کی چادریں رکھنے کی جگہ نہیں رہی ہے.....دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

میرا دل باغی ہو گیا۔ بالآخر گھر کے سامنے، گاڑی پر نام اور نمبر اردو میں لکھوانا پڑے گا؟ اس بنگلہ دیش کے اندر؟ ہم لوگوں کو بھی؟

میں نے شریف سے کہا، ''یہ جو ''اوپر سے آرڈر'' آیا ہے اس کا سراڈھونڈ کر نہیں نکالا جا سکتا؟ دو ایک لوگوں کو فون کر کے ذرا معلوم تو کرو۔ تمہارے دوست آغا یوسف صاحب کی تو فوج میں بہت سے لوگوں سے واقفیت ہے۔ ان سے کہو کہ کسی سے اصل قصہ معلوم کریں۔''

شریف نے کہا، ''دیکھتا ہوں۔ کلب میں ملاقات ہوئی تو دریافت کروں گا۔ ان چیزوں کے بارے میں فون پر گفتگو کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

میں نے ضد میں آ کر کہا، ''لیکن میں ابھی کتبہ اور نمبر پلیٹ نہیں بدلوں گی۔ اخبار میں اگر مارشل لاء کے ضابطے کے طور پر شائع ہوا تب جا کر سوچوں گی، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

۳ اپریل ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

مارننگ نیوز کی ایک سرخی کی طرف حیرت زدہ نظروں سے گھورتی رہی: زنجیرہ میں تشدد پسندوں کے خلاف اقدام اٹھائے گئے ہیں۔

کل سے لوگوں کی زبانی جس خدشے کے بارے میں سن رہی تھی وہ درست ثابت ہوا۔ کچھ دنوں سے لوگ ڈھاکہ سے فرار ہو کر زنجیرہ میں پناہ لے رہے تھے۔ کل صبح کے وقت پاک فوج نے وہاں پر بھاری کمان کے گولوں سے حملہ کیا۔ کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں۔

یہ خبر ہم نے کل سب سے پہلے رفیق کی زبانی سنی تھی۔ دھان منڈی تین نمبر روڈ پر وحید کے مکان سے رفیق اکثر پیدل ہی ہماری طرف گھومنے کے لئے آجاتا ہے۔ سودا خریدنے کے لئے نیو مارکیٹ کی طرف آنا پڑے تب بھی کبھی کبھی ہمارے ہاں سے خیریت معلوم کر جاتا ہے.... شریف اور وہ بیٹھک میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو نئی نئی خبریں سناتے رہتے ہیں۔

رفیق کی زبان سے زنجیرہ کے بارے میں سننے کے بعد جسے بھی فون کیا یا جن لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے مگر کوئی بھی اس خبر کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر پایا۔ آج کے مارننگ نیوز میں انتہائی مکاری کے ساتھ اسی خبر کی تائید کی گئی ہے۔ خبر یوں بیان کی گئی ہے: ملک کے اندر کچھ تشدد پسند عناصر نے پرامن بے قصور شہریوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ بوڑھی گنگا سے جنوب کی طرف زنجیرہ میں ایسے بہت سے افراد اکٹھے ہو رہے تھے۔ حکومت نے ان سماج دشمنوں کے خلاف بھرپور اقدام اٹھایا ہے۔ علاقے کو تشدد پسندوں سے آزاد کرا دیا گیا ہے۔

دوپہر کے بعد انجو آیا، اڑا ہوا چہرہ لے کر۔ انجو خوش مزاج نوجوان ہے اور عام طور پر اس کے چہرے پر ہنسی کھلی رہتی ہے۔ آج وہ بھی خاموش اور سنجیدہ نظر آرہا ہے۔ صوفے پر بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”اف پھپھو! زنجیرہ میں اتنی ہولناک کاروائی کی گئی ہے۔ معصوم بچوں اور بوڑھوں تک کو جلا دوں نے نہیں بخشا ہے۔ اتنے بے رحم کیسے ہو جاتے ہیں وہ!“

میں نے کہا، ”گزشتہ کئی روز سے انہوں نے ڈھاکہ میں جس طرح کے مظالم برپا کر رکھے ہیں اس سے تمہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر پتھر دل لوگ ہیں؟“

”پھپھو، میرے ایک ”کولیگ“ نے اپنے کنبے سمیت زنجیرہ میں جا کر پناہ لی تھی۔ آج تنہا لوٹا ہے

دیوانگی کی حالت میں۔اس کی بوڑھی ماں، بیوی، تین بچے، ایک چھوٹا بھائی سب کے سب مارے گئے ہیں۔صبح کا ناشتہ خریدنے کے لئے وہ تھوڑی دور گیا ہوا تھا اس لئے بچ گیا مگر اب وہ سر پیٹ کر رو رہا ہے۔زمین پر لوٹتا ہے اور کہتا ہے ''میں کیوں نہیں مرا''!اف پھپھو!اس کا دکھ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

''حالانکہ اخبار میں لکھا ہے کہ تشدد پسندوں کے خلاف اقدام اٹھایا گیا ہے۔''

شریف باہر گئے ہوئے تھے۔گھر پر لوٹ کر انہوں نے ایک اور دھماکہ کیا:'' کچھ سنا ہے!حمید اللہ بیوی بچوں کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا تھا۔زنجیرہ کے قریب پاک آرمی کا ایک گولا جا کر ان کی کشتی پر گرا۔اس کا لڑکا مارا گیا ہے،بیگم شدید زخمی ہے۔''

حمید اللہ کی بیوی صادقہ کو ان کی شادی سے پہلے سے جانتی ہوں۔بہت اچھی لڑکی ہے۔حمید اللہ ''ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن'' کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔وہ خود بھی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ان کا ایک ہی بچہ تھا۔وہ بھی اتنے افسوس ناک طریقے سے ہلاک ہو گیا۔میرا دل بہت اداس ہو گیا۔اخبار اٹھا کر میں نے کہا،''اور فوجی حکومت انہیں تشدد پسند کہتی ہے''!

سہ پہر کے وقت دیبا اور منی بھائی گھومنے کے لئے آئے۔ان کے چہروں پر بھی اداسی چھائی ہوئی تھی۔منی بھائی کے ایک دوست خوندکر ستار بھی کشتی پر اپنے کنبے کو لے کر گاؤں جا رہے تھے۔ان کی کشتی پر بھی کمان کا ایک گولا گرا۔کشتی پر سوار ستار کے چھوٹے بیٹے کے علاوہ کچھ اور افراد بری طرح سے زخمی ہوئے ہیں۔

۴ اپریل ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج کٹی ڈھاکہ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ صبح آئی تھی الوداع کہنے۔ اپنا ریڈیو ساتھ لائی ہے۔ کھانے کی میز پر رکھ کر کہنے لگی، ''یہ تم لوگوں کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ سب سے پہلے تہران جاؤں گی۔ اس کے بعد کہاں جاؤں گی ابھی طے نہیں ہوا۔ اتنا بھاری ریڈیو لے کر چلنے میں مشکل ہوگی۔''

کٹی راولپنڈی سے ہو کر تہران جائے گی۔ اسے بیلو، دھلو لوگوں کا فون نمبر لکھ کر دیا۔ ''وہ لوگ اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ ان کو بتانا یہاں پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ اور کہنا ہم لوگ خیریت سے ہیں۔''

کٹی نے آہستہ سے کہا، تم لوگوں کی کچھ چیزیں میں اپنے ساتھ لے کر جا سکتی ہوں۔ حفاظت کے لئے؟''

رومی نے اچھل کر کہا ہاں بنگلہ بندھو کا ۷ مارچ کے خطاب کا کیسٹ تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور چے گویرا کی یہ دونوں کتابیں۔''

میں نے شہناز بیگم کا گایا ہوا ''جے بنگلا..... بنگلا جے'' والا کیسٹ دیا۔

رومی نے کہا، ''امید ہے کہ ایک دن تم یہ چیزیں ڈھاکہ میں واپس لے کر آؤ گی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' کٹی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شریف کے ساتھ کٹی کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی شریف بانکا کے ساتھ ساوار گئے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کٹی آج ہی چلی جائے گی۔ مسٹر چائلڈر کے گھر پر فون نہیں ہے۔ کٹی پہلے اطلاع نہیں دے سکی۔

کٹی کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم سب افسردہ بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد میں اچانک سر جھٹک کر اٹھ کر بیٹھی..... سوچا..... ''اس طرح بیٹھے بیٹھے خوامخواہ تکلیف محسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تھوڑی دیر ٹہل کر آتی ہوں۔''

ایلیفنٹ روڈ پر آتے ہی دیکھا کہ رکشے پر امی آ رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر امی رکشے پر سے اتر کر پوچھنے لگیں۔ ''پیدل کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں پر بھی نہیں۔ ویسے ہی ٹہل رہی ہوں۔''

امی رکشے کا کرایہ دے کر میرے ساتھ ٹہلنے لگیں۔ ''چلو کچے بازار سے ہو آتے ہیں۔'' نیو مارکیٹ میں کچے بازار کا جلا ہوا کوڑا ابھی تک پوری طرح صاف نہیں کیا گیا ہے۔ اسی کے بیچ میں کچھ دکان والے ارد گرد تھوڑی بہت صفائی کر کے مال سجا کر بیٹھے ہیں۔ بالکل بھی بھیڑ نہیں ہے۔ میں نیو مارکیٹ کے کچے بازار میں پہلے گھستی نہیں

تھی رش کی وجہ سے۔ اور اب ہوا خوری کرتے ہوئے گھومتے رہے۔ انڈے غیر متوقع طور پر سستے ہیں۔ دو روپے کے چار۔ میں نے اور امی نے مل کر پچاس انڈے خریدے۔ مرغی، سبزیاں سارا کچھ ہی پانی کے دام بک رہا تھا۔ قریب کے گاؤں سے جس کے بس میں جو ہوا لے آیا ہے۔ جلد از جلد بیچ کر لوٹنا چاہتے ہیں۔ ٹوکریاں ہاتھ میں لئے بوجھ اٹھانے والے لڑکے نظر نہیں آئے۔ اٹھا کر گھر تک لے کر جانا مشکل ہوگا اس لئے کوئی اور چیز نہیں خریدی۔

گھر آ کر دیکھا شریف شہار سے لوٹ آئے ہیں۔ مرغی، سبزیاں، مٹھائی، بہت سی چیزیں خرید لائے ہیں۔ شکر ہے کہ میں نے انڈوں کے علاوہ کچھ نہیں خریدا۔ امی کو ایک مرغی، کچھ سبزیاں اور مٹھائی دی۔ رومی سے کہا، ''جاؤ نانی کو پہنچا کے آؤ۔''

گھر کا بورڈ اور گاڑی کی نمبر پلیٹ اردو میں لکھنے کا مسئلہ محض افواہ تھی۔ فوجی حکومت نے اس بارے میں اخباری بیان جاری کیا ہے۔ شریف نے اظہار خیال کیا، محض افواہ نہیں لگتی۔ کچھ غیر بنگالیوں نے سلسلہ شروع کیا ہوگا۔ اس کے بعد ایک کان سے دوسرے کان تک بات پہنچتے پہنچتے بحث مباحثہ، بے زاری کی وجہ بنی تو بالآخر حکام کی ٹلی بجی ہے، لہٰذا انہوں نے بیان جاری کیا ہے کہ یہ افواہ ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا، ''بہر حال چھٹکارا تو حاصل ہوا۔ اردو میں نمبر پلیٹ.... مکان کے سامنے اردو حروف میں لکھا بورڈ.... اف توبہ!.... اللہ نے بچا لیا ہے۔''

۹ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

کرفیو کا وقت آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ پانچ تاریخ کو چھ بجے سے چھ بجے تک تھا۔ چھ تاریخ سے ساڑھے سات سے پانچ بجے تک کا وقت مقرر ہوا تھا۔ کل سے اور بھی گھٹا کر ۹ بجے سے ۵ بجے تک کیا گیا ہے۔

بدیع الزمان لوگ سارے امی کے گھر سے اپنے اپنے گھروں میں لوٹ گئے ہیں۔

رفیق لوگ وحید کے گھر سے ہٹ کر امی کے گھر کی نچلی منزل میں اٹھ آئے۔ تین نمبر روڈ پر وحید لوگوں کے گھر سے قریب آرمی کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی ہے۔ وہاں پر انہوں نے کوئی چیک پوسٹ قائم کی ہے۔ امی کا گھر چھ نمبر روڈ کے اندر کی طرف ہے اس لئے تھوڑا سا الگ تھلگ ہے۔

قسمت اچھی ہے گزشتہ روز ہی اجت نیوگی صاحب وہاں سے چلے گئے۔ ان کے کچھ دوستوں نے پہلے ہماری طرف آ کر پتہ کیا۔ اس کے بعد امی کے گھر سے بہت احتیاط سے گاڑی میں، چادر اوڑھوا کر کسی اور جگہ پر لے گئے ہیں۔ سنا ہے گاؤں والے گھر پر جائیں گے۔ جہاں بھی جائیں خیریت سے رہیں۔

۲۵ مارچ کی سیاہ رات کے بعد کچھ دن تک روی بہت دبکا ہوا تھا۔ بھنچے ہوئے ہونٹ، کھچا ہوا جبڑا، آنکھوں کی دیوانگی میں اندر کی گھٹن قید رہتی تھی۔ اب تھوڑا سا بحال ہوا ہے۔ بات چیت کرتا ہے۔ خیالات کا اظہار کرتا ہے، خفا ہوتا ہے، بحث کرتا ہے۔ دوستوں کے گھر بھاگ کر جاتا ہے۔ خبریں سن کر آتا ہے۔

''آج اس نے کہا،'' جانتی ہو امی سرحد کے علاقہ میں جنگ ہو رہی ہے۔''

سن کر میں چونک گئی۔'' کیسے ہو سکتا ہے؟ تمام جگہوں پر تو پکڑ کر، مار کر، جلا کر ختم کر رہے ہیں۔''

''شائد ایسا ہی کر رہے ہیں۔ پچیس کی رات کے بعد سے جہاں پر بھی احتجاج ہو رہا تھا پاکستانی فوج ان تمام جگہوں پر دوبارہ قبضہ حاصل کر رہی ہے.... یہ بھی درست ہے مگر بنا مقابلے کے وہ قبضہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ شدید جھڑپیں ہو رہی ہیں ان جگہوں پر۔ بہت سی جگہوں پر بنگالی آرمی افسروں نے بغاوت کر دی ہے۔ ان کے ساتھ مل گئے ہیں ای پی آر، پولیس، انصار کے جوان۔ ڈھاکہ سے بہت سے نوجوان چھپ چھپا کر سرحد کے علاقوں کی طرف جا رہے ہیں جنگ کرنے کے لئے۔ پاک آرمی نے جو تھانے، ضلعے، تحصیل جلا دیئے ہیں وہاں کے باشندے بھی بارڈر کی طرف جا رہے ہیں۔ جنگ لڑنے کے لئے۔''

''جا ٹھیک ہی رہے ہیں۔ مگر جنگ کرنے کیلئے یا بھارت جا کر پناہ لینے کے لئے؟''

''پناہ بھی لے رہے ہیں۔لیکن امی جنگ بھی ہو رہی ہے۔''

''تم نے اتنی باتیں کہاں پر اور کس سے سنی ہیں؟''

ہر جگہ پر..... ہر ایک کی زبان سے۔میرے دوستوں کے بہت سے رشتہ دار چھوٹے شہروں سے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ان کی زبانی سنا ہے۔''

یقین نہیں آتا۔اگر میرے کوئی رشتہ دار کسی چھوٹے شہر سے آتے تو ان کی زبانی سن کر یقین کرتی۔

رومی نے کہا،''میرے جاننے والے بہت سے لڑکے گھر پر بتائے بغیر چھپ کر چلے گئے ہیں۔''

میں نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا،کہاں؟ کون گیا ہے۔نام بتاؤ ذرا۔''

''کیوں بابو بھائی اور چنکو گئے ہیں۔''

میں پھر سے چونک گئی۔''وہ لوگ! مگر وہ لوگ تو چٹاگانگ گئے تھے۔''

رومی ہنس دیا۔''اصل میں وہ لڑائی میں شامل ہونے کے لئے گئے ہیں۔''

''کہاں پر جنگ ہو رہی ہے؟''

''یہ تو کسی کو ٹھیک طرح معلوم نہیں ہے۔وہ لوگ پتہ کرتے ہوئے جائیں گے۔''

چند دن پہلے بابو بھائی کہہ کر گئے کہ امی کے ساتھ ملاقات کے لئے چٹاگانگ میں اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔چنکو ان کے ساتھ جا رہا ہے۔چنکو کے پھوپھا چٹاگانگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔وہ پھوپھا کے پاس گھومنے پھرنے کے لئے جا رہا ہے۔

رومی نے بہت آہستہ سے مگر مضبوط آواز میں کہا،''امی میں جنگ میں شامل ہونے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔''

کیا آفت آن پڑی..... ہر طرف جلادوں کی ظالمانہ قتل و غارت..... بندھے ہاتھ، بندھی آنکھوں کے ساتھ بے قصور عوام پر خون کے نشے میں چور ہو کر، حیوانوں کا ٹوٹ پڑنا۔جنگ ہو رہی ہے۔اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تو یہ اتنی غیر متناسب جنگ ہے کہ چند ہی دنوں میں پاکستانی فوج جدید ترین اسلحہ استعمال کر کے باغی بنگالیوں کو کچل کر مٹی میں ملا دے گی۔ہر طرف سے ایسی ہی تو خبریں مل رہی ہیں۔ایسے حالات میں رومی کو جنگ پر جانے کی اجازت دوں کس بھروسے پر؟ ابھی صرف ۲۰ سال عمر ہے اس کی۔حال ہی میں ایف ایس سی پاس کر کے یونیورسٹی میں داخل ہوا ہے۔جنگ کا اسے کیا پتہ ہے؟ وہ کیا جنگ لڑے گا؟

۱۰ اپریل ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

کٹی کا ریڈیو ہاتھ میں آنے کے بعد سے آزاد بنگلہ بے تار لگانے کی کوشش روزانہ کر رہی ہوں۔ کتنے لوگوں سے سن رہی ہوں انہوں نے نشریات سنی ہیں۔ بس ہمیں سٹیشن نہیں مل رہا ہے۔

آزاد بنگلہ بے تار کا حوالہ دے کر آکاش بانی جتنی خبریں نشر کرتا ہے، سب پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا۔ ان کی کچھ خبریں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ نیلمہ آپا اور صوفیہ آپا کی موت کی خبر غلط تھی۔ ڈھاکہ کا زوال، کینٹونمنٹ کی ناکہ بندی، ٹکا خان کی موت.... ساری خبریں بے بنیاد تھیں۔ ٹکا خان زندہ اور تندرست ہے مارشل لاء کا مسلسل پرچار کئے جا رہا ہے۔ ۲۵ مارچ سے قبل جن چیف جسٹس، بی اے صدیقی نے ٹکا خان سے گورنر کے عہدے کا حلف لینے سے انکار کر دیا تھا ان ہی چیف جسٹس نے نہ جانے کس دباؤ کے تحت گزشتہ روز ٹکا خان سے حلف لے لیا۔

آج صبح ناشتہ کرتے ہوئے سب سے کہا، ''آزاد بنگلہ بے تار حقیقتاً موجود بھی ہے یا آکاش بانی کی بناوٹی ایجاد ہے.... اس بات کا پتہ ضرور لگانا پڑے گا۔ صبح کے چھ بجے سے باری باری ہر ایک آدمی دو گھنٹے تک ریڈیو کا ناب گھمائے گا۔ یہ سلسلہ پورا دن جاری رہے گا۔

جامی نے کہا، ''ابھی تو نو بج بھی چکے ہیں۔''

میں نے ڈانٹ کر کہا، مذاق پرے رکھو۔ نو بجے سے گیارہ بجے تک تمہاری ڈیوٹی ہے۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر فون اٹھایا۔ سر عثمان غنی کا فون ہے۔ ڈھاکہ ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پروفیسر تھے۔ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا، ''جہاں آرا، لگتا ہے ریڈیو پاکستان سے عنقریب تمہارے پاس لوگ جائیں گے۔''

میں چونک اٹھی، ''کیوں سر؟''

''مارشل لاء حکام نے ریڈیو کے اعلیٰ سطح کے عہدے داروں کو حکم دیا ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو پرانے صداکاروں کو بلا کر ان سے پروگرام کرواؤ۔ میرے پاس آئے تھے۔''

''آپ نے پروگرام کیا سر؟''

''انکار کرنے کا کیا چارہ ہے گھر پر جو رہتا ہوں۔ اگر تم سے بھی فون پر یا گھر پر رابطہ ہو گیا تو.....؟''

انہوں نے بات ختم نہیں کی۔

سر کا دل ہی دل میں بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ کھانے کی میز پر واپس جا کر سب سے کہا، ''اس کے بعد سے فون بجنے پر تم لوگ ہی اٹھاؤ گے۔ مجھے کوئی پوچھے تو معلوم کرو کہ کون صاحب ہیں، کہاں سے بول رہے ہیں۔ اگر فون ریڈیو سے آئے تو کہنا میں گھر پر نہیں ہوں اور اگر کوئی گھر پر آ کر مجھ سے ملنا چاہے تو فوراً کہہ مت دینا کہ میں گھر پر ہوں۔ پہلے پوچھ لینا کہاں سے آئے ہیں۔''

جامی نے پھر سے کہا، ''امی تم تو ٹکا خان کی طرح یکے بعد دیگرے ہوم ریگولیشنز جاری کرتی جا رہی ہو۔''

۱۳ اپریل ۱۹۷۱ء بروز منگل

چار روز سے بارش ہو رہی ہے۔ ہفتے کی رات کو بارش موسلا دھار برستی رہی۔ اتوار کو تو لگا تار پورا دن۔ کل صبح کے بعد سے اگر چہ بارش رک گئی ہے مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں دھوپ نظر آ جاتی ہے۔ کبھی ایک جھڑپ بارش کی ہو جاتی ہے۔ ابھی شام کے بعد سے بارش رکی ہوئی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں اور بجلی چمک رہی ہے۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر بیٹھی سوچ رہی تھی واقعی میری زندگی میں بھی اب مصائب کے بادل گھنے ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے لمحے میں کریم کمرے میں داخل ہوا۔ صوفے پر بیٹھ کر کہنے لگا، ''پھپھو جان اس محلے کے بہت سے لوگ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ لوگ کہیں نہیں جائیں گے؟''

''کہاں جائیں؟ نابینا بوڑھے سسر کو لے کر کیسے جائیں؟ مگر یہ محلہ چھوڑ کر لوگ جا کیوں رہے ہیں؟ یہاں پر تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔ پیچھے یونیورسٹی اتنی قریب ہے۔ ہال بھی سارے....''

ہال تو سارے خالی.... ویران پڑے ہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو پہلے دو دنوں میں ہی ہو چکا ہے۔ جانتے ہو بابو لوگوں کے گھر پر اس کے ماموں کے گھر والے اُٹھ آئے ہیں شانتی نگر سے؟''

''واقعی؟ ہم تو سوچ رہے تھے شانتی نگر میں میرے بہنوئی کے گھر پر جائیں گے۔''

''دیکھا پھر! اصل خوف تو دل میں ہے۔ شانتی نگر سے لوگ ایلیفنٹ روڈ پر آ کر پناہ لے رہے ہیں۔ اور تم لوگ ایلیفنٹ روڈ سے شانتی نگر جانا چاہ رہے ہو.... سلامتی کے لئے۔''

بات سمجھ کر کریم نے سر ہلایا، ''بہت قیمتی بات کی ہے پھپھو آپ نے۔ اصل میں جو قسمت میں ہے وہ تو ہوگا ہی ورنہ دیکھو نا! ڈھاکہ سے لوگ خوامخواہ زنجیرہ گئے.... گولی کھا کر مرنے کے لئے.... اور بھی ایک بات سُنی ہے پھپھو جان۔ دریا میں سنا ہے بے شمار لاشیں بہہ کر جا رہی ہیں۔ کمر کے پیچھے ہاتھ بندھے ہوئے..... گولیوں سے ہلاک ہونے والوں کی لاشیں۔''

جسم میں کانٹے سے دوڑ گئے۔ کہا، ''روزانہ سن رہی ہوں کریم۔ جہاں پر بھی جاؤں اس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں ہے۔ کچھ روز پہلے سنا کہ ٹرک بھر کر لوگوں کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ آنکھیں اور ہاتھ بندے ہوئے لوگ۔ کتنے لوگوں نے دیکھا یہ منظر۔ اب سن رہی ہوں صدر گھاٹ پر کھڑے ہونا مشکل ہوتا ہے گلی ہوئی

لاشوں کی بدبو کی وجہ سے۔ مچھلی کھانا ہی چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے۔"

۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء بروز بدھ

رومی کا دل بہت اداس ہے۔ چین نے پاکستان کی حمایت کی ہے۔ چواین لائی نے اعلان کیا ہے: آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کے لئے چین کی حکومت پاکستان کو ہر ممکن مدد دے گی۔ رومی اور اس کے ہم خیال جتنے ترقی پسند نوجوان سورج مکھی پھول کی طرح چین کی طرف نظر جمائے رہتے تھے وہ سب لوگ بری طرح مایوس ہوئے ہیں۔ رومی کا انداز دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر یوں لگ رہا ہے کہ جیسے کسی گہرے عزیز نے مصیبت کے وقت اعتماد کو شدید ٹھیس پہنچائی ہو۔

اس طرف ایک اور بکھیڑا پڑا ہے۔ تین چار روز پہلے ڈھاکہ میں شہریوں کی ایک امن کمیٹی قائم ہوئی ہے۔ اخباروں میں بہت فخر کے ساتھ خبر شائع ہو رہی ہے۔ خواجہ خیرالدین کمیٹی کے کنوینر ہیں۔ ۱۸۰ ارکان ہیں۔ ان میں سے نامور شخصیات ہیں عبدالجبار کھدڑ، محمود علی، فرید احمد، سید عزیز الحق، غلام اعظم۔

گزشتہ روز شہریوں کی اس امن کمیٹی کا جلوس نکالا گیا۔ آج کے اخبار میں بہت بڑی تصویر چھپی ہے۔ تصویر دیکھ کر کھانے کی میز پر بیٹھ کر ہم غور و فکر کر رہے تھے..... اتنے لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لئے حکومت کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔

رومی نے کہا، ”کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔ میر پور اور محمد پور کے بہاری اور احسن منزل کے احباب..... ایک ہی بلاوے پر سارے اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔“

شریف نے کہا، ”اس کے علاوہ شک ہوتا ہے کہ تصویر اتارتے وقت کوئی ترکیب آزمائی گئی ہے..... اچھی طرح غور سے دیکھو..... تصویر بہت اونچائی سے ایسے زاویے سے اتاری گئی ہے کہ دو سو لوگ دو ہزار دکھیں۔

۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

اتنی تدبیریں لڑا کر بھی ریڈیو والوں سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہوا۔ ۱۹۵۰ء سے ریڈیو پر پروگرام کرتی ہوں۔ سارے میرے پہچانے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے نورالنبی خان سے ذرا زیادہ واقفیت ہے۔ ان کے بڑے بھائی یحییٰ بھی ریڈیو کے ملازم ہیں۔ میری سہیلی نور جہاں کے ماموں ہیں اس لئے میں بھی ماما کہتی ہوں۔ انہی ماما کے چھوٹے بھائی نورالنبی خان ایک روز صبح کے آٹھ بجے گھر پر آ گئے۔ کھانے کی میز چھوڑ کر ہٹ جانے کا بھی موقع نہیں ملا۔

نورالنبی خان کمرے میں داخل ہوئے.... دونوں ہاتھ جوڑ کر، میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے کہہ گئے:.... ''فوجی حکام ان کی کمر پر بندوقیں ٹکا کر ان سے کام کروا رہی ہے۔ پرانے تمام فنکار، موسیقی کے، ناٹک کے، مقالوں کے.... تمام شعبوں کے فنکاروں کو ڈھونڈ کے لا کر ان سے پروگرام کروانا ہوگا۔'' نورالنبی صاحب کا شعبہ مقالوں کا ہے۔ انہوں نے کہا، ''فی الحال مختلف موضوعات پر پانچ منٹ کے مقالے نشر ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھئے میں موضوعات کی فہرست بھی ساتھ لے کر آیا ہوں۔ ان میں سے اپنی پسند کا کوئی موضوع منتخب کر لیجئے تا کہ آپ کی بھی کوئی بدنامی نہ ہو اور مجھے بھی نجات مل جائے۔''

میں نے انتخاب کیا ''افواہوں پر کان مت دھریئے۔''

آج پہلی وساخ (وہیساکھ) ہے۔ سرکاری چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے۔ پہلی وساخ کا ذکر تک کئے بغیر اخبار میں بکس کے اندر شائع کیا گیا ہے: آج جمعرات صوبائی حکومت نے جو چھٹی دی تھی وہ منسوخ کر دی گئی ہے۔

پہلی وساخ کے موقع پر ڈھاکے میں اور ملک کی دوسری جگہوں پر نئے سال کی جو تقریبات ہوتی چلی آ رہی ہیں وہ بھی ممنوع ہو گئی ہیں.... مگر وہ تو منظر عام پر ممنوع ہوئی ہیں۔ گھروں کے اندر، دلوں کے اندر کے جشن کو کون روک سکتا ہے۔

۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آزاد بنگلہ بے تار چند روز سے سن رہی ہوں۔ بہت تھوڑی دیر کی نشریات صبح کے وقت ایک گھنٹہ.... آٹھ بجے سے نو بجے تک یا پھر ساڑھے آٹھ سے ساڑھے نو تک۔ شام کو کسی روز پانچ بجے سے سات بجے تک اور کسی روز رات کے آٹھ بجے سے دس بجے تک.... لیکن ان میں باقاعدگی نہیں ہے۔ صرف دو تین گانے بار بار دہرا کر نشر کرتے ہیں۔ بنگلہ اور انگریزی میں خبریں۔ مکتی فوجوں کے لئے مقالے۔ غیر ملکی اخباروں اور جریدوں کے حوالے۔ بس یہی کچھ۔ مگر اتنی سی نشریات سننے کے لئے بھی ہم سب کا دل کیسا پیاسا ہوا رہتا ہے۔ مکتی فوجوں کے لئے مقالے! اس کا مطلب ہے کہ آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ حالانکہ دل کو یقین نہیں آتا۔ اور یہ جو آزاد بنگلہ ہے بے تار یہ بھی کہاں سے نشر کیا جا رہا ہے؟ اور کیسے؟ رومی کہتا ہے ضرور سرحد کے علاقوں کے کسی جنگل میں ٹرانسمٹر چھپا کر نشر کیا جاتا ہے۔

ایسا ہی ہوگا.... لیکن اگر کسی روز پکڑے گئے تو؟ اگر پاک آرمی نے چھپے ہوئے ٹرانسمٹر کا کھوج لگا لیا؟ کسی روز وقت پر سٹیشن نہ آ رہا ہو تو گھر کے تمام لوگ بے چین ہونے لگتے ہیں۔ پاک آرمی نے تباہ نہ کر دیا ہو۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اصل میں کلکتے سے یہ پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ اس بات پر بھی یقین نہیں آتا۔ اگر کلکتے سے نشر کیا جاتا تو اور بہتر پروگرام نشر ہوتے۔ گانے بھی وہی دو تین، گھما پھرا کر نشر نہ کرتے۔

۱۸ اپریل ۱۹۷۱ء بروز اتوار

دس بجے بادشاہ آئے گا اس کے ساتھ رکشے پر بیٹھ کر پرانے ڈھاکہ جاؤں گی۔ شریف گاڑی پر جانے نہیں دینا چاہتے ہیں ایک ہی گاڑی کو مختلف سڑکوں پر گھومتے دیکھ کر فوجی شک کر سکتے ہیں۔ مجھے رومی یا جامی کے ساتھ جانے میں ڈر لگتا ہے چنانچہ بھانجی کا شوہر بادشاہ ہی میرا بھروسہ ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ کام کرتا ہے پرانے ڈھاکے کے مٹفورڈ ہسپتال میں۔

شریف، رومی اور جامی کو ساتھ لے کر بال کٹوانے جائیں گے، ڈھاکہ کلب میں۔ وہ لوگ جانے کی تیاری کر رہے تھے اتنے میں سمدھی سمدھن آ گئے۔ شریف کے دوست انجینئر عمر الاسلام کو ہم سمدھی کہتے ہیں۔ اتوار کو وہ اکثر گھومنے نکلتے ہیں۔ مگر آج ان کے چہرے افسردہ، بے رونق ہیں۔ انہوں نے ایک اور انجینئر نورالرحمٰن کی موت کی خبر سنائی۔ اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ پر فوجیوں نے ان کے پورے ٹولے پر گولی چلا دی۔

دل بہت اداس ہو گیا۔ ہمارے واقف کاروں میں سے بہت قریبی جانے پہچانے کی موت کی خبر پہلی بار سُنی۔ اتنے ہنس مکھ خوش مزاج آدمی تھے نورالرحمٰن۔ جہاں پر بھی جاتے تھے سب کو تفریح دیتے تھے۔ ایسا انسان آرمی کی گولی سے ہلاک ہو گیا؟

سمدھی نے کہا، ''نورو اکیلا جاتا تو شائد مارا نہ جاتا۔ وہ اپنے دوست کے کنبے کے بہت سے افراد کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ ٹولے میں چھوٹے بچے بھی تھے۔''

''دوست کون ہیں؟ انہیں تو کچھ نہیں ہوا؟''

''دوست کا نام بھیکھو چودھری ہے۔ وہ اور ان کی بیگم مارے گئے ہیں۔''

میں چونک اٹھی۔ بھیکھو چودھری؟ ہمارے بھیکھو اور ملی تو نہیں؟''

''ملی؟ ہاں ان کی بیگم کا نام ملی ہی تو ہے۔''

بے خود ہو کر کہا، ''بھیکھو ہمارا رشتہ دار ہے اور دوست بھی۔ کب پیش آیا یہ واقعہ؟ کس سے سنا آپ لوگوں نے؟''

تین تاریخ کا واقعہ ہے۔ نورو لوگوں کا نوکر بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ اتنے دنوں کے بعد واپس آیا ہے۔ گزشتہ روز میرے گھر پر آ کر سارا قصہ بیان کیا۔

''اف! دردناک واقعہ ہے، آج اٹھارہ تاریخ ہے، پندرہ روز پہلے بیت چکا ہے یہ ہیبت ناک واقعہ، کسی کو کوئی پتہ نہیں ہے، کس قدر الگ تھلگ جزیرے میں بس رہے ہیں ہم، اس ڈھاکہ شہر میں رہتے ہوئے۔ بھیکھو یعنی مسعود الحق چودھری، سولیکھا پریس کے مالک۔ اسد گیٹ کے پاس نیو کالونی میں ان کا گھر ہے۔ ہمارے دور کے رشتہ دار ہیں۔ ان دنوں جانا آنا ذرا کم ہو گیا ہے مگر ایک وقت تھا.... کافی سال پہلے بھیکھو اور ملی کتنے پیارے تھے، ہمارے۔

میں نے سمدھی سے پوچھا بھیکھو کے بچوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ زندہ تو ہیں بے چارے؟ اور کون کون تھا ٹولے میں؟''

''بھیکھو کے بچوں کو کچھ نہیں ہوا۔ ان کی والدہ اور بہن گولیوں سے زخمی ہوئے ہیں.... تاہم زندہ ہیں۔''

''وہ لوگ ابھی کہاں پر ہیں..... جانتے ہیں آپ؟''

''نہیں.... مجھے معلوم نہیں ہے۔''

بادشاہ آیا۔ شریف نے کہا، ''ایک ہی رکشے پر مت گھومنا۔ مختلف جگہوں پر اتر کر رکشہ چھوڑ دینا۔ جیسے کچھ خریداری کرنے آئے ہو۔ دو چار دکانوں میں گھوم کر ادھر ادھر ذرا چل پھر کر دوسرا رکشہ لے لینا۔''

لال باغ سے شروع کیا۔ چوک بازار پر اتر کر دو چار دکانوں میں گھومے۔ چوک بازار کہنے کی بجائے بازار کا ملبہ کہنا زیادہ درست ہوگا۔ اسی کے بیچ میں جیون کا دیپ جلا کر کچھ لوگ بیٹھے ہیں جو ابھی تک پاک فوج کی گولیوں کا نشانہ نہیں بنے ہیں۔ اس کے بعد اسلام پور، شنکاری پٹی، وائز گھاٹ، پٹواٹلی، صدر گھاٹ، نواب پور گھوم کر جناح ایونیو کے راستے نکل آئے۔ ہر جگہ پر ہی پاکستانی فوج کی کارروائیوں کے نشانات واضح ہیں۔ تاہم شنکاری پٹی کا حال دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ مکانات جس طرح سے ٹوٹے ہیں لگتا ہے کہ بھاری گولوں کا استعمال کرنا پڑا ہوگا۔ اتنے دنوں میں لاشیں ساری ہٹالی گئی ہیں مگر فضا میں اب تک گلی ہوئی لاشوں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ فرش پر، برآمدوں پر، سیڑھیوں پر ابھی بھی پانی کھڑا ہوا ہے۔ سڑک پر بھی پانی۔ لگتا ہے جمے ہوئے خون دھو کر صاف کرنے کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ تقریباً سارے گھروں کے دروازے کھڑکیاں ٹوٹے ہوئے ہیں۔ کسی کسی دروازے کے سامنے ٹاٹ کا ٹکڑا لٹک رہا ہے۔ ٹاٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ نیا خرید کر لٹکایا گیا ہے۔

ہر ایک تباہ شدہ مکان کے سامنے ایک کاغذ کا ٹکڑا ٹنگا ہوا ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔

قریب جا کر ایک دو کاغذ پر سے تحریر پڑھی۔ اردو میں لکھے ہوئے کچھ مسلمان نام درج ہیں۔ معلوم ہوا کہ بہاریوں کو وہ علاقہ بانٹ کر دے دیا گیا ہے۔ جن کو ملا ہے انہوں نے حاصل شدہ مکان کے سامنے کاغذ پر اپنا اپنا نام لکھ کر ٹانگ دیا ہے۔ اپنی ملکیت کا ثبوت رکھنے کے لئے۔

۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء بروز بدھ

رومی کے ساتھ کچھ دنوں سے خوب بحث مباحثہ چل رہا ہے۔ وہ اگر اپنے واقف کار دوسرے لڑکوں کی طرح بستر پر تکیہ چادر سے ڈھانپ کر والدین سے چھپ کر جنگ لڑنے کے لئے چلا جاتا تو ایک طرح سے بچ ہی جاتی۔ لیکن بچپن سے جو سکھایا ہے کہ چھپ کر کوئی کام مت کرنا، اپنے جال میں خود پھنس گئی ہوں۔ رومی مجھے سمجھا کر دم لے گا..... وہ میری تائید حاصل کر کے چھوڑے گا۔

مگر میں کس طرح سے تائید کروں؟ رومی کی ابھی کیا جنگ میں جانے کی عمر ہے؟ ابھی تو پڑھنے لکھنے کا وقت ہے۔ صرف ایف ایس سی پاس کیا ہے۔ یہاں پر انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی لیلنائی یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی میں بھی اس کا ایڈمشن ہو گیا ہے۔ اسی سال ۲ ستمبر سے وہاں پر کلاسیں شروع ہوں گی۔ اسے امریکہ جانا پڑے گا اگست کے آخری ہفتے میں.... وہاں پر چار سال کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد پھر وہ انجینئر بنے گا اور ایسے وقت میں وہ کہتا ہے کہ وہ جنگ پر جائے گا۔

نصیر کے گھر پر بھی یہی بحث ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نصیر الحق ہولی فیملی ہسپتال میں امراض بچگانہ کا ڈاکٹر ہے.... وہ بھی امریکہ جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ ہفتے کے اندر روانہ ہو جائے۔ نصیر نے چند دن پہلے تک تو مجھے سپورٹ کیا مگر آج دیکھ رہی ہوں کہ معاملہ الٹ گیا ہے، نصیر بھی اب رومی کی حمایت کر رہا ہے۔ میں نے غصے سے کہا، ''سمجھ گئی ہوں کہ رومی کیوں اکثر اس گھر میں آتا ہے۔ ان چند دنوں میں اس نے تمہیں پٹی پڑھالی ہے۔''

رومی نے نصیر کی چند ماہ کی بچی کو گود میں اچھالتے ہوئے کہا، ''کیسی باتیں کرتی ہو امی۔ میں تو آتا ہوں اس گڑیا سے لاڈ پیار کرنے کے لئے۔ ماموں کے ساتھ اس مسئلے پر میری بات چیت ہی نہیں ہوئی ہے۔ مگر امی گزشتہ دو ہفتوں سے تم سے جتنی باتیں کر رہا ہوں اس کا ایک چوتھائی حصہ بھی ماموں سے کہتا تو وہ قائل ہو جاتے۔ امی میری بات سنو، طالب علمی کی عمر، پڑھائی لکھائی کی ساری باتیں درست ہیں لیکن ۱۹۷۱ء سال کے اس اپریل کے مہینے میں کیا وہ ساری باتیں مستر د نہیں ہو گئی ہیں؟ ارد گرد نظر ڈال کر دیکھو زندگی اپنی فطری رفتار پر معمول کے مطابق کہاں چل رہی ہے۔ پورا ملک جنتا کی ٹارگٹ پریکٹس کا میدان بنا ہوا ہے۔ رومن گلیڈیٹر سے بھی ہمارا برا حال ہوا ہے۔ ہاتھ اور آنکھیں باندھ کر کھڑا کر کے تڑاخ سے گولی آتی ہے اور لمحوں میں زندہ انسان موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ ایسے حالات میں رہتے ہوئے پڑھائی لکھائی کر کے بڑا آدمی بننے کی سوچیں بہت زیادہ غیر

فطری نہیں ہے کیا؟''

''تم تو یہاں پر نہیں پڑھو گے۔ آئی ٹی آئی میں تمہاری کلاسیں ستمبر میں شروع ہوں گی۔ ضرورت پڑی تو تمہیں چند ماہ پہلے ہی امریکہ بھیج دیں گے۔''

''امی ملک کی ایسی صورتحال میں تم اگر میری مرضی کے خلاف امریکہ بھیج دو تو ہو سکتا ہے بالآخر میں چلا ہی جاؤں مگر میرا ضمیر مجھے ساری عمر کے لئے مجرم بنا دے گا۔ امریکہ سے شائد بہت بڑی ڈگری حاصل کر کے واپس آنے کے بعد بہت نامور انجینئر بن جاؤں گا۔ مگر ضمیر کی تلخیوں کے سامنے کبھی بھی سر نہیں اٹھا سکوں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ایسا ہو؟''

کالج اور یونیورسٹی کے مباحثوں میں خود کو ثابت کرنے والے مقرر رومی نے کبھی بھی بالمقابل فریق سے ہار نہیں مانی۔ آج بھی وہ ہارے گا کیوں؟

میں نے دونوں آنکھیں زور سے بند کر کے کہا، ''نہیں میں ایسا نہیں چاہتی۔ ٹھیک ہے تیری بات ہی سچ ثابت ہوئی۔ جا میں نے تجھے ملک کے لئے قربان کر دیا۔ جا تو جنگ لڑنے کے لئے چلا جا۔''

۲۲ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

وقت لگتا ہے گزشتہ روز سے رکا ہوا ہے۔ کل اسی وقت نصیر کے گھر پر رومی اور میں.... کیا کہا تھا میں نے؟ نصیر، لینا، رومی سارے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر رہ گئے تھے۔ رومی نے بھی یقیناً اپنی ماں سے اتنے ڈرامائی فیصلے کی توقع نہیں کی تھی پھر بھی اس کا چہرہ روشن ہوگیا تھا اور اس نے بھاگ کر مجھے جھپٹ لیا تھا، جیسے چھوٹے بچے نے بہت منت کر کے امی سے آئس کریم کھانے کے لئے پیسہ نکلوالیا ہو۔ نصیر کا چہرہ فق ہوگیا تھا لیکن اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا "آپا..... !" لینا اپنے بچے کو سینے سے چپکا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔

رات کو نیند نہیں آئی۔ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کر پا رہی ہوں۔ صبح ناشتے کے وقت قاسم نے پھر سے کہا کہ وہ گھر پر جانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ کہہ چکا ہے مگر چھٹی نہیں ملی۔ ایک شخص کو جنگ پر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ قاسم تو صرف چار دنوں کے لئے اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ میں نے کہا، "ٹھیک ہے چلے جانا۔"

اس کے بعد مصروف ہوگئی۔ شریف سے کہا دفتر جا کر گاڑی بھجوا دینا.... ٹھٹھاری بازار جاؤں گی۔

شریف نے کہا، "تم بلکہ ابھی تیار ہو کر گاڑی پر چلو۔ مجھے اتار کر اسی طرف سے بازار چلی جانا۔"

آج کل سڑک پر خالی گاڑی نظر آجائے تو آرمی والے روک کر دو چار گھنٹے اپنے کام کے لئے استعمال کر لیتے ہیں۔ پورے شہر میں یہ ایک عام دستور بنا ہوا ہے۔ مگر گاڑی میں خواتین ہوں تو نہیں روکتے۔

ٹھٹھاری بازار کا حال دوسری جگہوں سے کوئی زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ۲۵ مارچ کی رات کو جلنے کے بعد یہاں وہاں پر تھوڑی بہت مرمت کر کے بازار بیٹھا ہے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، "گاڑی بند کر کے میرے ساتھ آؤ۔"

بازار کی فضا ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ راکھ اور ملبے کے ڈھیر کے بیچ میں بیٹھے ہوئے دکاندار کیسے غیر فطری... بے حس سے لگے۔ آنکھوں میں گونگی نظریں۔ پورے بازار میں پانی بہہ رہا ہے۔ اتنا پانی کیوں ہے؟ پراسراریت کا احساس ہونے لگا۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جلدی سے کچھ گوشت اور قیمہ خرید کر لوٹ آئی۔ اتنی بھی ضرورت نہیں ہے.... نیو مارکیٹ میں جو کچھ ملتا ہے اسی سے گزارا کر لیں گے۔

دوپہر کے کھانے پر بیٹھے تو لولو آگیا۔ ایک پلیٹ لے کر وہ بھی کھانے بیٹھ گیا۔ کھاتے ہوئے اس نے کہا، "جانتی ہیں ممانی.... سنا ہے کل ٹھٹھاری بازار میں بہاریوں نے کچھ بنگالی کسانوں کو ذبح کیا ہے۔"

۲۳ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ زندگی کی کائنات کی ساری شیرینیاں تو پہلے ہی خشک ہوگئی ہیں۔ جس خوف جس خدشے نے ہماری زندگی کو جکڑ رکھا تھا اس کی گرفت بھی کچھ کم ہوگئی ہے جس سے ہمارے شب و روز سست ہو گئے ہیں۔

امی کی طرف گئی تھی۔ نچلی منزل میں رفیق اور مونی لوگ مل بانٹ کر رہ رہے ہیں۔ مونی لوگ نکھال پاڑے میں رہتے تھے۔ ۲۵ مارچ کے چند روز بعد سے یہاں پر آ کر رہ رہے ہیں۔ مونی کا شوہر، بچے، رفیق، جوبلی ان کے دو بچے، ملازمہ انورہ..... دو مکمل الگ الگ کنبوں کے اتنے سارے افراد چھوٹے چھوٹے چار کمروں میں گزارا کر رہے ہیں۔ کافی تکلیف میں رہ رہے ہیں۔ البتہ رفیق غور و فکر کر رہا ہے کہ سائنس لیبارٹری روڈ پر اپنے بھائی عتیق کے گھر پر منتقل ہو جائے یا نہیں۔

ہم وہیں پر موجود تھے اتنے میں امی کے ماموں زاد بھائی کی لڑکی تارا اور اس کا میاں ملاقات کرنے کے لئے آئے۔ وہ لوگ اسد گیٹ سے قریب نیو کالونی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس علاقے میں رہنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے آئے ہیں۔ کیونکہ ان کی طرف بنگالیوں کا رہنا دن بہ دن خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ میر پور اور محمد پور کے بہاری دن بہ دن ظالمانہ رویہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ سید پور، پارتی پور، راجشاہی، چٹاگانگ کے مختلف علاقوں میں جن بہاریوں کو مارا گیا ہے اس کے احتجاج میں وہ اگلے روز مظاہرہ کریں گے۔ محمد پور کے بہت سے بنگالی اتنے میں اپنا مکان چھوڑ کر شہر کے دوسرے علاقوں میں رشتہ داروں کے گھروں پر چلے گئے ہیں۔

میں نے کہا، ''بنگالیوں نے بہاریوں کو مارا ہے اس کے احتجاج میں وہ مظاہرے کریں گے؟ اور بہاریوں نے بنگالیوں کا جو خون پانی کی طرح بہایا ہے اس کا احتجاج کون کرے گا؟''

گزشتہ روز بہت سا کھانا پکایا ہے۔ قاسم صرف چار روز کی چھٹی پر گیا ہے مگر جانتی ہوں کہ چار کی جگہ چودہ دن ہو جانا بالکل بھی ناممکن نہیں ہے۔ آج کرنے کو کچھ نہیں ہے کیا اسی لئے گیارہ بجے گرم پانی میں صابن گھول کر دنیا جہان کے کپڑے دھونے بیٹھی ہوں؟ بڑے بڑے بیڈ کور بھی..... کوئی محنت طلب، بھاری کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ پیٹنا، پٹخنا.... دن بھر کپڑے دھلنے کا کام چلتا رہا۔

ٹھٹھاری با...ز...ا...ر میں! ارے دھت! آج صبح میں وہاں پر گئی تھی۔ انسانوں کے ذبح ہونے سے لوگوں میں جتنا خوف پھیلنا چاہئے تھا ویسا تو کچھ نظر نہیں آیا۔ انسان ذبح ہوئے ہوتے تو کیا وہ لوگ اس طرح بے حس بیٹھے رہ سکتے تھے؟ پتہ نہیں تم لوگ کہاں سے اتنی افواہیں اکٹھی کر لاتے ہو۔"

بات میں نے اڑا تو دی لیکن جسم میں کانٹے دوڑتے رہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر قاسم سے کہا، "نیو مارکیٹ سے دو تین مرغیاں اور کچھ مچھلیاں خرید لاؤ۔ ان چیزوں کی صفائی کٹائی کر کے تیار کر دینے کے بعد گھر چلے جانا۔"

۲۴ اپریل ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

مجیب نگر کے نام سے ایک جگہ پر بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کا رسمی طور پر افتتاح ہوا ہے.... گزشتہ ۱۷ اپریل کو سنا تھا کہ ۱۵ تاریخ کو عبوری حکومت تشکیل دی گئی تھی۔ آکاش بانی اور بی بی سی سے اس بارے میں پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی۔ آزاد بنگلہ بے تار سے بھی عبوری حکومت کے وزیر اعظم تاج الدین کا ایک خطاب نشر ہوا تھا۔ ہم نے اپنے کانوں سے تو نہیں سنا مگر دوسروں کی زبانی معلوم ہوا ہے۔

یہ ساری خبریں سن کر ہم سب خوشی کے مارے، بے قراری کے مارے بے اختیار جھوم اٹھتے ہیں۔ ان ہی خیالوں میں جھومتے جھومتے ایک اور خبر سنائی دی۔ ۱۸ تاریخ کو کلکتہ میں پاکستانی سفارت خانے کے سفیر حسین علی نے بنگلہ دیشی (عبوری) حکومت سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا ہے، اپنے مشن کے تمام ارکان کے ہمراہ۔

اس کے بعد سے اگلے کچھ دن تک اخباروں میں جو خبریں شائع ہوتی رہیں انہیں پڑھ کر ان خبروں کی حقیقت کے بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی.....

- کلکتہ میں واقع پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمیشن کو غیر قانونی قبضے سے آزاد کرانے کے لئے پاکستانی حکومت نے بھارت سے گزارش کی ہے۔ گزشتہ ۱۸ اپریل کو بھارتی ریڈیو کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ کلکتہ میں پاکستانی ڈپٹی ہائی کمیشن، وجود نہ رکھنے والی بنگلہ دیشی حکومت کے وفاداروں کے قبضے میں ہے۔
- پاکستانی حکومت نے کلکتے میں پاکستان کا سفارت خانہ بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
- ڈھاکہ میں بھارتی سفارتی مشن بند کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اس سے قبل آکاش بانی اور بی بی سی سے بتایا گیا تھا کہ ۶ اپریل کو نئی دلی میں پاکستانی ہائی کمیشن کے سیکنڈ سیکریٹری اے کے ایم شہاب الدین اور پریس اتاشی امجد الحق پاکستانی حکومت سے لاتعلقی کا اعلان کر کے سفارت خانے سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ اس خبر پر بھی اتنے دنوں کے بعد پوری طرح یقین آیا۔

۲۵ اپریل ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج نصیر امریکہ جانے کے لئے جنیوا روانہ ہوں گے۔ جہاز سہ پہر کے وقت پرواز کرے گا۔ لیکن مسافروں کے علاوہ اور کسی کو ائیر پورٹ کے گیٹ کے اندر جانے نہیں دیتے۔ گیٹ کے باہر سڑک ہی پر گاڑی سے اترنا پڑتا ہے۔ گیٹ کے اندر سرحدی دیواروں سے گھرا ہوا علاقہ خاصہ وسیع ہے۔ پہلے یہاں پر بیک وقت ساٹھ ستر گاڑیاں پارک ہو جاتی تھیں۔ اتنا وسیع علاقہ سامان اٹھا کر پیدل پار کر کے ائیر پورٹ بلڈنگ میں داخل ہونا.... مسافروں کی تکلیف کی انتہا نہیں رہی ہے۔

گھر پر آ کر آم کا اچار بنانے بیٹھی۔ اس مرتبہ کافی زیادہ اچار ڈال کر بوتلوں میں بند کر کے رکھ دوں گی۔ آڑے وقت میں اور کچھ میسر نہ ہوا تو صرف اچار ہی سے بھات کھایا جا سکے گا۔

نارندہ سے عطا بھائی آئے تھے۔ خیریت معلوم کرنے کے لیے' خدا پرست پرہیز گار اور قناعت پسند انسان ہیں مگر اسلام کے نام پر پاکستانی جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس پر ان کی قناعت' چین اور نیند سب حرام ہو گیا ہے۔ کہنے لگے "سمجھ گئیں جہاں آرا! اب اُن کے زیادہ دن نہیں رہے۔ اسلام کے نام پر وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس سے خدا کا عرش بھی کانپنے لگا ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر قاری صاحب قرآن کی تلاوت کر رہے تھے' انہیں بھی گولی مار دی ہے۔ خدا کے گھر میں گھس کر انسان کا قتل' ماں کی آنکھوں کے سامنے ننگے بچے کو سنگین چبھو کر مارا ہے۔ بالغ بچے کے سامنے ماں کو بے عزت کیا ہے۔ سمجھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ اتنے ظلم بخش دے گا؟ وہ اپنی تباہی کو خود ہی دعوت دے رہے ہیں"۔

بہاری بالآخر جلوس نہیں نکال سکے۔ حکومت نے اجازت نہیں دی۔ چھٹکارا ملا۔ لیکن پھر بھی تارا کی زبانی خبر سننے کے بعد سے رومی، جامی کو اکیلے کہیں نکلنے نہیں دے رہی ہوں۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج کے اخبار میں ایک خبر دیکھ کر چونک گئی۔ نیویارک میں پاکستانی سفارت خانے کے کونسلر محمود علی کو معطل کر دیا گیا ہے۔ سمجھ گئی کہ ایک اور محب وطن بنگالی، پاکستانی حکومت کی وفاداری سے دستبردار ہو گیا ہے۔

بنگالی سفارتی مشن کے ملازم، بنگالیوں کے ساتھ اپنی وفاداری کو وابستہ کر رہے ہیں یہ ایک خوشی کی بات ہے مگر وابستگی ایک اور نوعیت کی بھی ہے.... محمود علی ہمارے رشتہ دار ہیں۔ ان کے سسر عبدالخالق شریف کے بھانجے لگتے ہیں۔ آج کل سلہٹ میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہیں۔ ۲۵ مارچ کے بعد افواہ پھیلی تھی کہ پاک آرمی نے ان کے پورے کنبے کو ہلاک کر دیا ہے۔ بعد میں خبر ملی کہ خالق بابا جی جان سے بچ گئے ہیں۔ ان کے پڑوس میں ایک انجینئر کو فوج نے گولی مار کے ہلاک کر دیا تو خالق بھاگ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ محمود علی ان کے داماد ہیں۔ خدا معلوم محمود علی کی وجہ سے ان پر آرمی دوبارہ تشدد شروع نہ کر دے۔

کلیم آیا تھا۔ وہ سب لوگ ابھی تک اپنے اپنے گھروں ہی میں رہ رہے ہیں.... جان ہتھیلی پر رکھ کر۔ اس کی زبانی شہر میں فوجیوں کی کارروائی کے کچھ اور واقعات سنے۔ ہاتھ اور آنکھوں پر پٹی بندھے ہوئے، ٹرکوں پر سوار کردہ نوجوان اب بھی اکثر نظر آتے ہیں۔ کلیم نے یہ بھی بتایا کہ میرپور اور محمد پور میں اکثر چھوٹے چھوٹے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ کچھ فسادات، گھروں پر آتش زنی وغیرہ۔

رنجو نے آ کر ایک دلچسپ خبر سنائی۔ گرین روڈ چوک پر، جہاں میمن سنگھ روڈ اس کے ساتھ ملتی ہے آج چار بجے امن کمیٹی کے خصوصی رکن جناب عبدالجبار کھدڑ صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ ناظرین میں موجود تھے: تین ٹریفک پولیس، ایک ملٹری پولیس اور ایک فوجی جوان۔

۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

نسرین کے والد مظہر صاحب ہمارے بہت پرانے جاننے والے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ ریڈیو پروگرام کیا تھا اس وقت وہ پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ مائیکروفون کے سامنے کس طرح سے دم لے کر پڑھتے ہیں کہ ریڈنگ پڑھنے کی طرح نہیں بلکہ گفتگو کی طرح محسوس ہو.... یہ قاعدہ انہوں نے ہی پہلی مرتبہ مجھے سکھایا تھا۔

بعد میں جب مظہر صاحب نے اپنے دوست اشرف علی کے ساتھ مل کر ''خواتین'' کے نام سے ماہنامہ نکالا تھا تو ابتدا میں کافی مدت تک مجھے اس رسالے کے مدیرہ کی ذمہ داری نبھانا پڑی تھی۔ اس کے بعد کافی عرصے تک ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ہماری گلی میں ان کی بیٹی اور داماد مکان کرایہ پر لے کر رہتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا۔

اچانک ایک روز صبح دیکھا کہ مظہر صاحب ہمارے گھر کے سامنے کھڑے ہیں! قصہ کیا ہے؟ وہ شیموئی میں رہتے ہیں۔ آج کل وہاں رہنا محفوظ نہیں ہے اس لئے ان کا داماد صمدان کو کنبے سمیت اپنے گھر پر لے آیا ہے۔

مظہر صاحب کے اس محلے میں آنے کے بعد سے شام کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ بڑے مجلسی طبیعت کے شخص ہیں۔ بہت سی جگہوں کی خبریں ہوتی ہیں ان کے پاس۔ سارے مل کر اکٹھے آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات سنتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا ریڈیو، اخبارات کی خبریں، آکاش بانی اور بی بی سی کی خبریں اور آزاد بنگلہ بے تار کی خبروں کا آپس میں موازنہ کر کے اصل خبر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کام میں مظہر صاحب کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کے صبر اور ریاضت کی بھی انتہا نہیں ہے۔

امی کے گھر پر گئی تھی دس بجے۔ جا کر دیکھا انہیں بخار آیا ہوا ہے۔ رومی ساتھ تھا اس کو بھیج کر ڈبل روٹی منگوائی۔ امی کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد گھر واپس آ گئی۔ گھر پر آ کر دیکھا مظہر صاحب ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کہیں پر فون کر رہے ہیں۔ ان کے بال الجھے ہوئے، چہرے پر پریشانی۔ کیا بات ہے؟ ان کے داماد صمد کے بڑے بھائی آج صبح کی کوچ سے پٹنہ روانہ ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ میر پور کے بہاری محمد پور کے بنگالیوں کو اندھا دھند مار رہے ہیں۔ اس راستے جتنی بسیں، کوچ وغیرہ جا رہی ہیں سب کو روک کر مسافروں کو مار رہے ہیں۔

پٹنہ کی کوچ تو اریچہ جاتے ہوئے محمد پور اور میر پور سے ہی گزرے گی۔ ہنگامے کی خبر سننے کے بعد

سے ہی وہ کملا پور کوچ سٹیشن پر فون کر رہے ہیں۔ گھنٹی بجتی ہے لیکن کوچ سٹیشن سے کوئی بھی فون نہیں اٹھاتا۔

خبر سن کر میرا بھی دل دھڑکنے لگا۔ مجھے گھر پر اتار کر رومی پھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ خبر سننے کے بعد رومی کو دوبارہ نکلنے نہیں دیا۔ شریف کو اس کے دفتر انجینئرز لمیٹڈ پر فون کر کے اس بارے میں اطلاع کر کے جلدی گھر واپس آنے کے لئے کہا۔

مظہر صاحب تھوڑی دیر بعد آ کر کوچ سٹیشن پر فون ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ فون کی گھنٹی بجتی مگر فون کوئی نہیں اٹھاتا۔ بالآخر دو بجے کے قریب مظہر صاحب نے کہا کہ وہ خود کملا پور جائیں گے..... کھوج لگانے کے لئے۔

وہ صمد کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر کملا پور جانے کے ارادے سے نکلے۔ ہم لوگ گھر پر ٹک کر بیٹھ نہیں پا رہے تھے۔ گلی میں کھڑے ہو کر حسین صاحب، رشید صاحب، احد صاحب..... سب لوگوں کے ساتھ گفتگو کر کے وقت گزارنے لگے۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد مظہر صاحب تفصیلی خبر لے کر واپس آئے۔ کوچ کا ڈرائیور ڈھائی بجے کے قریب کملا پور کوچ سٹیشن پر پہنچا تو اس کی زبانی ساری بات پتہ چلی۔ میر پور برج کے پاس بہاری ان کی کوچ اور ایک اور چھوٹی بس روک کر بڑی سڑک سے ہٹا کر ذرا اندر کی طرف لے گئے۔ اس کے بعد تمام مسافروں کو اتارا۔ خوفزدہ مسافروں کی چیخیں اور بہاریوں کی یلغار کے ہنگامے کے دوران موقع پا کر ڈرائیور بس کے نیچے چھپ گیا اور وہاں سے قتل و غارت کا پورا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بہاری مسافروں کو اتار کر تیز دھار والے ٹوکے اور بڑے چاقوؤں سے ضربیں لگا رہے تھے۔ بس میں دو مسافر ایسے تھے جو حال ہی میں مکے سے حج کر کے ملک واپس آئے تھے۔ بہاریوں نے صرف ان دو مسافروں کو بخشا۔ باقی سب کو مار دیا ہے۔ کچھ لوگوں کو بہاریوں نے چھری مار کر پُل کے اوپر سے دریا میں پھینک دیا.... ڈرائیور نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ منی بس کو وہ لوگ اور ذرہ اندر کی طرف لے کر گئے تھے۔ بڑی سڑک کے موڑ پر کوچ کے مسافروں کو ختم کر کے لاشیں وہیں پر پھینک کر خون کے نشے میں چور بہاری اس منی بس کی طرف دوڑ گئے۔ اس موقع پر ڈرائیور خدا خدا کر کے کوچ کے نیچے سے نکل کر جان بچا کر بھاگ آیا۔ کملا پور کوچ سٹیشن پر پہنچ کر اس نے سب کو یہ واقعہ سنایا۔

۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

بہت گرمی پڑی ہے۔ کچھ دن پہلے بے حد بارش ہونے کی وجہ سے ہوا میں نمی بڑھ گئی ہے لہٰذا گرمی اور بھی ناقابل برداشت محسوس ہو رہی ہے.... شام کے وقت پورچ کے سامنے خالی جگہ پر بید کی کرسی لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ آج مظہر صاحب گھومنے کے لئے نہیں نکلے۔ وہ صبح سے میڈیکل کالج ہسپتال، مٹفورڈ ہسپتال کے مردہ خانے میں، تھانے میں.... ہر ممکن اور ناممکن جگہوں پر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ شریف نے کہا، ''چلو ہم لوگ ان کے گھر چلتے ہیں، پتہ کر کے آتے ہیں کہ کیا ہوا۔''

ہمارے مکان سے دو مکان چھوڑ کر مین روڈ کے قریب صمد لوگوں کا مکان ہے۔ یہ اصل میں صدیقی صاحب کا مکان ہے.... اس گلی میں صرف انہی کا مکان تین منزلہ ہے۔ صمد لوگ نچلی منزل میں کرائے پر رہتے ہیں۔ صمد لوگوں کے ڈرائنگ روم میں ایک طرف ایک پلنگ رکھا ہے۔ مظہر صاحب اسی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ یوں لگا کہ دو دن ہی میں ان کا وزن دس پاؤنڈ کم ہو گیا ہے۔

ہم لوگ کرسی پر بیٹھ کر خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ مظہر صاحب پھٹی ہوئی آواز میں بولے، ''کہیں پر سراغ نہیں ملا۔ مردہ خانے میں جتنی لاشیں دیکھیں سب کی انتڑیاں نکلی ہوئی ہیں۔ وحشیوں نے پہلے پیٹ میں ضرب لگائی اس کے بعد جسم کے دوسرے حصوں پر۔ اف! ایسا اذیت ناک منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لگتا ہے کہ پولیس تمام لاشیں اٹھا کر نہیں لا سکی ہے۔ ڈرائیور نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بہت سے زخمیوں کو دریا میں پھینک دیا ہے۔ مشقت کی وجہ سے شائد وہ سب کو دریا میں نہیں پھینک سکے ورنہ یقیناً دریا میں ڈال کر تمام لاشیں گم کر دیتے۔

مظہر صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔

''آپ یہ ساری باتیں اس وقت مت کیجئے۔ دل میں بھی مت لائیے۔ بلکہ آج رات کو ویلیم کی گولیاں کھا کر سو جائیے۔'' ہم لوگ واپس آ گئے۔

رات کو ویلیم ہمیں بھی کھانا پڑی۔ اس کے باوجود نیند نہیں آئی۔ بیچ بیچ میں نیند کی کیفیت میں چونکتے رہے۔

یکم مئی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آنکھیں اور ہاتھ باندھ کر لوگوں کو ٹرک پر اٹھا کر لے جانا۔ آنکھیں اور ہاتھ بندھے ہوئے گولیوں سے ہلاک لوگوں کی دریا میں بہتی لاشیں.... ان خبروں کے ساتھ ایک اور خون ٹھنڈا کر دینے والی خبر بھی سنائی دے رہی ہے۔ پہلے دو ایک لوگوں کی زبانی، بے یقینی کے ساتھ، تھوڑا تھوڑا سنتے رہے، پھر اس خبر نے لوگوں کی زبانی پھیلتے پھیلتے، بیساکھ کی کالی آندھی کی طرح پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پاکستانی فوج اب نوجوان اور زیادہ عمر کے لوگوں کو پکڑ کر گولیوں سے مار نہیں رہی ہے بلکہ ان کے جسم سے خون کی آخری بوند تک نچوڑ کر لاش پھینک دیتی ہے۔ اتنے خون کی کیا ایسی ضرورت پیش آ گئی؟ ملک کے مختلف حصوں میں ان کی جو جھڑپیں ہو رہی ہیں، مکتی باہنی کے ساتھ اس میں کثیر تعداد میں پاکستانی فوج کے جوان زخمی ہو رہے ہیں۔ ان کے علاج کے لئے خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنا خون بلڈ بینک میں نہیں ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے خون اکٹھا کر رہے ہیں۔

پہلے یہ خبر کیسے پھیلی؟ گولی مار کر، چھرا مار کر لاش پھینکی جائے تو سمجھ آ جاتی ہے۔ مگر خون نکال کر لاش پھینکی جائے تو کیسے پتہ نہ چلے؟ جسم پر کوئی زخم کا نشان نہیں ہے پھر بھی مردہ.... پہلے لوگوں کو سمجھ نہیں آئی کہ کس طرح سے فوت ہوا ہے۔ دو ایک موقع پر پھینک دینے کے باوجود کوئی نہیں مرا، بڑی مشکل سے بچنے کے بعد جب انہوں نے لوگوں کو آپ بیتی سنائی تو لوگوں کو سمجھ آئی کہ زخم کے کسی نشان کے بغیر ہی لوگ کیسے مر رہے ہیں۔

سارے ڈھاکہ شہر میں آج کل بھیانک خوف پھیلا ہوا ہے۔ کسی بھی ہسپتال کے ڈاکٹر بتا نہیں پا رہے ہیں کہ یہ کام کہاں پر سرانجام دیا جا رہا ہے۔ خون حاصل کرنے کے لئے ٹیبل، ڈاکٹر، کمپاؤنڈر، سرنج، پلاسٹک کی باریک نلکیاں، خون بھرنے کے لئے بوتل یا پلاسٹک کا بیگ.... ان ساری چیزوں کی ضرورت ہے۔ کسی ہسپتال میں یہ سارا کام جتنا بھی چھپا کر کیا جائے بات پھیل جائے گی۔ واقف کار بہت سے ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ کسی ہسپتال میں یہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ فوجیوں نے یقیناً کہیں پر خفیہ کلینک قائم کیا ہوگا اس مقصد کے لئے۔ ہمارے واقف کار کچھ ڈاکٹروں نے اس خبر کو محض افواہ، کہہ کر اڑا دیا۔ ہم بھی تو ایسا ہی چاہتے ہیں مگر دل سے خوف کو کیسے بھگائیں؟

رنجو خون یخ کرنے والی ایک خبر لے کر آیا۔ مہاکھالی سے جو سڑک ٹنگی کی طرف جاتی ہے اس کے بائیں طرف کچھ دکانیں ہیں۔ بیچ بیچ میں پتلی گلیاں بائیں طرف کو چلی گئی ہیں۔ اس طرف رہائشی مکان ہیں، محلہ ہے۔ دائیں طرف گلشن ہے۔ ان دکانوں میں سے ایک دواؤں کی دکان پر رنجو کا ایک دوست ایل ایم ایف ڈاکٹر

روزانہ شام کو بیٹھ کر دو چار مریض دیکھتا ہے۔ چند دن پہلے شام کے بعد دو پاکستانی فوجی اور دو بہاری بندوق دکھا کر اس ڈاکٹر کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ پہلے انہوں نے ڈاکٹر کو جیپ میں بٹھایا۔ تھوڑا آگے جا کر وہ بائیں طرف ایک گلی کے اندر مڑے۔ اس وقت پیچھے سے کسی نے ڈاکٹر کی آنکھوں پر کالا کپڑا باندھ دیا۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد جیپ رک گئی۔ ڈاکٹر کو بازو سے پکڑ کر جیپ سے اتارا اور ایک مکان کے اندر لے گئے۔ مکان کے اندر انہوں نے آنکھ پر سے پٹی کھول دی۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ بانس کی چھالوں سے بنی ہوئی دیواریں اور ٹین کی چھت والا ایک کمرہ ہے۔ کمرے کے ایک طرف ایک لمبی میز ہے۔ میز کے قریب ایک اور چوکور میز پر کافی ساری بوتلیں، سرنج، پلاسٹک کی نلکیاں وغیرہ پڑی ہیں۔ کمرے کے دوسری طرف ایک بینچ پر آنکھوں پر پٹی بندھے ہوئے تین آدمی بیٹھے ہیں۔ مسلح فوجی اور بہاریوں کے حکم پر ڈاکٹر کو ان تینوں کے جسم سے خون نکالنا پڑا۔ رنجو کے دوست نے ایسی خوفناک صورتحال میں بھی حواس قائم رکھے۔ کام ختم ہونے پر جب فوجی اور بہاری آپس میں بحث کر رہے تھے کہ ڈاکٹر کو مار دیا جائے یا چھوڑ دیا جائے تو اس موقع پر ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ وہ جب بھی کہیں گے وہ آ کر یہ کام کر دیا کرے گا۔ ڈاکٹر کی قسمت اچھی تھی کہ انہوں نے اس کی بات پر یقین کیا۔ چھٹکارا پاتے ہی ڈاکٹر جان بچا کر بھاگ کر رنجو کے گھر پہنچا۔ اسے سارا واقعہ بتا کر اسی رات کو ڈاکٹر بھاگ گیا، بارڈر کراس کر کے انڈیا جانے کی امید میں۔

رنجو کے چلے جانے کے بعد بھی ہم لوگ بہت دیر تک سن ہو کر بیٹھے رہے۔ میں نے کہا، ''مجھے ٹھیک یقین نہیں آ رہا ہے۔ رنجو کے دوست نے فرضی کہانی نہیں سنائی، اس کا کیا ثبوت ہے۔''

شریف نے آہستہ سے کہا، ''یقین کرنا اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ کیا ایسی منصوبہ بندی کے ساتھ انسان پر تشدد کرنا دوسرے انسان کے لئے ممکن ہے؟ اس بات کو مان لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔''

کیوں دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کے گستاپو فورس نے کنسٹریشن کیمپ میں قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس بارے میں تم نے نہیں پڑھا؟ گھر پر کم از کم دس کتابیں موجود ہیں اس موضوع پر۔''

رومی کا مزاج آج کل بہت کھچا رہتا تھا۔ ابھی تک وہ جنگ میں شامل ہونے کے لئے جا نہیں سکا ہے۔ صحیح رابطہ نہیں مل رہا ہے۔ اکثر شکایت کرتا رہتا ہے۔ پہلی کھیپ میں میرے جو دوست چلے گئے ہیں ان کے ساتھ جاتا تو کتنی آسانی کے ساتھ بارڈر کراس کر چکا ہوتا۔ اس وقت محفوظ بھی تھا۔ سرحد کے قریب بہت سے علاقوں تک فوجی نہیں پہنچے تھے۔ اب تو زیادہ تر علاقوں پر فوجیوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ آج کل راستے میں مصائب بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔''

میں خاموش رہتی ہوں۔ آج کل یوں لگتا ہے کہ بہت پہلے ہی جانے کی اجازت دے سکتی تھی۔ آس پاس سے جتنی خبریں سنائی دے رہی ہیں.... تندرست و توانا انسان کو پکڑ کر انتہائی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ، احتیاط کے ساتھ، سرنج چبھو کر جسم کا سارا خون نچوڑ کر مار ڈالنا۔ ایسی خطرناک صورتحال میں رومی جیسے صحت مند لڑکے کے ساتھ رہتے ہوئے ہر وقت ذہن خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھ کر بستر پر بیٹھی ہی رہتی ہوں۔

۲ مئی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

دھان منڈی ۱۳ نمبر روڈ پر مکو یعنی محبوب الحق چودھری کا مکان ہے۔ مکو، بھیکھو چودھری کے بڑے بھائی ہیں۔ مشرقی پاکستان حکومت کے ریٹائرڈ لاء سیکریٹری ہیں۔ بھیکھو کی بہن، ماں اور بچیاں کروٹیا سے چند روز پہلے واپس آئے ہیں۔ ان سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ سب لوگ ایسے بیٹھے ہیں جیسے سر پر بجلی گری ہو۔ صرف خالہ یعنی بھیکھو کی ماں کچھ کچھ باتیں کر رہی ہیں لیکن زیادہ تر رو رہی ہیں۔ بھیکھو کی بہن بولو یعنی مسعودہ کے شوہر شرف العالم پولینڈ میں پاکستانی سفارت خانے میں ملازم ہیں۔ بولو چھٹی گزارنے کے لئے ملک آئی تھی اور یہ سارا واقعہ پیش آ گیا۔ اس کے داہنے کندھے پر گولی لگی ہے۔ بھیکھو کی امی کی زبانی سارا واقعہ سنا۔

ان کا ایک بڑا ٹولا ڈھاکے سے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کروٹیا میں جہانگیر کے (انجینئر نورالرحمٰن کو جہانگیر کہتے ہیں) پھپھا کے گھر پر پناہ لینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ صبح کا ناشتہ تیار ہو رہا تھا۔ نیند سے اٹھ کر سب لوگ منہ ہاتھ دھو رہے تھے۔ ایسے وقت میں پاک فوجی مکان کو گھیر کر گولیاں چلانے لگے۔ بھیکھو کی ماں ابھی معاملہ ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ اتنے میں اپنے بیٹے اور بہو کو گولی کھا کر تالاب کے کنارے لوٹتے دیکھا۔ ملی کے دونوں پیر تالاب کے پانی کے اندر اور سر تالاب کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔ گولی ان کے پیٹ پر لگی، بولو کے کندھے کے نیچے۔ جہانگیر کی پھپھو کمرے کے اندر تھیں۔ انہیں وہیں پر گولی لگی۔ گولی کھا کر جہانگیر بھی لوٹ پڑا اور بھی بہت سے افراد مارے گئے۔ باقی لوگ چیختے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ پاک فوجی تھوڑی دیر تک گولیاں چلا کر چلے گئے۔ بھیکھو کی ماں پیٹ میں گولی لگی ہوئی حالت میں بھیکھو کے بچوں کو تلاش کرنے لگیں۔ دیکھا کہ بھیکھو کی پانچ سال کی بچی ائین خوف کے مارے روتی دوڑتی چند دوسرے لوگوں کے پیچھے جا رہی ہے۔ بھیکھو کی ماں اسی طرح زخمی حالت میں ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑے، بھاگ کر گئی، دوسرے ہاتھ سے اپنی نواسی کو پکڑ کر لے آئی۔ ملٹری کے چلے جانے کے بعد اس گاؤں کا ایک مہربان طالب علم بہت کوشش کر کے بولو اور اس کی امی کو مرزا پور ہسپتال لے گیا۔ وہاں پر وہ لوگ تقریباً تین ہفتے تک رہے۔ اس کے بعد رشتہ دار اور دوستوں کی مدد سے ڈھاکہ واپس آئے ہیں۔ بولو اور اس کی امی کے جسم میں ابھی تک گولی کے ٹکڑے موجود تھے۔ دھان منڈی میں ڈاکٹر منیر الزمان کے کلینک میں بہت رازداری اور احتیاط سے گولی کے ٹکڑے نکالے گئے ہیں۔

میں ساری باتیں سن کر خاموشی سے بیٹھ کر سوچوں میں ڈوب گئی۔ پورے ملک پر کیسی غضب ناک

آفت آن پڑی ہے۔ بھیکھو، ملی، حمید اللہ، صدیقہ، خندکر ستار، رنجو کے کولیگ، نورالرحمٰن..... کیا قصور تھا ان سب لوگوں کا؟ امن پسند شہری اپنے وطن سے پیار کرتے تھے۔ بھیکھو پریس چلا کر نجی کاروبار کر کے پیٹ بھرتا تھا۔ عوامی لیگ کا حامی تھا، بنگالی قومیت پر یقین رکھتا تھا۔ یہی اس کا قصور تھا؟ حمید اللہ امن پسند نرم طبیعت آدمی ہیں، مشرقی پاکستان کے پہلے اور واحد سولہ آنے بنگالی ملکیت بینک ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ اس جرم میں ان کو اتنی بڑی سزا ملی؟ اپنے واحد بچے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ظالموں کی گولی کا نشانہ بن کر مرتے دیکھا۔ شدید زخمی بیگم نے کچھ دنوں کے بعد انہی کی گود میں آخری سانس لیا۔ انجینئر نورالرحمٰن نجی کاروبار کرتا تھا۔ شادی نہیں کی تھی اس لئے کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ وطن اور وطن کے دس لوگوں کی خدمت کرتے پھرتے تھے۔ کیا اسی جرم میں انہیں جان دینا پڑی؟

۳ مئی ۱۹۷۱ء بروز پیر

آج میری سالگرہ ہے۔

۲۹ مارچ کو رومی کی سالگرہ پر پھر بھی سوچ لیا تھا کہ کونسا سپیشل کھانا پکانا چاہئے، کیونکہ اس وقت تک ۲۵ مارچ کی سیاہ رات کا دھچکہ امنگوں کو پوری طرح زیر نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت تک اس غضب ناک ظلمت کی وسعت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک خواب وخیال سسک کر مر نہیں گئے تھے۔ مگر اس جشن ظلمات کے پانچ ہفتوں کے بعد ذہنی رجحان، عقل وفہم کچھ بھی فطری رفتار پر نہیں چل رہا ہے۔ جیسی زندگی اب تک گزارتے آئے ہیں اب آکر بالکل بے معنی محسوس ہو رہی ہے۔ بھیکھو، ملی، صدیقی، نورالرحمٰن کے بے جا قتل نے ذہن پر سکتہ طاری کر دیا ہے۔

پھر بھی اتنے سالوں کی عادت اور روایت کے مطابق صبح رومی اور جامی نے میرے کمرے کے دروازے پر آکر جب پوچھا، ''امی آجائیں؟'' تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، ''آجاؤ۔''

وہ ہر سال کی طرح ہی کمرے میں داخل ہوئے مگر اس مرتبہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ ہاتھوں میں خوبصورت پیکٹ میں بند سرپرائز گفٹ بھی نہیں تھے۔ ان کے چہروں پر کالی گھٹائیں مگر ان میں نمی نہیں تھی برقی لہر تھی..... میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ رومی کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی اور جامی کے ہاتھ میں باغ سے چنا ہوا ایک ادھ کھلا کالا گلاب جس کا نام ''بونی پرنس'' ہے۔

رومی نے کتاب میرے ہاتھ میں تھما کر کہا، ''امی یہ کتاب پڑھ کر تم دل میں زور محسوس کرو گی۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں جرمنی کے پولینڈ پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لینے کے بعد پولیش یہودیوں پر نازی فوج نے جو غیر انسانی تشدد کیا تھا، اس کے خلاف پولیشوں نے جو غیر معمولی احتجاج کیا، اس بارے میں لکھی ہوئی ہے یہ کتاب۔ بے نشان ہو جانے سے قبل آخری لمحے تک کس طرح وہ لڑتے رہے۔ لڑتے ہوئے موت کو قبول کیا مگر سر نیچا نہیں کیا..... اس بارے میں کہانیاں درج ہیں اس کتاب میں۔ جرمن لوگ یہودیوں کو انسان نہیں سمجھتے تھے۔ مغربی پاکستان والے بھی ہمیں انسان نہیں سمجھتے، مسلمان نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ان کی نسبت ہم کہیں زیادہ خالص مسلمان ہیں۔ پڑھنے سے سمجھ جاؤ گی اس کتاب میں جو لکھا ہے۔ ملک اور قومیت کا نام بدل دیا جائے تو یہ ہو بہو بنگلہ دیش اور بنگالیوں کی درد بھری کہانی، احتجاج کی کہانی، زندگی اور موت کے درمیان جدوجہد کی کہانی معلوم ہوگی۔''

نظر ڈال کر دیکھا لیون اریس کی لکھی ہوئی کتاب ''مائلا.....۱۸'' ہے۔ رومی کی اپنی ذاتی لائبریری میں ''اکساڈس'' کے مشہور مصنف لیون اریس کی ساری کتابیں موجود ہیں۔ پہلے بھی دیکھی تھی مگر پڑھی نہیں تھی۔

جامی نے کالے گلاب کی ادھ کھلی کلی میرے ہاتھ میں دی۔ رومی نے کہا، ''ہماری آزادی کی علامت ہے۔ اس طرح کے رنگ کا خون بہانے کے بعد آزادی کا شہزادہ رونما ہوگا۔''

بونی پرنس کی پنکھڑیاں سیاہی مائل گہری میرون.... جمے ہوئے خون کے رنگ کی ہیں۔ ابھی پوری طرح نہیں کھلا۔ مخمل کی طرح ملائم پنکھڑیوں نے مٹھی بند کی ہوئی ہے۔ ہماری آزادی حاصل ہونے میں ابھی دیر ہے۔

رومی نے کہا، ''تمہاری سالگرہ پر ایک خوشخبری سناتا ہوں امی۔'' وہ ذرا سا رکا۔ میں دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ''میرے جانے کا انتظام ہوگیا ہے۔ ضرورت کے مطابق رابطہ ہوگیا ہے۔ شروع میں اگر تم اتنی رکاوٹ پیدا نہ کرتیں تو ایک ماہ پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔''

میں نے کہا، ''تم مجھ پر ناراض مت ہو۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم دوسروں کی دیکھا دیکھی میں جانا چاہتے ہو یا واقعی دل و جان سے سوچ سمجھ کر جانا چاہتے ہو۔''

''دیکھا دیکھی....؟ رومی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ زندگی اور موت کی لڑائی، اپنے وجود کو بچانے کی لڑائی کے لئے جانے کا فیصلہ کیا دیکھا دیکھی میں کیا جاتا ہے؟''

''نہیں، نہیں، میں نے یہ نہیں کہا.... غلط مت سمجھو.... سارے دوست جا رہے ہیں محض اس لئے تو جانا نہیں چاہتے ہو۔ میدان جنگ کی تکلیفیں اور خوفناک صورتحال کے بارے میں تم صحیح اندازہ کر پا رہے ہو یا نہیں اس بارے میں تمہیں پرکھنے کے لئے مختلف طرح سے رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ تمہارے کچھ دوست میدان جنگ کی تکلیفیں برداشت نہ کر پائے اور واپس بھاگ آئے ہیں۔''

''بھاگ بھی آئے ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ کروڑ میں سے دو سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''کب جاؤ گے؟ کن کے ساتھ؟''

''تین چار دن کے اندر۔ کن کے ساتھ مت پوچھو۔ بتانا منع ہے۔''

لوہے کے شکنجے سے جیسے کسی نے سینے کی سب پسلیاں جکڑ لی ہوں۔ گھپ اندھیرے میں کسی یقین دہانی کے بغیر ہی چھوڑ دینا ہوگا۔ جاننے کی کوشش کرنا بھی ممنوع ہے.... کس طرف جائے گا، کن لوگوں کے ساتھ جائے گا۔ رومی اب اپنی ذاتی زندگی میں داخل ہونے جا رہا ہے اپنی انفرادی نجی زندگی میں، جہاں اس کو جنم دینے والی بھی داخل نہیں ہو سکتی۔

یاد آیا خلیل جبران نے اپنی کتاب ''پرمٹ'' میں ان کے بارے میں ہی لکھا ہے:

بچے تمہارے نہیں ہیں،
وہ زندگی کی اولادیں ہیں
زندگی کے لئے ہی ان کی بے تابی ہے۔

وہ تمہارے ساتھ ہی رہتے ہیں
پھر بھی وہ تمہارے نہیں ہیں۔
انہوں نے تم سے پیار کیا ہے
مگر تمہارا عقل وفہم نہیں لیا ہے
کیونکہ انہوں نے تعمیر کرلیا ہے
اپنا منفرد خواب وخیال۔
ان کے جسم تمہاری گرفت میں ہیں
مگر ان کی روحیں ہرگز نہیں ہیں
کیونکہ ان کی روحیں بستی ہیں
مستقبل کی کوٹھڑیوں میں
جن کوٹھڑیوں میں تم کبھی بھی نہیں جاسکتے
حتیٰ کہ خوابوں میں بھی نہیں۔
ان کو اپنے طرز پر ڈھالنے کی خواہش مت کرو
کیونکہ ان کی زندگی کبھی نہیں لوٹے گی
پیچھے کی طرف۔

۴ مئی ۱۹۷۱ء بروز منگل

فوجی حکومت اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈال کر امور زندگی کو معمول کے مطابق چلتا ہوا دکھانے کے لئے بے تاب ہوگئی ہے۔ آج کے اخبار میں ایک پرلطف خبر چھپی ہے، شاعرہ صوفیہ کمال کی تصویر کے ساتھ۔ ریڈیو پر ایک مقالے میں ''مشرقی پاکستان کی نامور شاعرہ اور سماجی کارکن بیگم صوفیہ کمال نے کہا ہے کہ..... جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں وہ جان کر خوش ہوں گے کہ وہ خیریت سے ہیں اور اپنا ادبی کام چلا رہی ہیں۔

تصویر میں شاعرہ کا چہرہ انتہائی بے رونق نظر آ رہا ہے۔ ان کے سامنے ایک غیبی ہاتھ نے مائیکروفون پکڑا ہوا ہے۔ مائیکروفون یوں لگ رہا ہے جیسے بلند کی ہوئی سنگین ہو!

بھارتی ریڈیو نے ان کے موت کی خبر نشر کی تھی۔ اسی خبر کی تردید کے طور پر ان کی یہ تصویر اتاری گئی ہے۔ اخبار میں اور بھی دھڑلے سے لکھا ہے کہ:

''گزشتہ روز بنگلہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر کبیر چودھری نے ڈھاکہ ریڈیو سے منشی مہراللہ کے بارے میں ایک مقالہ پڑھا۔''

حال ہی میں چند ایک امریکی اخباروں میں اشتہار کے ذریعے کبیر چودھری کے کنبے کے لئے امداد کی درخواست شائع کر کے یہ تاثر پیدا کیا گیا تھا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔

پرسوں کے اخبار میں بھی اسی نوعیت کی خبر چھپی ہے: ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سربراہ ڈاکٹر مغیض اللہ کبیر نے یکم مئی بروز ہفتہ کی شام ڈھاکہ ٹی وی پر مسلم بنگال کے دو مہمان انقلابی رہنماؤں حاجی شریعت اللہ اور دودو میاں کی زندگی اور خدمات کے بارے میں ایک گفتگو میں شرکت کی۔ ان کے ساتھ گفتگو میں شامل تھے شعبہ تاریخ کے ریڈر جناب ڈاکٹر مہر علی۔

ڈاکٹر کبیر چودھری حالیہ ہنگاموں میں ہلاک ہو گئے ہیں.... اس افواہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے انہیں ٹی وی سکرین پر حاضر کیا گیا ہے۔

میری طرح کے گم نام صداکاروں کے علاوہ اب وہ مختلف اعلیٰ سطحوں پر فائز نامور اشخاص کو ریڈیو اور ٹی وی پر لا کر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ تمام افراد فوجی جنتا کے جشن قتل کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ بہت خوب! فوجی جنتا شعبہ فلسفہ کے سربراہ ڈاکٹر جی سی دیو، جگن ناتھ ہال کے پرووسٹ ڈاکٹر جوا ترمائی گوھ ٹاکر، سٹیٹس

ٹکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر منیر الزمان، انتھراپولوجی کے سینئر لکچرار ڈاکٹر ایف آر خان، شعبہ ریاضیات کے لکچرار جناب اشرف علی، فزکس کے جناب خادم، اپلائڈ فزکس کے مسٹر بھٹہ چاریا، ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مسٹر صادق علی اور ڈاکٹر سعادت علی.... ان لوگوں کو بھی ذرا ریڈیو، ٹیلی وژن پر حاضر کریں۔ دنیا والوں کو بتائیں کہ انہوں نے ان معزز افراد کو ۲۵ مارچ کی سیاہ رات کو گولیوں کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ نہیں اتارا ہے۔

۶ مئی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

رومی کل روانہ ہوگا۔اس کی پتلون میں، کمر کے پاس اندر کی طرف سلائی کھول کر ایک سو ٹکوں کے چند نوٹ تہہ کر کے رکھے اور دوبارہ سلائی کر دی۔ جیب میں والٹ کے اندر دو ایک سے زیادہ نہیں رکھے گا کیونکہ راستے میں ممکن ہے خان سپاہی ہاتھ مار لیں۔

کپڑے رکھنے کے لئے رومی ایک چھوٹے سائز کا ائیر بیگ اپنے ساتھ لے رہا ہے۔ بیگ میں دو سوٹ، تولیہ، صابن، چپلیں، اور دو کتابیں... جیون آنند داس کی منتخب نظمیں اور سوکانت کی مکمل تحریریں۔

جن دو دوستوں کے ساتھ رومی جا رہا ہے ان کا نام بالآخر رومی نے بتایا ہے، مبو اور سیرت۔۔ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ دونوں نام فرضی ہیں۔

رات کو سوتے وقت رومی نے کہا، ''امی آج ذرا دیر تک بالوں میں انگلیاں پھیرنا پڑیں گی۔''

چھوٹی عمر سے سوتے وقت دونوں بھائیوں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی آ رہی ہوں۔ کبھی کبھی دونوں بھائی اس مسئلے پر لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ رومی کہتا ہے ''امی تم جامی کے پاس زیادہ وقت لگا رہی ہو۔ جامی کہتا ہے ''امی تم بھیا کو زیادہ وقت دے رہی ہو۔''

میں رومی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ رومی آہستہ آہستہ ''ایک بار جانے دے ماں ہو آؤں'' اس گانے کی دھن پر سیٹی بجانے لگا۔

۷ مئی ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

صبح ناشتہ کرتے وقت رومی نے کہا، ''امی مجھے سیکریٹریٹ سیکنڈ گیٹ کے سامنے اتار دیجئے گا۔ جامی تم ائیر بیگ پہلے ہی گاڑی میں رکھ آؤ۔ پیروں کے پاس رکھنا تاکہ نظر نہ آئے۔''

ناشتہ ختم کر کے رومی نے اپنے دادا کے قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھاما۔ بابا آنکھوں سے دیکھتے نہیں ہیں چنانچہ جو بھی ان کے پاس جائے پہلے ان کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ ہاتھ پکڑتے ہی بابا نے آہستہ سے پوچھا، ''کون؟''

''میں رومی، دادا۔''

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد رومی نے کہا، ''دادا میں کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں..... گھومنے کے لئے۔''

''انجینئرنگ کالج تو بند ہے۔ کالج کی طرف سے نہیں، مگر کالج ہی کے چند دوستوں کے ساتھ..... گھر پر بیٹھے بیٹھے بالکل سست ہو گیا ہوں..... کوئی کام کاج بھی نہیں ہے اس لئے.....''

بابا تھوڑی دیر خاموش رہے اس کے بعد اپنی عادت کے مطابق دھیمی آواز میں رک رک کر بولے، ''سیر کرنا بہت اچھا ہے۔ ہمارے وقت میں بھی جاتے تھے۔ مگر چھٹیوں کے دنوں میں۔ خیر، احتیاط کرنا۔ آجکل تو سنا ہے ہر طرف فساد ہو رہے ہیں۔''

''نہیں دادا، فساد اب نہیں ہے۔ اب تو سب جگہوں پر امن.....''

''امن؟ جامی لوگوں کا سکول پھر کیوں نہیں کھلتا؟ تمہارا کالج کیوں بند ہے؟''

بابا کو لے کر ایک یہ مشکل ہے۔ آنکھوں سے بے شک نہیں دیکھتے مگر سوچ و فکر اور اندازہ ابھی تک بھلا چنگا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ کوئی بات ادھر سے ادھر ہو جائے تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ دھائیں کر کے بلڈ پریشر چڑھ جاتا ہے لہٰذا انہیں ساری باتیں اچھی طرح سنسر کر کے بتانا پڑتی ہیں۔ ویسے بابا میں اب بردباری آ گئی ہے۔ پہلے جس طرح ہر چیز کے بارے میں ہدایت دیتے تھے، ٹوکتے تھے۔ اب ایسا نہیں کرتے ہیں۔ سب کچھ مان لیتے ہیں۔

کئی دنوں سے دوپہر کے بعد اکثر آندھی کے ساتھ بارش ہو رہی ہے۔ آج صبح سے ہی آسمان پر بادل ہیں۔ یا اللہ آج مینہ نہ برسانا۔

جامی کو پاس بٹھا کر میں سٹیرنگ پر بیٹھی۔ ڈرائیور کو کل ہی کہہ دیا تھا آج اس کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریف اور رومی پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ شریف کے ہاتھ میں اخبار تھا..... کھول کر پڑھنے کا بہانہ کر رہے ہیں۔

رومی نے کہا، ''سیکنڈ گیٹ پر میرے اترتے ہی تم لوگ چلے جانا۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔''

ویسا ہی کیا۔ اگلو آئس کریم کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ رومی نے ہلکا پھلکا ائیر بیگ کندھے پر ڈالا، گاڑی سے اترا اور سامنے کی طرف چلتا ہوا ایسے نکل گیا جیسے کالج کا کوئی لڑکا کتابیں کاپیاں لے کر پڑھنے جا رہا ہے۔ میں نے شاں کر کے نکلتے ہوئے عقبی شیشے میں آنکھ رکھ کر رومی کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش کی۔ دیکھ نہیں پائی.... رومی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں گھل مل گیا تھا۔

۹ مئی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

ایسا لگ رہا ہے جیسے لوہے کے شکنجے نے جسم کے دونوں جانب سے پسلیوں کو جکڑا ہوا ہے۔ کبھی کبھی سانس اٹکنے لگتی ہے۔ کبھی آنکھیں دھندلی ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی سارا کام چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل کرتا ہے لیکن کہتے ہیں کہ مچھلی کی ماں کو افسوس نہیں کرنا چاہئے۔ چور کی ماں بلند آواز میں بات کرتی ہے۔ رومی کے جانے کے بعد سے روزانہ اونچی آواز میں کیسٹ بجایا جاتا ہے۔ شام کے بعد سارے کمروں کی بتیاں جلا کر اونچی آواز سے ٹی وی چلا دیا جاتا ہے گویا کہ گھر میں جشن کا سماں ہے۔ رنگ و موسیقی، شور و غل، رونق لگی ہوئی ہے۔ آس پاس کے کسی گھر سے کوئی شک نہ کرے کہ اس گھر میں لوگوں کا دل درد سے پھٹا جا رہا ہے۔

آسمان کے سینے میں بھی بہت درد سمایا ہوا ہے۔ اسے مگر میری طرح چھپا کر رکھنے کی مجبوری نہیں ہے۔ کئی روز سے اکثر دل کھول کر برس رہا ہے۔ خدا جانے رومی لوگوں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی اس بارش میں۔

جامی نے بھی ضد پکڑی تھی رومی کے ساتھ جانے کے لئے۔ اسے بہت مشکل سے سمجھایا کہ دونوں بھائی اکٹھے جانے سے محلے والے شک کریں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ بابا کو کیا عذر پیش کریں گے؟ ان کو تو کسی بھی حال میں جنگ کے بارے میں بتانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پریشانی اور بے قراری کی وجہ سے بلڈ پریشر بڑھ کر سٹروک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ میں بھی کیسے سہوں گی۔

کل رات بھر نیند نہیں آئی۔ ساری رات مائک پر اونچی آواز میں حمد، نعت، درود، مولانا صاحبان کے وعظ و نصیحت سنائی دیتی رہی۔ اس سال عید میلاد النبی بہت زیادہ شان و شوکت، دھوم دھڑکے کے ساتھ منائی جا رہی ہے۔ چار پانچ دن پہلے سے اخبارات، ریڈیو، ٹی وی پر انہماک کے ساتھ اعلان کیا جا رہا ہے۔ اسلام کو گلے پر چھری پھیر کر ذبح کرنے کے بعد اب جوڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

صبح اٹھنے کے بعد آنکھیں جل رہی تھیں، جسم میں بھی سستی محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ نہانے سے سستی دور ہو جائے گی۔ نہا کر ناشتہ کیا لیکن اس کے بعد بھی طبیعت میں تازگی نہیں آئی۔ شریف نے کہا، ''بارش نہیں ہے، چلو لیلیٰ آپا کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں سے پھر نارنداچلے جائیں گے۔''

کہیں پر بھی جانے کو دل نہیں کرتا۔ گھر میں بیٹھے رہنے سے بھی گھٹن ہوتی ہے لہٰذا مرضی کے خلاف ہی نکل پڑی۔ ٹھیک ہے تمام رشتہ داروں کے گھر میں ہی گھومیں گے آج۔ لیلیٰ آپا کے گھر پر تھوڑی دیر بیٹھ کر لیلیٰ آپا

اور اکرام بھائی کو ساتھ لے کر نارندا گئے، عطاء بھائی لوگوں کے گھر۔ وہاں سے پھر قریب ہی نواب سٹریٹ پر کھوکا لوگوں کے گھر گئے۔ وہاں پر کھوکا کی بہن انا اپنے شوہر، لڑکے اور ساس کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ انا لوگوں کا گھر بھی قریب ہی ہے، کیپٹن بازار میں۔ ان کے گھر کے پیچھے بہاریوں کی بستی ہے۔ سامنے ریلوے لائن کے اس پار عوامی لیگ کا دفتر۔ ۲۵ مارچ کی صبح کرفیو ہٹنے پر انا لوگ اپنے بھائی کے گھر آ گئے۔ کھوکا اور انا کی بڑی بہن میرا میرے چچا زاد دیور آنو کی بیوی ہے۔ آنو اور میرا آج کل کراچی میں ہیں۔ ان کے لئے بھی کھوکا لوگ بہت فکر کرتے ہیں، خاص طور پر ان کی امی۔ تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو مختلف خبریں سنا کر ہم رخصت ہوئے۔ واپسی پر اکرام بھائی نے کہا مکو میاں کے گھر پر بھی ذرا حاضری دے آتے ہیں۔ بھیکھو کے بچے، ماں، بہن، سنا ہے سب لوگ واپس آ گئے ہیں۔ ملاقات کر آتے ہیں۔

میں نے کہا، ''بھیکھو کا لڑکا روبل واپس نہیں آیا۔ سنا ہے وہ پہلے ہی راجشاہی ہوتے ہوئے بھارت چلا گیا ہے۔ بھیکھو کی دونوں لڑکیاں لیرا اور ائین مکو میاں کے گھر پر ہیں۔ بولو اور اس کی امی بھی وہیں پر ہیں۔''

مکو چودھری کے گھر پر بولو سے ملاقات نہیں ہوئی، وہ آج صبح کے جہاز سے پولینڈ جانے کے لئے کراچی روانہ ہو گئی ہے البتہ اور بہت سے رشتہ داروں کے ساتھ ملاقات ہوئی.... تنزین، اس کی بیگم ڈولی، بولو کی چھوٹی بہن گولو یعنی مودودہ۔ تنزین، لاڈلی اور گولو کی زبان سے بھی پاک فوج کے تشدد کا تذکرہ سنا، اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہے کسی کی زبان پر۔ کانو بنا گیت نا ہی رے۔

گھر لوٹ کر کمرے میں پاؤں رکھتے ہی چونک گئی۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر ایک بیمار سا دبلا آدمی بیٹھا ہے۔ سر کے بال، داڑھی بالکل سفید ہیں۔ کٹورے میں دبی ہوئی آنکھیں، ماتھے پر گہری لکیریں۔ پہچان نہ سکی محض گھورتی رہی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر کہا ''اسلام علیکم، پہچان نہیں سکیں؟ میں رسول ہوں۔''

شرمندگی کے ساتھ ہنس کر کہا، ''وعلیکم السلام۔ کیسے پہچانتی اتنے دبلے جو ہو گئے ہیں۔ بال، داڑھی سفید کس طرح ہو گئی؟ بیٹھئے نا۔''

رسول صاحب میری ایک شاگرد کے شوہر ہیں۔ شاگردہ سے مراد یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں جب میں سدھ سواری سکول میں پہلی مرتبہ نوکری کرنے گئی تو اس سال وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ صرف ایک سال کے لگ بھگ پڑھایا ہے اسے۔ اسی پر بعد میں جب بھی کبھی اس سے ملاقات ہوئی ''آپا'' کہہ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ شادی کے بعد شوہر کو ساتھ لا کر تعارف کرایا تھا۔ رسول صاحب سرکاری ملازم ہیں۔ تبدیلی والی نوکری ہے۔ مختلف ضلعوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ جب بھی ڈھاکہ آئیں ہماری طرف ضرور آتے ہیں.... مذہبی، پرہیزگار آدمی ہیں۔ منہ پر سیاہ داڑھی، سر پر جناح ٹوپی.... اس حال میں دیکھتی آ رہی ہوں گزشتہ پندرہ سولہ سال سے۔ ایسے آدمی کا یہ کیسا چہرہ بنا ہوا ہے!

میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا، ''عمر بڑھ رہی ہے۔ تھوڑا بہت پہلے ہی سفید ہو رہا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینوں میں یکا یک سارے سفید ہو گئے..... خوف، فکر اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے۔''

میں نے بارق کو چائے کے لئے کہہ کر ان سے کہا، ''سنایئے کیا خبریں ہیں؟ اس مرتبہ تقریباً چار سال کے بعد آئے ہیں۔ کہاں پر پوسٹڈ تھے؟ کس طرح سے گزارا یہ ڈیڑھ مہینہ؟''

برہمن باڑیا میں تبادلہ ہوا تھا، چھ ماہ پہلے۔ ٹھیک ٹھاک ہی گزر رہی تھی۔ کریک ڈاؤن کے بعد بھی وہیں پر تھا۔ پہلے چند دن تک علاقہ جوئی بنگلہ کے قبضے میں ہی تھا۔ اس کے بعد جب طیاروں سے بمباری شروع ہوئی تو خوف کے مارے سب کچھ چھوڑ کر بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ سخت تکلیف میں وقت گزرا۔ کسی بھی گاؤں میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ واقف کار بھی نہیں ہیں تاہم گاؤں کے لوگوں نے اتنا اچھا سلوک کیا کہ کیا بتاؤں۔ کھانے کو دیا، سونے کے لئے جگہ دی.... مگر اس سے کیا ہوتا ہے.... آرمی والے جس طرح گاؤں کے گاؤں جلا رہے تھے، اس ڈر سے وہ لوگ تو خود ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں.... پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہم بھی بھاگتے دوڑتے رہے۔

شریف نے سوال کیا، ''اچھا جن دنوں بمباری ہوئی، یاد ہے؟''

''مارچ کے آخری دنوں میں شائد، تاریخ یاد نہیں ہے۔''

شریف نے کہا، ''ان دنوں ہم اکثر دیکھتے تھے بم بردار طیارے اڑ کر ادھر ادھر جا رہے ہیں۔ مگر شک کرتے تھے کہ جو علاقے اس وقت تک جوئی بنگلہ کے قبضے میں ہیں ان جگہوں پر بمباری کے لئے جا رہے ہیں۔ اچھا، کیا آپ بتا سکیں گے کہ اس علاقے میں کیسی لڑائی ہوئی؟''

رسول نے سر ہلا کر کہا، ''نہیں.... ہمارا مکان جس علاقے میں تھا ادھر بمباری نہیں ہوئی مگر قریب ہی بم کے دھماکے ہوئے۔ ہم نے دھماکوں کی آواز سنی، لوگوں کی چیخ و پکار سنی، آگ کے شعلے دیکھے اور اسی وقت ایک لباس میں قریب ہی ایک گاؤں کی طرف بھاگ گئے۔ جن کے گھر پر پناہ ملی تھی ان سمیت پھر سے بھاگے۔ دو دن کے بعد واپس آ کر دیکھا پورا گاؤں جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ بہت سے لوگ جو بھاگ نہیں سکے تھے ان کی لاشیں پڑی تھیں۔ بدبو کے مارے ٹھہرنا مشکل تھا۔ ایسا دردناک منظر تھا۔''

رسول صاحب سانس لینے کے لئے رکے تو میں نے سوال کر دیا، ''اس کے بعد کیا دوبارہ برہمن باڑیا واپس آئے؟''

''نہیں، برہمن باڑیا اور اس کے قریب کے علاقوں میں اس وقت بھی تقریباً روزانہ بمباری ہو رہی تھی۔ ہم لوگ دوسری طرف ایک اور گاؤں میں چلے گئے، وہاں پر بھی چین نہیں تھا، فوجیوں کی دہشت طاری تھی۔''

''آپ کی فیملی کہاں ہے؟''

''بڑی مشکل سے ڈھاکے میں پہنچے ہیں۔ بھوتر گلی میں میرے ایک رشتہ دار رہتے ہیں، ان کی طرف ٹھہرے ہیں۔ گاؤں گاؤں دوڑتے وقت صالحہ کے پاؤں میں ہڈی کا ٹکڑا چبھا تھا۔ شروع میں کسی نے خیال نہیں کیا۔ تھوڑا بہت درد ہوتا تھا۔ خیال کرتے بھی کیا؟..... فرصت کہاں تھی؟..... ذرا سا چونا اور ہلدی ملا کر لگا دینے سے ٹھیک ہو جاتا.... اتنا بھی کون کرتا! اب سوج کر برا حال ہو گیا ہے۔''

میں بے تاب ہوا بھی، ''بڑی خطرناک بات ہے! ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

''اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ صالحہ کہہ رہی تھی آپا کے پاس جاؤں، ان کی بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ واقفیت ہے۔''

ہمارے محلے ہی میں اچھے سرجن ہیں۔ مین روڈ پر تھوڑی دور ہی پولی کلینک ہے، وہاں پر ڈاکٹر عزیز ہمارے جاننے والے ہیں۔ بہت اچھے سرجن ہیں۔

اسی وقت فون پر عزیز سے بات کر کے رسول سے کہا، ''عزیز کلینک میں ہی ہیں، مریض کو لانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ آپ صالحہ کو لے جایئے۔ میں آدھے گھنٹے کے بعد کلینک جاؤں گی۔ ابھی جاتے وقت داہنی طرف دیکھتے ہوئے جایئے گا، کلینک کا سائن بورڈ نظر آجائے گا۔''

آدھے گھنٹے کے بعد کلینک پر جا کر دیکھا رسول ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ ڈاکٹر عزیز کی بیگم سلطانہ بھی ڈاکٹر ہے۔ پاس پاس دو مکان کرایہ پر لے کر انہوں نے یہ کلینک کھولا ہے۔ ایک مکان میں نیچے ایمرجنسی اور آپریشن تھیٹر ہے اور دوسری منزل پر مریضوں کے لئے کیبن۔ ساتھ والے مکان کی دوسری منزل پر وہ خود رہتے ہیں اور نچلی منزل میں مریضوں کے کیبن۔

سلطانہ اور عزیز دونوں بہت ہنس مکھ ہیں۔ ارد گرد ہمیشہ رونق لگا کر رکھتے ہیں۔ کریک ڈاؤن کے بعد کچھ دن تک گمبھیر ہوئے تھے۔ بیچ میں کافی دن تک ملاقات نہیں ہوئی، آج دیکھ رہی تھی کہ پہلے کی طرح ہی ہنس مکھ نظر آرہے ہیں۔ میں نے کہا، ''لگتا ہے بہت خوش ہو؟''

سلطانہ ہی ہی کر کے ہنسی، ''ہاں باجی، پہلے دھکے سے سنبھل اٹھے ہیں، ہم لوگ تو ڈاکٹر ہیں، اگر دھماکے میں دونوں ٹانگیں اڑ جائیں اور ہاتھ سلامت رہیں تب بھی اسی حالت میں دوسروں کا ٹریٹمنٹ کرنا پڑتا ہے۔ آج کل تو حادثوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خفیہ طور پر علاج کرنے کی ٹینشن بھی زیادہ ہے، اس لئے طبیعت بحال رکھنے کے لئے ہنسنا پڑتا ہے۔''

سلطانہ ویسے بھی زیادہ تر ہنستی رہتی تھی اس لئے ہم اسے پیار سے پگلی کہتے ہیں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ساتھ والے مکان میں لے گئی۔ گیٹ سے اندر داخل ہو کر سیدھا پورچ کے آخری حصے میں گیراج۔ سلطانہ نے اپنے ہاتھوں سے گیراج کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس سے مجھے پیچھے کی طرف لے گئی۔ دیکھا فرش سے تھوڑی سی اونچائی پر دیوار توڑ کر ایک ہاتھ بائی ڈیڑھ ہاتھ سائز کا ایک سوراخ بنایا گیا ہے۔ مکان کے اندر سے بھی ایک چھوٹا سا دروازہ گیراج کے اندر کھلتا ہے یعنی مکان کے اندر سے یہ چھوٹا دروازہ کھول کر گیراج کے اندر داخل ہونے کے بعد گیراج کی پچھلی دیوار کے اس سوراخ سے باہر نکل لیا جائے تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔

''سمجھ گئیں باجی، یہ گاڑی خراب ہے۔ کبھی بھی نکالی نہیں جاتی۔'' اس کے بعد ہی دوبارہ کھی کھی کر کے ہنس کر کہنے لگی، ''اور اگر نکالی جائے تو مصیبت۔ وہ سوراخ نظر آنے لگے گا۔''

عزیز نے ڈانٹا، ''اتنی زیادہ باتیں کیوں کرتی ہو؟'' سلطانہ پہلے کی طرح ہنستے ہنستے میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ کلینک کے اندر لے گئی۔

تھوڑی دیر میں صالحہ اور رسول پہنچ گئے۔ مجھے دیکھ کر صالحہ رونے لگی۔ ''آپا ہمارا سب کچھ لٹ گیا ہے.... فقیر ہو گئے ہیں.... مر گئے ہیں.....''

سلطانہ نے شور مچا دیا۔ ''ارے، ارے..... روتی کیوں ہیں؟ رونے کا کیا ہوا ہے؟ ہنسئے، ہنسئے، ہنسنے سے آدھی بیماری ویسے ہی دور ہو جائے گی۔ آیئے پہلے آپ کو چیک کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ کو کتنی جلدی تندرست کیا جا سکتا ہے۔''

صالحہ کو کلینک میں داخل کرانا پڑا۔ اس کو بیڈ پر لٹا کر اس کے پاس بیٹھی رہی۔ رسول دوبارہ گھر گئے، صالحہ کی کچھ چیزیں لانے کے لئے۔ صالحہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر روتے روتے کہا، ''آپا، پاک فوجی کیا انسان نہیں ہیں؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں۔ ہندوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تو مارا ہی ہے۔ کلمہ پڑھنے والے مسلمانوں کو بھی کافر سمجھ کر مار دیا ہے۔ آپا، گھر دیوار، ساز و سامان سارا کچھ پھینک کر بھاگ آئے ہیں۔ پاؤں زخمی ہو گیا ہے۔ آپا اگر میں مر جاؤں تو میرے بچوں کو کون دیکھے گا؟''

روبیل، لیرا، ائین کی بات یاد آنے پر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے کہا، ''صالحہ اللہ کی بارگاہ میں لاکھ لاکھ شکر ادا کرو کہ تمہارے کنبے کے سب لوگ سلامت ہیں۔ تم میں سے کسی کو آرمی کی گولی نہیں لگی۔ تم بہت خوش قسمت ہو اس لئے تمہارے پاؤں میں صرف ہڈی چبھی ہے، آرمی کی گولی نہیں لگی۔ معمولی آپریشن کے بعد تمہارا پاؤں ٹھیک ہو جائے گا۔ سامان گیا ہے تو اس کے لئے دکھ کیوں کرتی ہو، اگر جان چلی جاتی تو.....؟ کیا دوبارہ واپس مل سکتی تھی؟''

اس کو بھیکھو، ملی اور ان کے تین نابالغ بچوں کے بارے میں بتایا۔ سن کر صالحہ ایک مرتبہ پھر سے روئی۔ ''بس آپا مجھے اب کوئی دکھ نہیں ہے۔''

۱۰ مئی ۱۹۷۱ء بروز پیر

کافی دنوں سے باغ کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ آج صبح ناشتہ کر کے باغ میں گئی۔ باغ میں کافی سارے ہائی بریڈ، ٹی۔ روز کے پودے ہیں۔ اس ذات کے گلاب کے پودوں کی بہت دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے..... جو گزشتہ دو مہینوں سے نہیں ہوئی تھی۔ کھرپی اٹھا کر کام شروع کرنے سے پہلے پودوں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ مکھن کی رنگت کا ''پیس''، یعنی ''امن'' سیاہی مائل میرون ''بونی پرنس'' اور ''اینا ہارکنس'' پھیکے اور گاڑھے رنگ کا ''سیمون'' اور ''لیونڈر''۔ پیلے رنگ کا ''بکانیر'' اور سفید ''پامکلی''۔

بونی پرنس کی وہ ادھ کھلی کلی اب تک میرے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پھول دانی میں رکھی ہے۔ ویسے اب وہ کلی نہیں رہی، پہلے پوری طرح کھل کے پھول بنی اور اب وہ پھول بھی تقریباً جھڑ چکا ہے۔ پیس کے پودے پر ایک کلی آئی ہے تاہم پورے ملک سے ''پیس'' روٹھا ہوا ہے۔

باغ رکھنا ایک نشہ ہے۔ اس نشے میں درد و غم تھوڑی دیر کے لئے بھلا دینا ممکن ہوتا ہے۔ گزشتہ کئی مہینوں سے اس نشے کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ بری طرح سے دُکھے ہوئے دل کو مصروف رکھنے کے لئے ہی شاید اس نشے کے بارے میں اب یاد آیا۔

۱۱ مئی ۱۹۷۱ء بروز منگل

دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے تو اچانک زور سے گھنٹی بجی۔ بجی تو بجتی ہی چلی گئی، رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ کون شخص ہے جو گھنٹی پر انگلی دبا کر کھڑا ہو گیا ہے؟ میں نے غصے میں چیخ کر کہا، ''اے بارق ذرا دیکھ تو کون بدتمیز اس طرح سے گھنٹی دبا کر کھڑا ہے۔''

بارق نے دروازہ کھولا تو فوراً ہی رومی اندر داخل ہوا۔ چہرے پر چونکا دینے والی شرارتی ہنسی ناچ رہی ہے۔ میں خوشی کے مارے دوبارہ چیخ پڑی، ''رومی تم؟''

رومی نے کندھے پر سے بیگ اتار کر میز پر بیٹھتے ہوئے کہا، ''ہاں امی، واپس آنا پڑا۔''

اتنے میں بارق نے ایک پلیٹ لا کر رومی کے سامنے رکھی۔ اسے کہنا بھی نہیں پڑا۔ رومی نے پلیٹ میں بھات (ابلے چاول) نکالتے بارق کی طرف دیکھ کر کہا، ''بارق، باورچی خانے سے دو سوکھی مرچیں سینک کر لانا۔ دیکھنا زیادہ نہ جل جائیں..... ہلکی آنچ پر احتیاط سے آہستہ آہستہ سینکنا..... سمجھ گئے؟''

بارق کے جانے کے بعد رومی نے نیچی آواز میں کہا، ''ہم نے جس رستے سے جانا تھا اس پر مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں جن کے ساتھ جا رہا تھا انہیں دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا لہٰذا کچھ دن انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

رومی کے چہرے پر ہنسی نہیں ہے مگر میری ہنسی کون روکے۔

کھانے کے بعد ہم سب نے بیڈ روم میں جا کر دروزہ بند کر کے رومی کے جنگ پر نہ جا سکنے کی کہانی سنی۔ منو اور سیرت کے اصل نام بتاتے ہوئے بھی رومی نے آج اعتراض نہیں کیا۔ منو یعنی منیر العالم مختصراً منو اور عشراق۔ عشراق یونیورسٹی میں آنرز کا طالب علم ہے اور منو ایم اے کا۔ دونوں بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ ہیں۔ منور یڈیو پر گانے بھی گاتا ہے۔

منو اور عشراق کے علاوہ رومی لوگوں کے گروہ میں تھے کمال لدھانی، پرتاب ہاجرہ، بافوا کے کچھ ہندو ملازمین، فنکار اور ان کے عزیز رشتہ دار، اور ایک زخمی حوالدار۔

صدر گھاٹ سے بوڑھی گنگا پار کر کے رومی لوگ تقریباً سات آٹھ میل پیدل چل کر گئے۔ زخمی حوالدار کو سہارا دے کر لے جانا پڑ رہا تھا۔ اس طرح بہت مشکل سے وہ دھلیسواری کے کنارے تک پہنچے۔ دھلیسواری پار

لر کے سید پور، وہاں سے آٹھ میل دور سری نگر، سری نگر تھانہ اس وقت تک آزاد تھا۔ وہاں پر روزانہ ڈھاکہ سے لاتعداد لوگ عزیز رشتہ داروں کو لے کر پناہ حاصل کرنے جا رہے تھے۔ منو لوگ سپیڈ بوٹ پر سید پور سے سری نگر پہنچے شام کے بعد۔ وہاں سے آدھا میل دور ناگر بھاگ کے نام سے ایک گاؤں میں ڈاکٹر سوکمار بردھن رہتے ہیں، رومی کے گروہ نے یہ رات ڈاکٹر صاحب کے ہاں گزاری۔ اگلے روز آگے بڑھنے کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ سری نگر سے کشتی کے ذریعے برڈار کی طرف جانا تھا مگر لوگوں کی زبانی خبر ملی کہ پاک آرمی دھلیسواری پار کر کے سید پور سے ہوتے ہوئے بکرم پور کے علاقے میں داخل ہو چکی ہے لہٰذا سب لوگ مل کر سوچ بچار کرنے بیٹھے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ناگر بھاگ سے آدھے میل سے بھی کم فاصلے پر ایک اور گاؤں ہے، بسائل بھوگ، وہاں پر صحافی فیض احمد لوگوں کا گھر ہے۔ ۲۵ مارچ کی رات کو پریس کلب میں آرمی کی گولیوں سے ان کی بائیں ران زخمی ہو گئی تھی۔ ابھی تک زخم نہیں بھرا۔ کمال لدھانی سمیت کچھ لوگ فیض احمد کے پاس گئے، مشورے کے لئے۔ تفصیلی گفتگو کے بعد طے ہو کہ قبل اس کے کہ پاک آرمی پورے علاقے کا گھیراؤ کر لے جس طرح بھی ممکن ہو ان کے گروہ کو وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اسی فیصلے کے مطابق ۱۵ تاریخ کے آخری پہر میں فیض احمد سمیت ان کے مکان سے تمام لوگ کومیلا ضلع میں سری رامپور کی نیت سے روانہ ہوئے۔ اس طرف سے بارڈر کراس کرنے کا راستہ ہے مگر راستے میں خبر ملی کہ سری رام پور پر آرمی نے قبضہ کر لیا ہے لہٰذا انہوں نے سمت بدل کر ڈھاکہ کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ سفر کا یہ حصہ مصائب سے بھرپور تھا کیونکہ سید پور پر اس وقت تک آرمی قبضہ حاصل کر چکی تھی۔ اس روز دوپہر کے بعد سے آندھی کے ساتھ بارش بھی خوب ہوئی۔ رومی لوگ بہت گھوم کر، کبھی آگے کی طرف بڑھ کر، کبھی پیچھے ہٹ کر، کبھی سپیڈ بوٹ پر، کبھی ٹوٹی پھوٹی بس پر، کبھی کیچڑ والی پگڈنڈی پر، پیدل چل کر، جان ہتھیلی پر رکھ کر، رات کے نو بجے کے قریب ڈھاکہ پہنچے۔ رات سب نے اکٹھے کمال لدھانی کے گھر پر گزاری۔ آج صبح سارے لوگ اکٹھے گھر سے نہیں نکلے۔ دو دو تین افراد وقفے وقفے سے نکلے تاکہ محلے والے شک نہ کریں۔ وہاں سے بھی رومی سیدھا اپنے گھر نہیں آیا، دوپہر تک عشراق کے ساتھ رہا اس کے بعد آیا ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۷۱ء بروز بدھ

دو دن ہوئے ہیں جامی کا سکول کھلا ہے۔ حکومت نے اب سکول کالج زبردستی کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یکم تاریخ کو پرائمری سکول کھولنے کا حکم صادر ہوا ہے، نو تاریخ کو مڈل سکول۔

جامی سکول نہیں جا رہا ہے۔ جامی، رومی، شریف اور میں نے مل کر مشورہ کیا تو اس فیصلے پر پہنچے کہ سکول کھلنے کے بعد بھی سکول جانا درست نہیں ہوگا۔ ملک میں کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں چل رہا ہے۔ ملک میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ شہریوں پر پاک فوج کے مظالم کا سٹیم رولر چل رہا ہے۔ ان حالات میں کسی بھی طالب علم کو نہیں چاہئے کہ وہ کتابیں کاپیاں بغل میں دبا کر سکول جائے۔

جامی ویسے گھر پر پڑھائی کر رہا ہے۔ رومی جتنے دن ہے اس کی مدد کرے گا۔ اس کے بعد شریف اور میں جتنا ممکن ہو دیکھ بھال کریں گے۔

جامی نے اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ مل کر طے کیا ہے کہ وہ لوگ مل بیٹھ کر ایک دوسرے کے ساتھ مشورے کے ذریعے پڑھائی جاری رکھیں گے۔ خاصا بہتر انتظام ہے، پڑھائی بھی ہوگی اور وقت بھی اچھا کٹ جائے گا۔

۱۶ مئی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

روزانہ تین چار اخبار نہ دیکھوں تو جی نہیں بھرتا۔ جھوٹ موٹ بناوٹی خبروں کے بیچ میں سے اصل خبر نکالنے میں مجھے خوب مزا آتا ہے۔ جیسے پرسوں کے اخبار میں لکھا تھا: ''بے'' علاقے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ریٹائرڈ کرنل ایم اے جی عثمانی کو ۲۰ مئی کے اندر ایک نمبر سیکٹر کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سامنے حاضر ہونے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ کچھ روز سے آزاد بنگلہ بے تار سے مکتی باہنی کے جن سربراہ اے جی ایم عثمانی کا نام سنائی دے رہا ہے۔ انہی کی ''تائید'' میں مشرقی پاکستان کے اخبار میں یہ خبر شائع کی گئی ہے۔

کاموں پر جوائن کرنے کے سلسلے میں فوجی احکامات کی وضاحتیں اخباروں میں اب تک چھاپی جا رہی ہیں۔ یوں تاثر دیا جا رہا ہے جیسے مشرقی پاکستان کے تمام لوگ گروہ در گروہ دفتروں، کارخانوں وغیرہ میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہو کر حسب معمول کام چلا رہے ہیں۔ تصویروں کے ساتھ ایسی بہت سی خبریں چھاپی جا رہی ہیں۔ اگر لوگ کاموں پر جا ہی رہے ہیں تو پھر اتنے فوجی احکامات اور ان کی تشریحوں کی کیا ضرورت ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ عوام کے ایک چوتھائی حصے کو انہوں نے مار ڈالا ہے۔ ایک چوتھائی حصہ سرحد کے اس پار چلا گیا ہے اور ایک چوتھائی حصہ خوف کے مارے دیہات اور قصبوں میں دبک کر بیٹھا ہے۔ باقی کے عوام میں سے چند لوگ وہ ہیں جو دفتروں اور کارخانوں میں جا رہے ہیں۔

چند روز پہلے شریف خبر لائے کہ ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' کی چند کاپیاں، کسی غیر ملکی کے بریف کیس میں، کسٹمز والوں کی نظر بچا کر، ڈھاکہ پہنچائی گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں فوجی جنتا کی بربریت کی کافی خبریں ان شماروں میں چھپی ہیں۔ شریف کوشش کر رہے ہیں کہ ان رسالوں کی کوئی کاپی مل جائے۔ ہم لوگ بھی ایک نظر دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں۔ بہت چھپا کر بہت احتیاط کے ساتھ وہ رسالے مختلف ہاتھوں سے گزر رہے ہیں، کون جانتا ہے کہ ہماری باری آنے میں کتنے دن لگ جائیں۔

کرفیو کا مقررہ وقت اور بھی گھٹا دیا گیا ہے۔ آج کل رات کے بارہ بجے سے سحر چار بجے تک کرفیو لاگو رہتا ہے۔

۱۷ مئی ۱۹۷۱ء بروز پیر

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نامور اور عہدیدار اشخاص کو حاضر کر کے بھی شائد حکومت کا مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے چنانچہ دانشوروں اور فنکاروں کو مجبور کر کے ان کے بیانات اخباروں میں شائع کرنے کا گندہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے۔ آج کے اخبار میں پچپن دانشوروں اور فنکاروں کے نام کے ساتھ ایک بیان شائع ہوا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کوئی ٹیچر، ریڈیو، ٹیلی وژن کے کوئی عہدیدار یا کسی بھی فنکار کا نام فہرست سے باہر نہیں رکھا گیا۔ ان میں سے کچھ حضرات نے مرضی اور خوشی کے ساتھ دستخط کر دیئے ہوں گے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زیادہ تر افراد سے سنگین کی نوک پر دستخط حاصل کئے گئے ہیں اور جس بیان کو ان کے نام سے منسلک کیا گیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کی پوری عبارت پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ آج صبح اخبار میں شائع شدہ اس بیان کو پہلی مرتبہ پڑھ کر وہ کچھ دیر تک تو ہکا بکا ہو کر بیٹھے رہ جائیں گے پھر سوچیں گے اے دھرتی! اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ، جانے تیرے کس ذہین فرزند نے ترتیب دیا ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ اس عیار کو ایک نظر دیکھوں!

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج صبح سے شام تک مہمانوں کا آنا جانا لگا رہا۔ شکر ہے کہ دو روز پہلے قاسم لوٹ آیا ہے۔ چار دن کی چھٹی پر جا کر چھبیس دن گزار آیا ہے۔ پھر بھی آیا تو ہے۔

صبح پڑوسی ہشام الدین صاحب کی دونوں بڑی بیٹیاں کھکی اور کھکومنی آئیں۔ وہ لوگ گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ ان کی قسمت اچھی ہے، ملٹری کے حملے سے جان بچانے کے لئے دوڑنا نہیں پڑا ہے۔ مکمل اجنبی گاؤں کے لوگوں نے بہت دیکھ بھال کی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا رویہ اس نوعیت کا تھا کہ شہر کے لوگ گاؤں میں تو زیادہ نہیں آتے، مصیبت میں مبتلا ہو کر آ رہے ہیں، لہٰذا ان کی خوب خدمت کرنی چاہئے۔ کھکی نے کہا، ''کیا بتاؤں خالہ بہت سے گاؤں میں سڑک پر ضعیف لوگ کچھ کچھ فاصلے پر گھڑے بھر کر پانی لے کر بیٹھ رہے ہیں تا کہ راستہ چلتے لوگ اپنی پیاس بجھا سکیں۔ بہت سے گھروں میں گہری رات کو مرغا ذبح کر کے مسافروں کو کھلایا ہے، تاکوں پر رکھے ہوئے تکیے اور چادر نکال کر سونے کے لئے جگہ دی ہے۔

واقعی ان کی تقدیر اچھی ہے۔ سب لوگوں کو ایسے میزبان نہیں ملے۔ میزبان مل بھی جائیں تو فوج کی گولیوں سے نجات نہیں ملتی۔

کھکومنی لوگوں کے رہتے میں دیبا آئی۔ گھنٹہ بھر بات چیت کر کے چلی گئی۔

دیبا کے جانے کے بعد نہانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اتنے میں رینو اور چمو اچانک آن دھمکے۔ وہ لوگ ڈھائی تین بجے تک رکے۔ شریف دو بجے دفتر سے واپس آئے تو سب لوگ کھانا کھانے بیٹھے۔ بہت اصرار کرنے پر رینو ہمارے ساتھ شامل ہوئی مگر چمو کو کھانے پر کسی بھی طرح راضی نہیں کیا جا سکا۔ اس نے صرف دو مرتبہ دو کپ چائے پی۔

ان کے جانے کے بعد ساڑھے تین بجے ابو اور نزو آئے۔ کل شام کو نیو مارکیٹ میں ابو سے ملاقات ہوئی تھی..... راجشاہی سے ٹوٹ پڑ دھا کہ آئے ہیں، اسی وقت انہیں گھر پر آنے کے لئے کہا تھا تا کہ راجشاہی کی کچھ خبریں معلوم کی جا سکیں۔ اس ماہ کے شروع میں ڈاکٹر ابو سید سجاد حسین کے پاس جا کر راجشاہی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکی تھی۔ عثمان غنی صاحب نے ایک روز فون پر بتایا کہ ڈاکٹر سجاد حسین صاحب راجشاہی سے ڈھاکہ آئے ہیں۔ ڈاکٹر حسین راجشاہی یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر ہیں۔ ان کے ساتھ میرا مختصر تعارف ہے پھر بھی

سرغنی سے کہا، ''سر مجھے ذرا ان کا پتہ لکھوا دیجئے میں ان سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔'' عثمان غنی صاحب تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ..... مگر زیادہ تقاضہ نہ کرنا۔''

سمجھ گئی..... مگر راجشاہی میں ہمارے بہت سے عزیز و اقارب ہیں لہٰذا راجشاہی کے حالات کے بارے میں جاننے کے لئے بیتاب تھی۔ ڈاکٹر حسین نے سنجیدہ لہجے میں مختصراً کہا کہ راجشاہی میں سب کچھ حسب معمول ہے۔ شروع میں کچھ شر پسند عناصر نے عام لوگوں کی زندگی کو اگرچہ پریشان کن کر ڈالا تھا مگر اب سب کچھ پرامن طریقے پر چل رہا ہے۔ سرغنی کی ہدایت کو یاد رکھتے ہوئے ڈاکٹر حسین سے زیادہ سوال نہیں کئے۔

اب ابو کو سامنے پا کر دل کا ارمان مٹانے کے لئے سوالات کرنے لگی۔

''راجشاہی تو شروع میں جوئی بنگلہ کے قبضے میں تھا..... ہے نا؟''

''ہاں..... مارچ کے آخری چند دنوں کے دوران ای بی آر، ای پی آر اور پولیس کے ساتھ پاک آرمی کی شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ان کے ساتھ علاقے کے بہت لوگ لڑائی میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد پاک آرمی چھاؤنی کی حدود میں ہی محصور ہو گئی۔ مکتی باہنی نے چھاؤنی کے چاروں طرف خندق کھود کر اس طرح ان پر ناکہ ڈالا کہ ان کے لئے راشن خریدنے کے لئے باہر آنے کا بھی راستہ نہیں رہا۔ مکتی باہنی کا منصوبہ تھا کہ پاک آرمی کو فاقے کروا کر کمزور کر دیا جائے۔''

''پاک آرمی بس خاموشی سے بیٹھی رہی؟ گولیاں نہیں چلاتے تھے؟''

''ہاں چلاتے تھے مگر اس سے مکتی باہنی کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے بعد ڈھاکہ سے طیاروں نے آ کر جب بمباری شروع کر دی تو اس سے مسئلہ پیچیدہ ہو گیا۔''

''کس تاریخ کو بمباری شروع ہوئی؟''

''تاریخ تو مجھے یاد نہیں ہے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں شائد۔''

''تمہارے محلے میں بمباری ہوئی؟''

''نہیں ہم لوگ تھے مالوپاڑا میں۔ یہ جگہ شہر کے وسط میں ہے۔ پہلے چھاؤنی کی طرف بمباری ہوئی جو شہر سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے ہی دن بمباری کی خبر ملتے ہی ہم لوگ شہر چھوڑ کر ۱۲،۱۴ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں چلے گئے۔ ہم جس دوست کے ساتھ گئے تھے اسی گاؤں میں ان کا آبائی گھر ہے۔

''گاؤں میں کتنے دن رکے؟''

''تقریباً ایک ماہ۔ بہت سے لوگ دریا پار کر کے سرحد کے اس پار جا رہے تھے مگر میرا چھوٹا بچہ اس وقت صرف دو ماہ کا تھا۔ اس کو ساتھ لے کر دریا پار کرنا مشکل تھا لہٰذا دوست کے ساتھ اس کے گاؤں چلے گئے۔ بعد میں سننے میں آیا کہ مکتی باہنی پر بمباری کر کے پاک آرمی نے ہیلی کاپٹر سے فوجیوں کے لئے کھانا اتارا تھا۔ مزید دو چار روز تاخیر ہوتی تو فوجی بھوک کے مارے فوت ہونا شروع ہو جاتے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ ڈھاکہ سے فوج آ رہی ہے راجشاہی پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے، تب اور زیادہ لوگ شہر چھوڑ کر گاؤں کی طرف بھاگے۔

''راجشاہی میں آرمی کب داخل ہوئی؟''

''ٹھیک بتا نہیں سکتا۔ اندازا ہے ۱۲،۱۳ تاریخ کو۔''

''تم لوگوں نے راجشاہی میں واپس آ کر کیا دیکھا؟''

''دیکھا کہ سارا شہر درہم برہم پڑا ہے۔ بہت سی جگہیں نذر آتش ہو چکی ہیں۔ سنا ہے کہ بہت سے لوگوں کو گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔''

''شہر میں واپس آنے کے بعد آفس جوائن کیا؟''

''میرا دفتر اور گھر ایک ہی بلڈنگ میں ہے۔ نچلی منزل میں آفس اور اوپر کی منزل پر رہائش گاہ۔ سو کیا کرتا.....؟''

''ظاہر ہے۔ تو آفس جوائن کرنے پر آپ کو کسی پریشانی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟''

''نہیں.... اصل میں سرکاری دفتر تو ہے نہیں۔ شائد اسی وجہ سے کسی نے پریشان نہیں کیا۔''

ابو جیون بیمہ کمپنی میں نوکری کرتا ہے۔

''ڈھاکہ کس پر آئے؟''

''کوچ پر۔''

''رستے میں کیسے حالات تھے؟''

''راجشاہی سے ڈھاکہ تک پوری سڑک کے دونوں طرف کے گاؤں جلاتے ہوئے گئے ہیں۔ جو لوگ بھاگ نہیں سکے گولیوں سے ہلاک ہوئے ہیں۔ گائے بکریوں کا صفایا ہو گیا ہے۔''

شریف نے کہا، ''راجشاہی کے سرحدی علاقوں میں آزادی کی جنگ کیسی چل رہی ہے؟ خبریں ملتی ہیں کچھ؟''

''ملتی ہیں ماموں صرف راجشاہی کے بارڈر پر ہی نہیں پورے ملک کے سرحدی علاقوں میں جنگ جاری ہے۔''

میں نے کہا، ''ملک کے اندر بھی چھاپہ مار کاروائیاں شروع ہو چکی ہیں۔''

شریف نے کہا، ''ہم لوگ جو سرحد عبور کر کے لڑائی میں شمولیت اختیار نہیں کر سکے، ملک کے اندر بیٹھ کر بھی بہت سی ذمہ داریاں نبھا سکتے ہیں۔ تم چھوٹے بچے کی وجہ سے دریا کے اس پار نہیں جا سکے اس بات پر تم نے افسوس کا اظہار کیا ہے مگر افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم راجشاہی میں گھر پر بیٹھ کر بھی جنگ میں حصہ لے سکتے ہو۔''

ابو سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا، شہر میں جو گوریلے آئیں انہیں چھپا کر پناہ دینا، کھانا کھلانا، ایک مقام سے دوسری جگہ تک انفارمیشن پہنچا دینا وغیرہ..... ممکن ہو تو روپیہ پیسہ اکٹھا کر کے ان کی مدد کرو۔''

ابو نے بہت نرم لہجے میں کہا، ''میں آپ لوگوں کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا..... جس حد تک بھی ممکن ہوا۔''

۲۳ مئی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

ملک کے دوسرے اضلاع سے آئے ہوئے جتنے زیادہ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے اتنی زیادہ افسوسناک خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ لڑکیوں پر تشدد اور بے حرمتی کی باتیں، خاص طور پر ان کے باپ، شوہر اور اولاد کے سامنے ان کی عزت پامال کر کے مار ڈالنے کی خبریں زیادہ مل رہی ہیں۔

اب تو اکثر پاکستانی فوج اور ان کے بہاری تابعدار جب دل چاہے لوگوں کے گھروں میں گھس کر روپیہ، پیسہ، زیورات اور قیمتی اشیاء لوٹ مار کر لے جاتے ہیں۔ دکانوں میں گھس کر جو کچھ پسند آئے لے جاتے ہیں۔ لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالنے جتنی آسانی سے یہ سارا کئے جا رہے ہیں۔ کسی بھی گھر میں داخل ہو کر رائفل بلند کر کے گھر کے افراد کو قطار میں کھڑا کر دیا جائے تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ گولیاں خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی کو مارنے کی بھی نہیں۔ خوف کے مارے روپیہ، پیسہ، سونا، چاندی سب کچھ نکال کر سامنے ڈال دیتے ہیں۔ بہت سے گھروں کے افراد خود سے سونا، دانہ، روپے، پیسہ نکال کر لے آتے ہیں..... یہ روپیہ، پیسہ، دھن، زیورات لے جاؤ مگر خدا کے واسطے جان سے مت مارو۔ سنا ہے ڈھاکے کے کچھ علاقوں میں بھی ایسے واقعات پیش آ رہے ہیں اگرچہ ہمارے جاننے والوں میں سے کسی کے ساتھ ابھی ایسا نہیں ہوا۔

میرے زیورات کوئی اتنے زیادہ نہیں ہیں مگر جتنے بھی ہیں، اگر ایک بار لٹ جائیں تو زندگی میں دوبارہ بنا نہیں سکوں گی۔ امی بھی سخت پریشان ہیں۔ انہوں نے اپنے زیورات دونوں لڑکوں کی دلہنوں کو دینے کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ بیٹے ملک سے باہر ہیں۔ کب واپس آ کر شادیاں کریں اس کا کوئی ٹھیک ٹھکانہ نہیں ہے۔ مگر زیورات کو تو حفاظت سے رکھنا ضروری ہے۔

بہت سوچ بچار کر طے کیا کہ صحن میں گڑھا کھود کر دبا دیا جائے۔ سننے میں آیا ہے کہ بہت سے گھروں میں وہ صحن کھود کر تلاشی لیتے ہیں۔ گاؤں کے کچے گھروں کے فرش تک کھود کر دیکھتے ہیں۔ رومی نے کہا، ''چیزیں مٹی میں دبا کر اوپر سے لیمو کا پودا لگا دو۔'' مگر چھوٹا پودا دیکھ کر بھی وہ شک کر سکتے ہیں۔ کافی بڑا سا پودا لانا ہوگا تاکہ دیکھنے میں لگے کہ دو تین سال پرانا پودا ہے۔

''بڑا پودا اکھاڑ کر لانے سے بچے گا بھی؟''

''اردگرد کافی مٹی سمیت اکھاڑنا ہوگا تاکہ جڑیں نہ کٹ جائیں۔''

یہی طے ہوا۔شریف کے واقف کار کی نرسری سے لیموں کا ایک بڑا سا پودا منگوانے کا انتظام کیا گیا۔
میں نے کہا، چلو امی کے گھر جائیں۔گھنوں کو چھپانے کا بندوبست ہو گیا ہے انہیں بتا کر آتے ہیں۔"
امی کے گھر پہنچ کر دیکھا وہ باہر جانے کے لئے تیار ہیں۔"کیا ہوا؟" راجشاہی سے خبر ملی ہے کہ تارا کے بھائی کو بہاریوں نے مار دیا ہے۔تارا امی کے ماموں زاد بھائی کی لڑکی ہے، اسد گیٹ کے پاس نیو کالونی میں رہتی ہے۔"چلئے آپ کو تارا کے گھر اتار آتے ہیں۔ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے مل لیں گے ان سے۔"

نیو کالونی میں ہم تھوڑی دیر بیٹھے۔امی وہاں پر کچھ اور وقت گزارنا چاہتی تھیں۔ہم وہاں سے نکل کر راجر باغ کے علاقے میں آؤٹر سرکلر روڈ پر منان اور نور جہان کے گھر گئے۔انجینئر منان شریف کے دوست اور کولیگ ہیں۔کریک ڈاؤن سے پہلے منان کے چچازاد بھائی کی شادی پر چٹاگانگ جا کر بچوں سمیت وہاں پر اٹک گئے تھے۔ایک ہفتہ ہوا ہے ڈھاکہ واپس آئے ہیں۔ان کے گھر جا کر نور جہان اور منان کی زبانی ان کی زندگی کے کچھ اذیت ناک واقعات سنے۔

چٹاگانگ اور آر نظام روڈ پر انجینئرز آفس اور ریسٹ ہاؤس ہے۔منا اپنے کنبے کے ساتھ وہیں پر ٹھہرے تھے۔۲۶ تاریخ کو صبح کو انہوں نے بائی روڈ ڈھاکہ آنا تھا مگر ۲۵ مارچ کی رات کو منان کے ایک دوست انجینئر زمان صاحب نے فون پر اپنی بیوی سے بات کی تو انہیں ڈھاکہ کی ہنگامی صورتحال کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ان سے اطلاع ملنے کے بعد انہیں کریک ڈاؤن کا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ مجبوراً چٹاگانگ ہی میں رک گئے۔
۲۶ اور ۲۷ مارچ کو چٹاگانگ کی سڑکوں پر نکلنا ممکن ہوا تھا۔اگرچہ ۲۶ تاریخ کی رات کو ٹریسر کی روشنی نظر آئی تھی اور گولیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔کینٹونمنٹ ان کے ریسٹ ہاؤس سے زیادہ دور نہیں تھا۔۲۸ تاریخ کی صبح کو مسئلہ سنگین ہوا۔ریسٹ ہاؤس کے پیچھے پرابر تک سنگھ کی پہاڑی ہے۔سامنے پولیس لائین کی پہاڑی۔اس روز صبح اچانک پرابر تک سنگھ کی پہاڑی پر پوزیشن سنبھال کر پاکستانی فوج نے پولیس لائین کی طرف گولیاں چلانا شروع کر دیں۔پولیس بھی جوابی گولی چلاتی رہی۔نور جہان نے کہا،"اتنی خوفناک صورتحال تھی آپا۔ریسٹ ہاؤس کے بالکل اوپر سے گولیاں چل رہی تھیں یوں لگ رہا تھا کہ بس اب خیر نہیں، بال بچوں سمیت ختم ہو جائیں گے۔سب لوگ بھاگ کر دوسری منزل سے اتر کر نیچے آفس کے کمرے میں فرش پر اوندھے لیٹ گئے۔بیچ بیچ میں اٹھ کر روشن دان سے جھانک کر باہر دیکھتے تھے۔دوپہر کے دو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔دو بجے کے بعد گولیاں چلنی بند ہوئیں۔اس کے بعد کی آوازوں سے یوں لگا جیسے فوجی پہاڑی سے اتر کر گھروں پر ہلا بول کر چڑھائی کر کے دروازے توڑ کر سب کو گولیوں سے بھون کر دم لیں گے۔قسمت اچھی تھی وہ نہیں آئے۔تین بجے کے قریب جب خاموشی چھا گئی، ہم نے طے کیا کہ یہاں پر مزید ٹھہرنا محفوظ نہیں ہے جیسے بھی ممکن ہو نندن کانن میں بانکا صاحب کے گھر پر جا کر پناہ لینی ہوگی۔مین روڈ سے جانا محفوظ نہیں تھا لہٰذا طے ہوا کہ داہنی طرف ایلیٹ پینٹ کے مالک کے گھر کے بازو میں جو گلی کا راستہ ہے ادھر سے چھپتے چھپاتے جائیں گے۔تھوڑی دور جاتے ہی دیکھا ایک برآمدے پر دو میاں بیوی کھڑے ہیں۔ہمیں دیکھ کر وہ گلی میں اتر آئے۔ہم اس راستے سے نندن کانن جانا چاہ رہے ہیں سن

کر بولے، ''دیوانے تو نہیں ہو گئے؟ نندن کانن تک پہنچ ہی نہیں پاؤ گے۔ پاک فوج ہر طرف گشت کر رہی ہے۔ ایک بار نظر آ گئے تو بچت نہیں ہو گی بہتر ہے کہ ہمارے گھر رک جاؤ۔ دو اجنبی میاں بیوی کی اس خوش سلوکی پر ہم ممنون ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام عبدالحئی ہے۔ ہماری زبیدہ خانم آپا کے بھائی ہیں۔

ان کے گھر پر چار پانچ دن تک رکے۔ اس کے بعد ۳۰ تاریخ دوپہر کے بعد سے بمباری شروع ہوئی۔ ہم نے بھی گھر سے دور فضا میں اڑتے ہوئے طیاروں کو واضح طور پر دیکھا۔ ان کے گھر پر چار پانچ دن تک رکنے کے بعد ہم ریسٹ ہاؤس میں لوٹ آئے۔

''آزاد بنگلہ بے تار سنتے تھے؟ پہلی مرتبہ کب سنا تھا؟''

''۲۶ تاریخ کی رات کو ہی سنا تھا۔ زمان صاحب کے پاس ریڈیو تھا۔ ناب گھماتے گھماتے اچانک مل گیا۔ اس کے بعد سے روزانہ سنتے تھے۔ گھر پر بیٹھے رہنے کے علاوہ ہمیں اور کوئی کام تو تھا نہیں زیادہ تر ریڈیو سنتے رہتے تھے..... آکاش بانی، بی بی سی، ریڈیو آسٹریلیا، آزاد بنگلہ بے تار، سارے سنٹر سنتے تھے البتہ ۳۰ مارچ کی بمباری کے بعد دو تین روز تک آزاد بنگلہ بے تار سنائی نہیں دیا۔ جب چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے درمیان مسافر طیارے چلنا شروع ہوئے تو سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دو ہفتوں کی کوشش کے بعد سیٹ ملنے پر گزشتہ ہفتے ڈھاکہ آئے ہیں۔ ان دو ہفتوں میں کیا کیا جانتی ہیں؟ صبح کرفیو میں وقفہ شروع ہونے کے بعد ناشتہ کر کے بچوں کو ساتھ لے کر سامان اٹھا کر ائیر پورٹ جاتے تھے۔ لوٹتے تھے شام کو کرفیو لاگو ہونے سے پہلے۔''

''سچ؟ دوپہر کا کھانا پینا؟''

''پہلے دن کے تجربے کے بعد سے سینڈوچ اور تھرمس بھر کر چائے، پانی وغیرہ ساتھ لے کر جاتے تھے۔''

''جہاز پر فوج کے آدمیوں کو پہلے سیٹ ملتی تھی۔ چند ایک سیٹیں سویلینز کو بھی دیتے تھے۔ ائیر پورٹ پر قطار بنا کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ کس روز سویلینز کو کتنی سیٹیں ملتی ہیں، اس کا کوئی حساب مقرر نہیں تھا اور قطار تھی طویل۔''

پٹنگلہ ائیر پورٹ کے لاؤنج پر بیٹھے انتظار کرتے وقت ایک ہیبت ناک منظر نور جہان کے علاوہ یقیناً دوسروں نے بھی دیکھا ہو گا۔ سب لوگ دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کرتے تھے۔ بتاتے ہوئے نور جہان اب بھی سہم رہی تھی..... ''ایک دن اچانک غور کیا کہ خاصی دور، ایک دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے بہت سے لوگوں کو ٹرک سے اتار کر قطار میں اندر لے جایا جا رہا ہے۔ ٹرک کے سامنے مشین گن تانک کر سپاہی کھڑے ہیں۔ دوسری منزل کی کھڑکی کا پٹ کھلا تھا۔ کھڑکی سے نظر آیا کمرے کے اندر پاک فوجی چاقوؤں سے بے چاروں کی پٹائی کر رہے ہیں۔''

''واقعی، چیخوں کی آوز نہیں سنی؟''

''بلڈنگ خاصی دور تھی۔ درمیان میں کھلا میدان ہونے کی وجہ سے دور سے بھی نظر آ جاتا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے کی ضرورت بھی وہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ دن کے وقت سورج کی روشنی میں اتنی دور سے بھی کمرے کے اندر تک دِکھتا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے چیخیں سنائی نہیں دیتی تھیں، مگر چاقو بک کے اٹھنے اور گرنے کا منظر واضح تھا۔

''روزانہ ٹرکوں پر لوگوں کو لے کر آتے تھے؟''

جتنے دن ائیر پورٹ پر بیٹھے رہے تقریباً روزانہ ایسا ہی ہوتے دیکھا۔ اتنا خوف آتا تھا آپا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے مگر کیا کریں ان دیکھا بن کر رہنا پڑتا تھا۔ نظریں پھر بھی مڑ مڑ کر اسی طرف جاتی تھیں۔

۲۵ مئی ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج باغی شاعر نذر الاسلام کی سالگرہ ہے۔ ڈھاکہ میں بہت شان وشوکت کے ساتھ منائی جارہی ہے حتیٰ کہ اسلامی فاؤنڈیشن نے بھی ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے۔

شام کے بعد ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ جامی نے سیڑھیوں پر سے بلایا، ''امی جلدی سے آیئے۔ نیا پروگرام آرہا ہے''۔

بھاگ کر اوپر گئی۔ آزاد بنگلہ بے تار سے ایک نئی آواز خبریں سنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر سننے کے بعد آواز جانی پہچانی لگی مگر ٹھیک سے پہچان نہیں پائی۔ صالح احمد کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ جامی نے کہا ''یقیناً فرضی نام ہوگا۔''

میں نے کہا، ''ممکن ہے ویسے ڈھاکے کا ہی کوئی ہے۔ ڈھاکہ سنٹر پر ہی یہ آواز سنی ہے۔ کسی تمثیل میں یا پھر نظم پڑھتے ہوئے۔ سوچ بچار کرتے کرتے بنگلہ خبریں ختم ہوگئیں۔

آج کی نشریات میں کافی نیا پن ہے۔ آوازیں بھی نئی ہیں۔ کسی نے ایک مقالہ پڑھا.... الٹی میٹم۔ خاصا دلچسپ لگا۔ صاف تلفظ میں پڑھتے پڑھتے اچانک آخری سطروں میں پہنچ کر خاص ڈھاکہ کے لہجے میں دو جملے بول کر ختم کردیا۔

''بہت خوب۔ مگر الٹی میٹم کی طرز کا تو کچھ نہیں لگا۔''

شریف نے کہا، ''کہہ جو رہا تھا ایک بار جب اس کیچڑ میں پاؤں ڈالا ہے، اب بچ کر نہیں جاپاؤ گے۔ کچھ ماریں کھا کر کیچڑ میں لیٹے رہنا پڑے گا۔ یہی تو الٹی میٹم ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔''

جامی نے سوال کیا، ''کچھی پٹائی کیسی ہوتی ہے؟''

رومی نے کہا، ''میں نہیں جانتا۔ کسی دوست سے پوچھ کر بتاؤں گا۔''

مکتی فوج کی گوریلا کارروائیوں کے بارے میں خبروں میں بتا رہے تھے کہ چھ مقاموں پر گرینیڈ کے دھماکے کئے گئے ہیں۔ ہم نے تو سات آٹھ دن پہلے بم کے دھماکوں کی خبر سنی تھی مگر یقین نہیں آیا تھا۔ اب لگتا ہے کہ واقعہ سچ ہے۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ واقعتاً ڈھاکہ میں لک چھپ کر مکتی باہنی کے گوریلاؤں نے مقابلے کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں جلانا شروع کردی ہیں۔ اتنے دن بارڈر کے آس پاس کے علاقوں میں گوریلا

کارروائیوں کے بارے میں سنا تھا۔ اب ڈھاکہ میں بھی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

مکتی باہنی! یہ لفظ اتنا وسیع ہے کہ ظالم فوجیوں سے گھرے ہوئے اس ڈھاکہ شہر میں مکتی باہنی کا لفظ سن کر بھی خائف دل کو یقین نہیں آتا مگر اسی بے یقینی کے بیچ سے ایک امید دھیرے دھیرے دل کے گوشے میں حوصلہ بن کر جاگ رہی ہے۔

۲۶ مئی ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج لیموں کا پودا لانے کے لئے جانا تھا مگر شریف نے دوپہر کے وقت دفتر سے واپس آ کر بتایا کہ منی بھائی کے گھر جانا پڑے گا۔ خبر ملی ہے کہ دیبا کی خالہ زاد بہن کے شوہر کو غلاب پور میں فوجیوں نے مار ڈالا ہے۔ بے چارے سخت پریشان ہیں۔

ساڑھے چار بجے گلشن پہنچے۔ دیبا کی خالہ زاد بہن شمس النہار کے شوہر انوار العظیم ضلع راجشاہی کی غلاب پور شوگر مل میں ایڈمنسٹریٹر تھے۔ انہیں اور ان کے ساتھ دوسرے بنگالی افسروں اور مزدوروں کو پاک آرمی نے گولیوں سے ہلاک کر دیا ہے۔ عظیم کے بیوی بچوں کا کیا بنا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ شمس النہار کا چھوٹا بھائی صلاح الدین بھی بہن کے گھر پر تھا۔ اس کے سمیت پورا کنبہ لاپتہ ہے۔

صدمے کے مارے ہم بھی کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اٹھ کر گھر آ گئے۔

گھر میں داخل ہو کر دیکھا اکرام بھائی اور لیلیٰ آپا آئی ہوئی ہیں۔ بیٹھے دونوں بابا کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ اکرام بھائی کا باریسال میں اے ڈی سی کے عہدے پر تبادلہ ہو گیا ہے۔ ایسے وقت میں ڈھاکہ سے اتنی دور باریسال میں تبادلہ ہونے پر اکرام بھائی کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے؟ مگر جائے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں ہے۔ کریک ڈاؤن کے بعد سے مارشل لاء کے احکامات بہت سخت ہو گئے ہیں۔ اس وقت تبادلہ روکنے کے ارادے سے کوئی بھی تدبیر کرنا ممکن نہیں۔ بس ایک تسلی ہے تبادلہ پروموشن پر ہوا ہے۔

اکرام بھائی پہلے اکیلے جانا چاہتے تھے مگر لیلیٰ آپا ضد کرنے لگی ہیں کہ وہ بھی ساتھ جائیں گی۔ ہم نے لیلیٰ آپا کو سمجھایا کہ ماں باپ کے اکٹھے چلے جانے سے وہ بے چارے بھی تو گھبرا جائیں گے۔ اکرام بھائی کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ ڈھاکہ میں اب سرکاری مکان رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ مکان تبدیل کرنا، گھر کی ساری چیزیں لے جا کر نئے سرے سے ترتیب دینا..... لیلیٰ آپا کے لئے اس وقت ڈھاکہ میں رک جانا انتہائی ضروری ہے۔

۲۸ مئی ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج صحن میں بڑا سا گڑھا کھود کر لیموں کا پودا لگایا گیا ہے۔ گزشتہ روز سہ پہر کے وقت آفس کی ایک پک اپ پر بڑی مشکل سے پودا لایا گیا۔ لاتے لاتے شام ہوگئی تھی لہٰذا کل پودا نہیں لگا سکے۔ اتنی احتیاط کے ساتھ بہت ساری مٹی کے ساتھ پودا اکھاڑا گیا تھا اور اب اتنی مضبوطی سے زمین میں دبا دیا گیا ہے کہ امید ہے ایک پتا بھی نہیں مرے گا۔

بالآخر شریف نیوز ویک اور ٹائمز کے ان نایاب شماروں کی ٹائپ شدہ کاپیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ تین کاپیاں ہیں۔۔۔ نیوز ویک کے دو شمارے، ۵ اپریل اور ۱۲ اپریل کے۔ ٹائم میگزین کا ۱۳ اپریل کا شمارہ۔ ہم سب بھوکوں کی طرح ان رسالوں پر ٹوٹ پڑے۔ اصل رسالے میں تصویریں بھی چھاپی گئی ہوں گی۔ ٹائپ شدہ کاغذ پڑھنے کا وہ مزا نہیں آیا۔ پھر بھی پڑھنے کو جو مل گیا ہے یہ بھی کیا کم ہے؟

پانچ اپریل کے نیوز ویک میں شائع مضمون کا عنوان ہے ''پاکستان ان ٹو سول وار....'' پاکستان میں خانہ جنگی۔ نیوز ویک کے صحافی لورین جنکنس کی رپورٹ چھپی ہے۔ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ہوٹل انٹرکان میں نظر بندی کی حالت میں بھی لورین جنکنس نے کس طرح آرمی کریک ڈاؤن کا پورا واقعہ معلوم کرلیا اور پھر ہو بہو رسالے میں شائع کر دیا ہے، پوری دنیا کو باخبر کرنے کے لئے۔ اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد تو کسی ملک کے لئے یہ کہنا کہ مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے، موزوں نہیں ہے یا پھر یہ کہ پاکستان کو توڑنے کی سازش میں کچھ علیحدگی پسند عناصر کو فوجی حکومت برحق سزا دے رہی ہے۔

بارہ تاریخ کے شمارے میں لورین جنکنس نے اور بھی خوبصورت انداز میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کو اجاگر کیا ہے۔ عنوان دیا ہے ''دی ویکننگ آف اے پیپل'' ایک قوم کی بیداری۔ ٹائم میگزین کا شمارہ اس سے بھی تازہ ہے۔ ٹائم کے رپورٹر ڈین کوگن نے اپنے مضمون کا عنوان رکھا ہے، ''ڈھاکہ، سٹی آف دی ڈیڈ'' مُردوں کا شہر ڈھاکہ۔

آپس میں مل بانٹ کر یہ سارا پڑھنے میں آج کا دن گزر گیا۔

۲ جون ۱۹۷۱ء بروز بدھ

صبح اکرام بھائی کا ٹیلی گرام ملا۔ خیریت سے باریسال پہنچ گئے ہیں۔
کل سہ پہر کو باریسال کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بڑا لڑکا ابو اور بھتیجا انجو تھا۔
ابھی ٹیلی گرام ملا تو یہ خبر لیلیٰ آپا کو پہنچانے کیلئے نکلی۔ ان کی طرف تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد امی کی طرف گئی۔

کل سے نزلہ ہوا ہے، ساتھ ہلکا بخار بھی ہے۔ آج بستر پر لیٹ کر آرام کرتی تو اچھا تھا تاہم ایک مرتبہ جب نکل ہی آئی ہوں تو جلدی سے گھر لوٹنے کو دل نہیں کیا۔ امی کے ساتھ اپنی ایک خالہ کی طرف گئی۔ وہاں سے امی کو دوبارہ چھ نمبر روڈ پر چھوڑ کر گھر لوٹنے میں ڈیڑھ بج گیا۔

نزلہ ٹھیک کرنے کا دیسی ٹوٹکا، پیاز کو باریک کاٹ کر، سوکھی مرچوں کو آگ پر جھلسا کر خالص سرسوں کے تل سے بھات (ابلے چاول) کھایا۔

اتنے اہتمام سے اتنا بڑا لیموں کا پودا لا کر اتنی مشکل سے دوبارہ مٹی میں لگایا۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آج دیکھ رہی ہوں کہ پتے زرد ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ رومی نے کہا، ''کوئی بھی دیکھے تو سمجھ لے گا کہ اس کے نیچے کوئی شے چھپائی ہوئی ہے۔ پودے کو اکھاڑ کر پھینک دینا ہوگا۔''

اتنا بڑا پودا اکھاڑ کر پھینکنا بھی آسان نہیں ہے۔ ٹہنیاں کاٹ کر تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دور کے ایک ڈسٹ بن میں پھینک دی گئیں۔ بہت تکلیف ہوئی اس پودے کو ایسے قصائی کی طرح ٹکڑے کرتے ہوئے۔ بچپن ہی سے سنا ہے کہ پھل دار درخت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہئے مگر کیا کریں، جان بچانے کی خاطر پودے کو کاٹ کر پھینکنا پڑا۔

اب دوبارہ نئے سرے سے سوچو کہاں پر کس طرح سے زیورات چھپائے جائیں۔
نزلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ شائد بخار بھی۔ نزلے کا ایک ہی علاج ہے لیٹ کر آرام کرنا۔ نوڈلجن کی دو گولیاں کھا کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی دیبا کا فون آیا ''ٹٹو ہمارے گھر پر آیا ہے یا نہیں؟
''خیریت تو ہے؟''
''ٹٹو صبح سے لاپتہ ہے۔''

بہت پریشانی میں بھی دیبا کی آواز نہیں کانپتی۔ غصے میں بھی چیخ کر باتیں نہیں کرتی۔ بہت متحمل مزاج لڑکی ہے۔ مگر آج اس کا گلا کانپ رہا ہے۔

دوپہر کو نوولجن کی دوا اور گولیاں کھا کر بخار کو بڑھنے سے روکا۔ دوپہر ڈھلتے ہی رومی، جامی، شریف اور میں گلشن کی طرف بھاگے۔ جا کر دیکھا دیبا نڈھال ہو کر بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ چاروں طرف عزیز رشتہ دار افسردہ چہرہ لئے کھڑے ہیں۔ منی بھائی، دیبا اور ظہیر کی زبانی ٹکروں ٹکڑوں میں پورا واقعہ سنا۔ صبح ٹٹو دیر تک سوتا ہے۔ ناشتہ تیار ہونے کے بعد اسے اٹھا کر بلانا پڑتا ہے۔ آج بھی بار بار بلایا جا رہا تھا مگر اس کے کمرے سے کوئی آہٹ تک نہیں آئی۔ بالآخر دیبا نے اس کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ مچھر دانی تنی ہوئی ہے مگر اندر ٹٹو نہیں ہے۔ پہلے چیخ و پکار کرنے کی بجائے ٹٹو کے بڑے بھائی ظہیر نے بہت خاموشی کے ساتھ ٹٹو کے دوستوں سے معلوم کیا۔ نہیں! ٹٹو ان میں سے کسی کی طرف نہیں گیا البتہ ٹٹو کے دو اور دوست بھی اپنے اپنے گھروں سے غائب ہیں۔ ظہیر کو تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹٹو کہاں گیا ہوگا مگر ٹٹو نے کبھی بھی بڑے بھائی کے ساتھ اس بارے میں کوئی واضح گفتگو نہیں کی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ ٹٹو چھپ کر جنگ لڑنے چلا گیا ہے۔ خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں پاک فوج کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ معلوم کرنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔

دیبا کو پہلی مرتبہ زار زار روتے دیکھا۔ منی بھائی بھی بہت پریشان ہیں البتہ گھر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے شائد پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر لگ رہا ہے کہ اندر سے وہ ٹوٹ گئے ہیں۔

سرِ شام گھر پر لوٹے مگر کسی طرح بھی چین نہیں آ رہا ہے۔ ٹٹو ایک جملے کا ایک خط بھی تو چھوڑ کر جا سکتا تھا۔

آج آزاد بنگلہ بے تار میں بھی دل نہیں لگا۔ کسی نے آج بھی الٹی میٹم پڑھا۔ روزانہ پڑھا جاتا ہے۔ کون صاحب پڑھتے ہیں شروع کے چند روز تک نام سننے کے لئے کان کھڑے رکھتی تھی مگر نہیں، نام نہیں بتایا جاتا۔

بار بار ٹٹو کی یاد طبیعت کو بے چین کر دیتی ہے۔ جامی کا چہرہ خشک ہو گیا ہے۔ ٹٹو نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا۔ دوست کے اس فریب پر جامی بہت اداس ہے۔ میں نے یکا یک جسم جھٹک کر کہا، ''چلو نیچے چلتے ہیں، مرمروں کی پنی بناؤں گی۔ کسی کام میں مصروف رہنے کی ضرورت ہے۔''

۳ جون ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

آج بستر پر لمبی لیٹی ہوئی ہوں۔ بخار کافی تیز ہے۔ گزشتہ دو تین روز سے بار بار ادرک والی چائے پینے کی وجہ سے زکام بیٹھ گیا ہے جس سے تکلیف کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ سینے میں درد محسوس ہو رہا ہے۔ سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔

لولو نے سہ پہر کے وقت آ کر کہا، ''ممانی سنا ہے پانچ سو اور ایک سو کے نوٹ ختم کئے جا رہے ہیں۔''

''کس نے بتایا؟''

''سب لوگ ہی تو کہہ رہے ہیں۔''

''افواہ ہے۔ کوئی قابل اعتماد ذریعہ ہو تو معلوم کرو۔''

نوٹ مسترد ہو جائیں تو مشکل ہو جائے گی۔ گھر پر دو تین ہزار روپے ہیں۔ زیادہ تر پانچ سو اور ایک سو کے نوٹ ہیں۔

رات کو شریف ڈھاکہ کلب سے لوٹے تو انہیں نوٹ منسوخ ہونے کی افواہ سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھاکہ کلب میں بھی بہت سے لوگ اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے کہا، کل ہی گھر پر جو پیسے ہیں بنک میں جمع کرا دینا۔''

''اتنا بے چین ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ افواہ بھی ہو سکتی ہے۔''

''بے شک افواہ ہو۔ ہمارے پاس پیسے زیادہ نہیں ہیں۔ تم کل جمع کرا دینا۔ ضرورت پڑنے پر دوبارہ نکالے جا سکتے ہیں۔''

شریف کندھے جھٹک کر ڈریسنگ روم میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے..... شاید میری بات انہیں پسند نہیں آئی۔

۵ جون ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج بھی طبیعت بہت خراب ہے۔ گزشتہ دو روز سے بستر سے اٹھ ہی نہیں سکی۔ آج نسبتاً بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ بخار آنا بند ہوا ہے۔ انٹی بایوٹک کھا رہی ہوں۔ آج بستر سے اٹھ کر تھوڑا بہت چل پھر پا رہی ہوں۔

صبح اخبار دکھا کر شریف نے کہا، ''خواہ مخواہ محنت کرائی۔ یہ دیکھو۔''

اخبار پر سرخی لگی ہے: کوئی بھی کرنسی نوٹ منسوخ نہیں ہو رہا ہے۔ افواہ بے بنیاد ہے۔''

خبر میں بتایا گیا ہے کہ حکومت پاکستان کے تمام کرنسی نوٹ چالو رہیں گے۔ سب نوٹ عوام میں آئینی طور پر تسلیم شدہ کرنسی کے طور پر قابل قبول رہیں گے۔ کچھ کچھ نوٹ منسوخ کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں جو افواہ پھیلی ہے اور کسی کسی اخبار میں بھی لکھا گیا ہے وہ سب بے بنیاد ہے اور ان کے پیچھے کوئی بھی سچائی نہیں ہے۔

خاموش رہی۔ کل میرے اصرار پر شریف کو اپنی مرضی کے خلاف بینک میں پیسے جمع کرانا پڑے تھے۔ صرف میرے ہی نہیں امی کے پیسے بھی۔ جمعے کو گیارہ بجے بینک بند ہو جاتا ہے۔ نو بجے ہی رومی کو امی کی طرف بھیج کر ایک سو کے پانچ نوٹ منگوا کر اپنے پیسوں کے ساتھ ملا کر، کل تین ہزار روپے شریف کے ہاتھوں میں تھما دیئے، بینک میں جمع کرانے کے لئے۔ دلکشا کمرشل ایریا میں شریف کے دفتر سے قریب ہی بینک ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کر کے معلوم کیا کہ شریف نے روپے جمع کرائے ہیں یا نہیں۔

قاسم نے آ کر کہا، ''اماں چاول بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ خریدنے پڑیں گے۔ راشن کے چاول سے ہمارا ہفتہ نہیں گزرتا۔ بازار سے بھی خریدنا پڑتا ہے۔''

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''دو تین روز پہلے سے کیوں نہیں بتاتے؟ تم لوگوں کو کتنا کہتی ہوں کہ کوئی بھی شے ختم ہونے سے دو تین دن پہلے بتایا کرو۔ مجال ہے جو کوئی بات یاد رکھ لے۔ صرف تین دن سے بستر پر پڑی ہوئی ہوں.....؟''

شریف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چلتا ہوں، دیر ہو رہی ہے۔''

میں نے منہ بسور کر کہا، ''چاول خریدنے کے لئے.....''

شریف نے فوراً کہا، ''ابھی تو سبھار جا رہا ہوں، بانکا کے ساتھ۔ واپس آتے آتے ایک بج جائے گا۔ پیسے کل نکلواؤں گا۔''

میں نے قاسم کو ڈانٹ کر کہا، "جا نکل جا یہاں سے کمبخت کہیں کا۔ چاول پورے نہ ہوں تو روٹیاں بنانا۔"

شریف کو لوٹتے لوٹتے تین بج گئے۔ پریشان ہو کر دوسری منزل کے کوریڈور پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ اتنی دیر تو نہیں ہونی چاہئے۔ خدا خیر کرے، کچھ ہوا تو نہیں؟"

نہیں، وہ سامنے گاڑی آ کر رکی ہے گیٹ پر۔ شریف نے آواز بلند کر کے قاسم کو پکارا۔ اوپر سے نظر آیا ڈرائیور اور قاسم نے مل کر ایک چاول کی بوری اتاری۔ بارق نے گاڑی کے اندر سے دو مرغے نکالے۔

۸ جون ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج کے اخبار میں دو انچ چوڑی آٹھ کالم کی سرخی لگی ہے:

''پانچ سو اور ایک سو کے نوٹ منسوخ کر دیئے گئے۔''

گزشتہ رات ہی ٹی وی پر یہ سنسنی خیز اعلان نشر کیا جا چکا تھا۔ حیران جتنا ہونا تھا لوگ پچھلی رات کو ہی ہو چکے تھے۔ اس لمحے میں بہت اطمینان کے ساتھ تکتی رہی۔ شریف بھی خاموش رہے مگر ان کے ماتھے پر بل تھے۔ ویسے میرا اطمینان زیادہ دیر مستقل نہیں رہا۔ رومی نے ایک بات یاد دلا کر غبارے میں سوئی چبھو دی، ''امی میری پتلون کی کمر میں ایک سو کے پانچ نوٹ سلے ہوئے ہیں۔''

سہ پہر کے وقت مزلو اور کلیم آئے۔ نوٹوں کی منسوخی کے اعلان نے شہر میں ہر طرف کس قدر ہل چل پیدا کر دی ہے۔ اس بارے میں ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ کتنے لوگ سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ خاص طور پر چھوٹے کاروباری..... جو لوگ کبھی بینک سے واسطہ نہیں رکھتے۔ نقد پر ہی جن کا کاروبار چلتا ہے ان لوگوں پر بجلی ٹوٹ پڑی ہے۔ جن بزرگوار نے اپنی بیٹی کی شادی کی خریداری کے لئے کل بینک سے ہزار ہا روپے نکالے تھے ان کا کیا ہوگا؟ کتنے لوگوں نے آج صبح ہی ضروری ادائیگیاں مکمل کرنے کے لئے کل بینک سے روپے نکالے تھے۔ ان کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ حق دار کے سامنے ان کا منہ جھوٹا ہوگا۔ کتنے لوگوں کے گھر پر ضروری اشیاء خریدنے جتنے پیسے موجود نہیں ہیں۔ مختصراً یہ کہ نوٹ منسوخ کر کے فوجی حکومت نے ملک گیر عوامی زندگی کو منجمد کر دیا ہے۔

۹ جون ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج طبیعت بالکل تندرست ہوگئی ہے۔ گیارہ بجے نہا کر تیار ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں نزلو آئے گا، اس کو لے کر امی کے گھر جاؤں گی۔ زیورات رکھنے کا انتظام بالآخر ہوگیا ہے۔ امی کے گھر پر نچلی منزل کی سیڑھیوں کے نیچے ایک چھوٹا سا باتھ روم ہے۔ چند ماہ پہلے یہ باتھ روم بنوایا گیا ہے۔ ابھی تک ''پین'' نہیں لگایا گیا ہے۔ پین کے لئے مقررہ جگہ پہ زیورات کا ڈبہ رکھ کر سیمنٹ کر دیا جائے گا۔ مستری کا کام ہم لوگ خود ہی کریں گے۔ ریت اور سیمنٹ امی کے گھر پر موجود ہے۔ نزلو کے گھر پر اس کی بیوی کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے زیورات بھی رکھے ہیں۔ دوسروں کی امانت پاس رکھ کر وہ بہت فکر مند ہیں۔ نزلو بھی وہ تمام زیورات امی کے گھر پر دبا کر رکھے گا۔ نزلو کے آنے کے بعد رکشے پر امی کے گھر گئے۔ میرے زیورات، امی کے زیورات، نزلو اور اس کے رشتہ داروں کے زیورات تمام کو ملا کر اکٹھے ایک ٹن کے ڈبے میں رکھا۔ زیورات کی فہرست بنا کر اس کی چار کاپیاں تیار کی گئیں۔ ایک فہرست ڈبیہ کے اندر رہے گی۔ باقی تین فہرستیں تینوں کے پاس رہیں گی۔

جس کا کام اسی کو ساجھے... اناڑی کی لاٹھی باجے۔ مستری کا کام کرنے میں تینوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ بسکٹ کے ڈبے پر پہلے پولیتھین کی دو تین تہیں لپیٹ کر تسلی سے باندھیں کہ ڈبے کے اندر پانی نہ جائے۔ ڈبے کو سوراخ میں رکھ کر چاروں طرف اینٹ کے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر اوپر سے ریت ڈال کر برابر کر لیا۔ اس کے بعد سیمنٹ کا لیپ کرنے میں حواس باختہ ہوگئے۔ بہر حال کام ختم کر کے تینوں نے کھڑے ہو کر کچھ دیر تک اپنی کارکردگی کی تعریف کی۔ اتنا برا بھی نہیں ہوا ہے۔ میں نے امی سے کہا، ''کل سے آپ چار پانچ دن تک روزانہ صبح شام پانی ڈالئے گا۔ اس کے بعد ہم لوگ دوبارہ آ کر گھر پر جتنے گھڑے مٹکے ڈبے کنستر وغیرہ موجود ہیں سارے اس کمرے میں ڈال کر اسے سٹور روم بنا دیں گے۔''

نزلو نے ہنس کر کہا، ''امید کرتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی پاک فوجی حملہ کریں گے۔''

میں نے ڈانٹ دیا، ''خدانخواستہ! ایسی منحوس باتیں کیوں کر رہے ہو؟''

امی نے کہا، ''کوئی فکر مت کرو میں روزانہ دعا پڑھ کر گھر کے دروازے بند کرتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو کوئی بھی فوجی یا بہاری مکان کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔''

امی کی خود اعتمادی نے ہمیں بھی خاصا پر امید کر دیا۔

۱۰ جون ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

دوپہر کا کھانا کھا کر ذرا سا لیٹی تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تھوڑی سی کوفت ہوئی۔ کس نے ایسے وقت پر فون کیا ہے؟

فون پر دیبا کی آواز سنائی دی: آپا ٹٹو واپس آ گیا ہے۔ ابھی ابھی پہنچا ہے۔"

فون رکھ کر یکا یک پکارنے لگی، "رومی جامی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ گلشن جائیں گے۔ ٹٹو لوٹ آیا ہے۔"

پندرہ منٹ کے اندر تیار ہو کر چاروں گلشن کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

رومی نے کہا، "امی تم ضرورت سے زیادہ سوال مت پوچھنے لگ جانا۔ جتنا وہ خود سے بتائے اتنا سن کر ہی مطمئن رہنا۔"

تھوڑی سی خفگی کے ساتھ میں نے کہا، "ٹھیک ہے زبان پر تالہ لگا دیتی ہوں۔"

دیبا کے پلنگ پر ٹٹو بیٹھا تھا..... الجھے ہوئے بال، بڑھی ہوئی داڑھی، سرخ آنکھیں۔ ویسے ہی وہ دبلا سا ہے ابھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے کتنے دنوں سے کھایا پیا نہیں ہے..... چہرہ سوکھ کر کنکھجورا ہو گیا تھا۔

ٹٹو بے انتہا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے یقیناً گھر والوں کو اپنے غائب ہونے کا ماجرا سنا چکا ہو گا اس کے باوجود ہمیں اس نے دوبارہ سے ساری بات سنائی۔

دو اور دوستوں کے ساتھ ٹٹو نے داؤدکندی سے دریا پار کر کے بالترتیب بس، رکشے پر اور پھر پیدل سرحد عبور کی۔ اس پار نگردا کے نام سے ایک مقام پر وہ کیمپ میں جا پہنچے۔ کومیلا وکٹوریہ کالج کے ایک پروفیسر نے یہ کیمپ آرگنائز کیا تھا۔ ہر روز نوجوان جا کر وہاں پر اکٹھا ہو رہے ہیں۔ پروفیسر انہیں بھرتی کر کے، منتخب کر کے، الگ الگ پلٹنوں میں نامزد کر رہے ہیں۔ ایک لانس نائک صاحب لڑکوں کو تربیت دیتے ہیں۔ انہیں سب لوگ استاد کہتے ہیں اگرچہ ان کا نام تفضل میاں ہے۔ ہر ایک گروہ کو چار دن تک ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بالکل ابتدائی تربیت۔ ٹٹو لوگوں کے پہنچنے کے بعد اگلے روز سے ٹریننگ شروع ہوئی۔ ابتدا میں اسلحے، بولٹ گرینیڈ وغیرا کی کمی کی وجہ سے تربیت مکمل کرنے کے بعد بھی سارے گروپ آپریشن پر نہیں جا پاتے تھے۔ ٹٹو کی قسمت اچھی تھی۔ انہی دنوں کچھ اسلحہ دستیاب ہو گیا تھا لہٰذا ٹٹو کو دو ایک آپریشن میں بھی شامل ہونے کا موقع ملا۔

رومی کی ہدایت کے باوجود ایک سوال زبان سے پھسل گیا، "اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے؟"

ٹٹو نے کہا ''مجھے ڈھاکہ ہی میں کچھ ذمہ داریاں عائد کر کے بھیجا گیا ہے۔ وہاں پر لڑکوں کی بھیڑ مسلسل بڑھ رہی ہے۔ رہنے کے لئے جگہ کی کمی ہے، خوراک کی کمی ہے۔ خوراک میں صرف دال اور بھات (ابلے چاول) ہے۔ اس پر بھی ہر وقت چاول حاصل کرنے کی فکر میں جتلا رہنا پڑتا ہے۔ کھانے پینے کی تکلیف تو تھی ہی، گیلی زمین پر لیٹ کر بہت سے لڑکوں کو بخار آ گیا۔ اس کے علاوہ پیٹ کی تکلیف عام ہے اوپر سے دواؤں کا بحران..... لہٰذا پروفیسر نے مختلف ٹولوں پر ایک ایک ذمہ داری ڈال کر مختلف جگہوں پر بھیجنا شروع کر دیا۔

میں ایک اور سوال کر بیٹھی، ''ان چند دنوں کے دوران کھانا پینا، نیند کچھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہوا ہوگا؟''

ٹٹو ہنسا، ''کھانا جو بھی ملا کھایا، سونے کا بالکل بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے تو پہنچنے کی تھکاوٹ پھر جاتے ہی ٹریننگ۔ اس کے بعد آپریشن کا دھکہ اور اب واپسی کا سفر..... ٹینشن بھی تو تھی۔ ہمارے پہنچنے کے چار روز بعد کیمپ وہاں سے ہٹانے کا آرڈر ہوا۔ سارا کچھ کھول کھال کر خود ہی سر پر اٹھا کر تین میل کے فاصلے پر جا کر نیا کیمپ بنایا گیا۔''

''جھگیوں کی دیواریں، خیمے، بانس، چٹائیاں، دیگچیاں اور دوسرے برتن بھی سر پر ڈھونا پڑے۔ یہ مشقت بھی بلا تکلیف نہیں تھی البتہ ایک اطمینان تھا..... نئے کیمپ کے پاس ایک صاف تالاب ملا۔''

''صاف تالاب سے کیا مراد؟''

ٹٹو نے پھر سے ہنس کر جواب دیا، ''عام طور پر تالاب یا ندی نالوں کے پاس کیمپ لگایا جاتا ہے تاکہ پانی دستیاب ہو سکے۔ نگردا کے کیمپ سے قریب ایک تالاب تھا۔ نہانے دھونے اور کھانے پکانے کے لئے استعمال کرتے کرتے اس کا پانی تقریباً سڑنے لگا تھا لہٰذا تین میل دور جہاں پر نیا کیمپ بنایا گیا وہاں کے تالاب کا پانی صاف تھا۔ تاہم یہ تو واضح تھا کہ اتنے سارے لڑکوں کے استعمال میں آ کر چند ہی دنوں میں اس کا پانی بھی پلید ہو جائے گا۔''

ہم لوگ رخصت لے کر آ گئے۔ اتنے دنوں کے بعد جنگ آزادی کا ایک حقیقی تصور ذہن پر نقش ہونے لگا۔ اس سے پہلے بہت بار تذکرہ سن کر بھی جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ لڑائی واقعتاً ہو رہی ہے۔ مکتی باہنی کے کیمپ سے لوٹنے والے ایک لڑکے کی زبانی سن کر یقین آ گیا کہ جنگ کا عمل جاری ہے نیز یہ کہ گروہ در گروہ لڑکے لڑائی میں شمولیت کے لئے پہنچ رہے ہیں۔

کمرے سے نکلنے سے پہلے رومی نے کہا، ''ایک کام کرو صابن کے ساتھ اچھی طرح نہا کر پیٹ بھر کر دال بھات کھانا۔ اس کے بعد دروازہ بند کر کے لمبی نیند سو جانا۔''

اس پورے وقت میں جامی نے کوئی بھی بات نہیں کی۔

۱۱ جون ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

لگتا ہے یحییٰ کی حکومت اچھے خاصے مسائل میں مبتلا ہو چکی ہے۔ عالمی بنک اور اقوام متحدہ کو صحیح طور پر قائل نہیں کر پا رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات دراصل چند علیحدگی پسند سماج دشمنوں کے خلاف حکومت کی مہم جوئی ہے نیز یہ کہ اس مہم کے اختتام پر پاکستان کی مسلح افواج اب امداد تقسیم کرنے کے کام میں صوبائی حکومت کی مدد کر رہی ہیں۔ صوبے کے تمام حصوں میں اب امور زندگی معمول کے مطابق چل رہے ہیں۔ دفتر، کارخانے سکول اور کالج معمول کے مطابق چل رہے ہیں۔ بس، ٹرین، سٹیمر وغیرہ وہ مقررہ وقت پر چل رہے ہیں۔ عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرنے کی ذمہ داری کو یحییٰ بالکل بھی نہیں بھولے۔ بس ان علیحدگی پسند عناصر کی نقصان دہ کارکردگی کی وجہ سے ہی انتقال اقتدار میں ذرا تاخیر ہو رہی ہے۔ تاہم ان کا ارادہ اٹل ہے، وہ انتخابات کو بیکار نہیں جانے دیں گے۔ عوامی نمائندوں کے حق میں اقتدار منتقل کرنے کا عنقریب اعلان کریں گے البتہ عوامی نمائندوں کے کاندھوں پر اقتدار کا بوجھ ڈالتے ہوئے وہ بدنظمی پیدا ہونے کا موقع نہیں دے سکتے۔ اسی لئے تھوڑی سی دیر ہو رہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے صوبائی اور قومی اسمبلی کے نمائندوں کو تلاش کر کے نکالنے کے مقصد سے یحییٰ نے بیگم اختر سلیمان کو اپنے اعلان کے بعد ہی ڈھاکہ بھیجا ہے۔ بیگم اختر نے ڈھاکہ پہنچ کر اسی دوران میں عوامی لیگ کے بہت سے ایم این اے اور ایم پی اے حضرات کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اخباروں کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ۱۰۹ افراد کے دستخط حاصل کر لئے ہیں۔

بار بار یہ باتیں دہرا کر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات جیسے ذرائع ابلاغ پر بارہا صفائیاں پیش کر کے بھی، پاکستان کی حکومت عالمی بنک کے رہنماؤں کو قائل نہیں کر پا رہی ہے۔ سال رواں کے غیر ملکی قرضوں کی مئی اور جون کی قسطیں، پورے ۳ کروڑ ڈالر چکانا پاکستان کے لئے فوری طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے چھ مہینے وقت بڑھانے کی گزارش کی گئی تھی ایڈ کنسورشیم کے پاس۔ یہ مہلت دی جائے گی یا نہیں اس ضمن میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ گزشتہ ماہ کے شروع میں ہی اس سلسلے میں عملی تحقیق (پاکستان ذرائع ابلاغ کے مطابق گفتگو) کے لئے عالمی بنک کے ایڈ ٹو پاکستان کنسورشیم کے چیئرمین مسٹر پیٹر کارگل ایک وفد لے کر اسلام آباد پہنچے تھے۔ وہاں پر کئی روز تک صدر سے لے کر ان کے اقتصادی امور کے مشیر ایم ایم احمد تک کے اعلیٰ سطح کے

عہدیداروں سے گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ چند روز کے بعد ایم ایم احمد واشنگٹن گئے عالمی بینک کے صدر میکنمر سے ملاقات کرنے کے لئے۔ اس واقعہ کے بعد بھی تو ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ بے بس ہو کر یحییٰ نے ۲۸ مئی کو اقتدار منتقل کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر کیا نتیجہ نکلا؟ عالمی بینک کا مشن اب دس روز سے مشرقی پاکستان کا دورہ کر رہا ہے۔

دوسری طرف وہ مشرقی پاکستان کو امداد دینے کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔ تاہم اقوام متحدہ کے خصوصی اداروں کے ذریعے امداد تقسیم کرنا ہو گی۔ اس پر پاکستان رضامند نہیں ہے۔ حکومت پاکستان کا کہنا ہے پاکستان کے اپنے امدادی ادارے ریلیف کی اشیاء تقسیم کرنے کا کام سرانجام دے سکتے ہیں مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں، ان کی باتوں میں نہیں آ رہے۔

یو این او کے ہائی کمیشن فار ریفیوجیز پرنس صدر الدین آغا خان بھی ڈھاکہ آئے ہوئے ہیں۔ انہیں شائد یحییٰ مشکل کشا کے طور پر اقوام متحدہ سے بلا کر لائے ہیں۔

صدر یحییٰ نے ایک بیان میں یقین دہانی کرائی ہے کہ ''مشرقی پاکستان میں حالیہ فسادات کے دوران جو محب وطن پاکستانی، باغیوں اور سماج دشمنوں کے خوف اور دہشت کے باعث ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں اور سرحد عبور کر کے پڑوسی ملک میں پناہ گزین ہیں، ان کو ملک میں واپس لا کر ان کی سماجی اور معاشی بحالی کا بندوبست کیا جائے گا۔'' اس ضمن میں پچھلے ہفتے بھارت سے مشرقی پاکستان میں داخل ہونے والی مختلف اہم سڑکوں پر استقبالیہ کیمپ لگائے جا چکے ہیں۔

ڈھاکہ آنے سے پہلے پرنس صدر الدین نے چند روز اسلام آباد میں گزارے تھے۔ بلاشبہ صدر یحییٰ کے پاس سے ضروری ''بریفنگ'' حاصل کرنے کے لئے۔ گزشتہ روز ڈھاکہ پہنچتے ہی پرنس مصروف ہو گئے ہیں۔ ''خالص پاکستانیوں'' کو ملک میں واپس بلوا کر ان کی سماجی و معاشی بحالی کے مسئلے پر گورنر سے شروع کر کے مختلف اعلیٰ حکام کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیا ہے۔

(کتنے پرعزم ہیں! کتنی سخت محنت کر رہے ہیں!)

ادھر اقوام متحدہ میں امریکہ کے سفیر نے تین دن پہلے اطلاع دی ہے کہ امریکی حکومت نے بھارت میں مشرقی پاکستان کے پناہ گزینوں کے لئے مزید پندرہ ملین ڈالر کی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک اور خبر یہ ہے کہ مصر بھارت میں کثیر تعداد میں ''ویکسین'' بھیج رہا ہے۔

تصویر میں دیکھا کہ یحییٰ یہ خبر سن کر سر کے بال نوچ رہے ہیں اور امور پناہ گزین کے ہائی کمیشنر پرنس آغا خان کو ''کسی کام کا نہیں ہے'' کہہ کر گالی دے رہے ہیں۔

آج سے ڈھاکہ میں کرفیو بالکل اٹھا لیا گیا ہے۔

بھلے مانس نے ٹھٹھک کر کہا، ''واقعی! میں پھر کلب ہی جاتا ہوں۔''

ان کے جاتے ہی میں دروازہ بند کر کے تیزی سے اوپر کی منزل پر جا پہنچی۔ منو اور جامی بیٹھ کر بات چیت کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر منو کھڑا ہو کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا، ''اور بتاؤ کیا خبریں ہیں؟''

''خبر کیا سناؤں! گزر رہی ہے۔ مختلف گوریلا گروپ ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ ہدایت کے مطابق کام ختم کر کے واپس جا رہے ہیں۔ ہم لوگ جان بوجھ کر دوسرے ٹولے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتے البتہ کبھی کبھار ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ یار دوست تمام گروپوں میں ہی ہیں۔''

منو خاموش ہوا۔ میں نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ سوال پوچھنا ممنوع ہے۔ زیادہ معلومات رکھنا خطرناک ہے۔ میں نے موضوع چھیڑا ''پاکستان کی اقتصادی صورتحال تو نازک ہے۔''

منو نے سوالیہ نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا، ''تین مہینے سے پیداوار رکی ہوئی ہے، ایکسپورٹ بند ہے، عالمی بینک کا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں ہے، نیا قرضہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی حالانکہ بجٹ تیار کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اتنی سرگوشی کے باوجود حکومت اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی ہے کہ مارچ، اپریل کے دوران صوبے میں پیداوار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کو پورا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ پچھلے سال ایکسپورٹ بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس بار بالکل صفر ہے۔''

منو نے کہا، ''حالانکہ پاکستان کی حکومت کیسی بے شرم ہے کہ کہہ رہی ہے کہ جاپان کے پاس سے تین کروڑ ڈالر کا جو قرضہ ملنا تھا اس کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے اب پاکستان عالمی بینک کو ادائیگی نہیں کر پا رہا ہے۔'' یوں نظر آتا ہے کہ منو ملکی صورتحال کے بارے میں خاصا باخبر ہے۔

اچانک ایک آواز نے چونکا دیا۔ دور کہیں پر شائد بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ پہلے دھماکے کی آواز ختم ہونے سے پہلے ہی ایک اور دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد ایک اور۔

میں بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھڑی پر وقت دیکھا، آٹھ بجے تھے۔ باتوں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا، رومی اب تک کیوں نہیں لوٹ رہا ہے؟ یہی ایک برائی ہے اس میں.... گاڑی ہاتھ آ جائے تو بس وقت کا کوئی دھیان نہیں رہتا۔ جامی نے ریڈیو پر آزاد بنگلہ بے تار لگایا۔ میں چین سے سن نہیں رہی تھی۔ ''تم لوگ سنو'' کہہ کر چھت پر گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ تیزی سے نیچے اتر کر میں نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔ رومی کے چہرے پر کھسیانی ہنسی تھی۔ میں نے ڈانٹ کر کہا، گاڑی ہاتھ آ جائے تو ہوش قابو میں نہیں رہتا.... ہے نا؟ ادھر منو آ کر بیٹھا ہوا ہے شام سے۔ کس سڑک پر سے آئے ہو۔ دھماکے کی آواز سُنی ہے؟''

''ہاں سُنی ہے۔ صحیح سمجھ نہیں سکا دھماکہ کس طرف ہوا ہے۔''

تھوڑی دیر میں شریف آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ سوئمنگ پول کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شمال کی جانب سے دھماکے کی آواز آئی۔ عین ممکن ہے کہ ریڈیو سٹیشن پر بم پھٹا ہو کیونکہ ڈھاکہ کلب کے شمال میں ریڈیو سٹیشن ہے۔''

رومی اچانک بول اٹھا، ''نہیں، نہیں، ریڈیو سٹیشن پر نہیں.... یقیناً انٹرکان میں۔ وہاں پر اس وقت عالمی بینک کا وفد اور یو این او کے پرنس صدرالدین موجود ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ دھماکہ وہیں پر ہوا ہے۔''

''ہم لوگوں کو بھی ایسا ہی لگا۔ وہاں پر دھماکہ کرنے کا جواز سب سے زیادہ ہے۔''

منو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رومی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے پرسکون لہجے میں بولا، ''ہم لوگ پرسوں روانہ ہوں گے۔''

۱۳ جون ۱۹۷۱ء بروز اتوار

دوپہر ہونے تک لوگوں کی زبانی تفصیلی خبر معلوم ہوئی۔ تین عدد گرینیڈ کل انٹرکان کے پورچ پر ہی پھٹے تھے۔ مکتی باہنی کے گوریلوں کا کارنامہ ہے۔ عالمی بینک کے نمائندے اور امور پناہ گزین کے ہائی کمشنر صدرالدین کو ذرا سا سمجھانا تھا کہ مشرقی پاکستان کا وجود اب نہیں رہا ہے۔ یہ سرزمین اب جدوجہد میں مصروف بنگلہ دیش ہے۔

رومی کل چلا جائے گا۔ اس کی پینٹ کی کمر کی سلائی کھول کر ایک سو روپے کے نوٹ بینک میں جمع کرا دیئے تھے اب دوبارہ سے پچاس پچاس کے نوٹ تہہ کر کے سی دیئے ہیں، پہلے کی طرح اتنے پیسے دینا ممکن نہیں ہوا۔ کمر کا حصہ پھولا ہوا نظر آتا ہے۔ پاک فوجی تلاشی لیتے وقت کمر ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔

شام کے بعد رومی ندیم کو گھر پر لے آیا۔ ریٹائرڈ میجر قاضی قمرالزمان کا بیٹا ہے۔ میجر زمان کریک ڈاؤن کے فوراً بعد ہی سرحد کے اس پار چلے گئے تھے۔ بارڈر کے قریب کسی خطے میں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی بیگم سلطانہ زمان اور دونوں لڑکیاں نائلہ احمر اور لبنیٰ مریم مئی کے مہینے میں سرحد پار چلی گئی تھیں۔ صرف ندیم باقی ہے۔ رومی کے ساتھ وہ بھی جائے گا۔ آج رات کو ہمارے گھر پر ہی رکے گا۔

رات نو بجے کے قریب ندیم کے ماموں آئے، اس سے ملاقات کرنے کے لئے۔ ان کے ساتھ صاد عندلیب بھی آیا۔ صاد رومی کا جگری یار ہے۔ ندیم کا پھوپھا زاد بھائی بھی لگتا ہے۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔

۱۴ جون ۱۹۷۱ء بروز پیر

دوبارہ وہی چابی والے پتلے کی طرح صبح اٹھ کر تیار ہونا۔ ناشتہ کر کے گاڑی پر لے جانا اور سڑک کے درمیان میں کہیں اتار دینا۔

ندیم اور رومی چلے گئے۔

پورا دن باغ میں گزارا۔ قاسم کو باورچی خانے میں اور جامی کو بابا کے پاس بٹھا کر بارق کو ساتھ لے کر سارا دن صرف کر کے پورے باغ کی صفائی کی اور ساتھ ساتھ بارق کو ڈانٹتی رہی ''تمہیں کہا ہے کہ روزانہ ایک مرتبہ باغ کی صفائی کیا کرو۔ کتنے دنوں سے کھرپی ہاتھ میں نہیں لی؟ سر پر کھڑا نہ رہا جائے تو کام نہیں کرو گے۔ اگر ایسے ہی ارادے ہیں تو صاف صاف کہہ دو۔ ابھی تنخواہ دے کر رخصت کر دیتی ہوں۔''

ایک لڑکی گیٹ سے اندر داخل ہو کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا کھکو ہے، ڈاکٹر اے کے خان کی صاحبزادی۔ وہ لوگ پچھلے دنوں راجشاہی چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وہاں کے ہسپتال میں پوسٹنگ ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا، ''کھکو کب آئی ہو؟ کس کے ساتھ؟ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں؟ چلو کمرے کے اندر چلیں۔''

کھرپی رکھ کر کھکو کو لے کر کمرے کے اندر چلی آئی۔ نیچے کے باتھ روم سے ہاتھ دھو کر اس کے پاس آ کر بیٹھی۔

کھکو، اس کا بھائی کھوکن اور ان کی خالہ منجو، یہ تینوں مارچ کے دوسرے ہفتے میں پٹنہ کے عنائت پور اپنے نانا کے گھر گئے تھے۔ اتنے دن تک وہ لوگ گاؤں میں ہی تھے۔ کریک ڈاؤن کے بعد تقریباً تین ہفتوں تک راجشاہی کی کوئی خبر انہیں نہیں ملی۔ بالآخر ان کے والد کا خط ملا کہ وہ لوگ سلامت ہیں۔

''تمہارے گاؤں میں پاک فوج نے کوئی کارروائی نہیں کی؟''

''نہیں ہمارے گاؤں تک آرمی نہیں گئی البتہ خبر ملتی تھی کہ دوسری طرف بہت سے گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے ہیں۔ ٹیلی فون ٹیلی گراف کی ساری لائنیں خراب ہو گئی تھیں۔ خطوں کی آمد و رفت بھی بہت دن تک بند رہی۔

''ڈھاکہ کس کے ساتھ آئی ہو؟''

''سرور ماموں کے ساتھ۔''

''کھوکھر اور منجو کہاں پر ہیں؟''

''وہ لوگ عنائت پور ہی میں ہیں، بعد میں آئیں گے۔ ایک ساتھ سب لوگوں کو آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سڑکوں کے کیا حالات ہیں کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے..... خالہ، ابو کو فون کرنا پڑے گا۔''

''ضرور کرو۔''

''اسی وقت راجشاہی کے لیے ٹرنک کال بک کرائی۔ ''فون ملنے تک تم یہیں پر رکو، چائے وائے پیو، اخبار پڑھو، ٹی وی کا وقت ہو جائے تو ٹی وی دیکھو، اس کے بعد آزاد بنگلہ بے تار سنو۔ گاؤں میں آزاد بنگلہ سنٹر سنتے تھے؟'' ''سنتے تھے خالہ۔ گاؤں میں ٹرانزسٹر کے علاوہ اور تو کچھ تھا نہیں لہٰذا ہر وقت ریڈیو سنتے رہتے تھے۔ ۲۵ مارچ کے بعد سے تو بس آکاش وانی اور بی بی سی سنتے تھے۔ اس کے بعد آزاد بنگلہ بے تار بھی سننے لگے۔''

بہت رات تک بھی لائن نہیں ملی۔ بالآخر کھکو نے کہا۔ ''اب گھر چلتی ہوں خالہ۔ کل صبح پھر سے ٹرائی کروں گی۔''

۱۵ جون ۱۹۷۱ء بروز منگل

صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر اے کے خان کے نمبر پر دوبارہ کال بک کرائی۔ کھکو کے پہنچنے کی خبر دینا ضروری تھا۔ کھکو سے کہا ''تم اوپر بیٹھ جاؤ۔ جامی سے بات چیت کرو۔ فون آئے تو میرے بیڈروم سے بات کر لینا۔ میں اتنی دیر نیچے گھریلو کام کاج سے نپٹ لوں۔''

گیارہ بجے برہان الدین خان جہانگیر آئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر اور ادیب ہیں۔ مارچ کی تحریک عدم تعاون کے دوران ایک روز بنگلہ اکیڈمی میں ''آزاد بنگال کے خدوخال'' کے عنوان سے ایک بے باک مضمون پڑھا تھا۔ پہلے بھی تعارف تھا مگر وہ مضمون سننے کے بعد سے رابطہ بڑھ گیا ہے۔

ناشتہ اور چائے پیش کر کے میں نے سوال کیا، ''حسن حفیظ الرحمن کی کوئی خبر جانتے ہیں؟''

برہان نے چونک کر کہا، ''نہیں! کیوں کچھ سنا ہے آپ نے؟''

''نہیں، نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی کوئی خبر معلوم نہیں ہے۔ اس لئے سوال کر رہی تھی۔''

''میں بھی نہیں جانتا۔ کہیں پر چھپے ہوئے ہیں۔ شائد کسی گاؤں میں۔''

''ان کے بارے میں معلوم ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔''

''ضرور''

برہان بہت کم گو ہیں۔ دو کاموں کی ذمہ داری سونپی انہوں نے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگلہ کے پروفیسر منصور کی بیوی شمس النہار، موسیٰ مسلم کمرشل بینک کی خواتین کی شاخ میں کام کرتی ہیں۔ بینک بلا کا بلڈنگ میں ہے۔ ان کے پاس جا کر کچھ باتیں بتانی ہونگی۔ اس کے علاوہ بنگلہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر کبیر چودھری کے پاس ایک خط پہنچانا پڑے گا۔

''ٹھیک ہے۔ کل جاؤں گی۔''

راجشاہی کا فون دوپہر ڈیڑھ بجے ملا۔ کھکو نے اپنے والد، والدہ سے بات کی۔ میں نے بھی دو چار باتیں کیں۔ اے کے خان نے دریافت کیا، ''خیریت سے تو ہیں آپ سب لوگ؟ شریف، رومی، جامی، شریف کے والد؟

''ہاں جی۔ سب لوگ خیریت سے ہیں۔''

جواب دیتے وقت سینہ مچل اٹھا۔ رومی خیریت سے ہے؟ خدا جانتا ہے۔

۱۶ جون ۱۹۷۱ء بروز بدھ

کبیر چودھری بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بنگلہ اکیڈمی میں خط لے کر جانا محفوظ نہیں تھا۔ برہان بھی اسی وجہ سے خود نہیں گئے۔ دس بجے کبیر چودھری کو فون کیا۔ ان کا فون ٹیپ ہوتا ہے۔ گفتگو احتیاط سے کرنی پڑتی ہے۔ نام وام بتائے بغیر صرف کہا ''آپ کے دوست سخت بیمار ہیں۔ آج ہی ایک بار گھر پر آیئے۔'' میری آواز اتنی منفرد ہے کہ نام نہ بھی بتاؤں تو کسی کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا، ''واقعی بہت زیادتی ہوگئی ہے۔ اتنے دنوں سے کوئی خبر نہیں لی۔ میں آؤں گا۔''

فون بند کر کے پیدل جا کر بلا کا بلڈنگ کی نچلی منزل پر مسلم کمرشل بینک کی خواتین کی شاخ میں جا پہنچی۔ ایک بڑا سا کمرہ منیجر کے لئے، شیشے کا بنا ہوا کوئی علیحدہ کیوبیکل نہیں ہے۔ بالکل مچھلی بازار ہو گویا۔ منیجر مسز شمس النہار کی میز کے چاروں طرف بہت سی خواتین بیٹھی تھیں۔ پورے کمرے میں عورتوں کا رش لگا ہوا تھا۔

ان کے قریب کھڑے ہو کر کہا، ''ایک اکاؤنٹ کھولنا ہے۔ نام جہان آراء امام ہے۔'' انہوں نے غیر دلچسپی کے ساتھ کہا ''تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا، جو لوگ پہلے آئے ہیں ان کو پہلے فارغ کر دوں۔''

دیوار کے پاس ایک کرسی خالی ہوتے ہی اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے مسز موسیٰ کا مشاہدہ کرنے لگی۔ سانولی، صحت مند، بہت سمارٹ چہرہ، واضح سریلی آواز.... یوں لگتا ہے کہ ایک ہی وقت میں دس ہاتھوں سے کام نپٹانے کی عادی ہیں۔ کم از کم اس وقت ان کے کام کرنے کا انداز دیکھ کر ایسا ہی لگا۔

ٹیبل کے سامنے تین چار کرسیاں خالی ہونے کے بعد انہوں نے مجھے بلایا۔ قریب جا کر بیٹھی۔ نیا اکاؤنٹ کھولنے کا فارم وغیرہ نکال کر انہوں نے کہا، ''ایک لاکر بھی لیجئے گا کیا؟ زیورات وغیرہ رکھ کر بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''ہاں لوں گی۔''

کس سائز کا لاکر لیں گی؟ ذرا دیکھ لیجئے۔ چھوٹا، بڑا، درمیانہ ہر سائز میں دستیاب ہیں۔ آیئے سٹرانگ روم میں چل کر دیکھ لیجئے۔''

سٹرانگ روم کی طرف جاتے جاتے بولیں، ''بہت محفوظ ہیں یہ لاکر۔ بہت سے لوگ لے رہے ہیں۔ فکر سے آزاد رہنے کے لئے مفید ہے۔''

سٹرانگ روم کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرتے ہوئے ہی چہرہ بدل گیا۔ کانا پھوسی کے انداز میں

کہا، ''برہان بھائی نے مجھے فون پر آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ وہاں پر رش میں بات کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ لاکر کے بہانے آپ کو یہاں لائی ہوں۔ آپ نے بھی ایک دم ہی بوجھ لیا۔ اب بتایئے کیا بات ہے؟''

میں نے دل میں فقرہ بنا کر کہا، ''جنگ آزادی دن بدن زوردار ہوتی جارہی ہے۔ اتنا تو سمجھ ہی رہی ہیں۔ گوریلے وقتاً فوقتاً دھاکے میں آکر مہم چلا رہے ہیں۔ شہر میں ان کے لئے رہائش اور کھانے پینے کی فراہمی کی ضرورت ہے۔ زخمی ہوں تو خفیہ طور پر علاج کے لئے ڈاکٹر اور کلینک کی ضرورت ہے۔ دوائیوں اور لباس وغیرہ کیلئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان کاموں میں کیا آپ ہماری مدد کرسکیں گی؟''

''یقیناً کرسکتی ہوں اور کروں گی بھی۔ یہ تو خود ہم لوگوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ صرف یہ بتا دیجئے کہ کس طریقے سے مدد کرنا ہوگی۔''

''برہان آپ کو ضرورت کے مطابق بتادیں گے۔''

سٹرانگ روم سے باہر نکل کر پانچ روپے دے کر ایک اکاؤنٹ کھولا۔

گھر پر واپس پہنچنے میں بارہ بج گئے۔

کبیر چودھری ایک بجے آئے۔ دس منٹ کے قریب بیٹھ کر اٹھ گئے۔ ان کا خط میں نے سٹور روم میں ایک ڈبے کے نیچے چھپا کر رکھا تھا۔ وہاں سے نکال کر لے آئی۔ افسردہ لہجے میں ان سے کہا، ''میلا ہوگیا۔ کچھ سوچئے گا مت۔''

۱۷ مئی کو اخبار میں جو بیان شائع ہوا تھا اس پر دستخط لینے کے لئے ان کے پاس بھی لوگ گئے تھے۔ انہوں نے دستخط نہیں کئے۔ دفتر میں بھی باقاعدگی سے جارہے ہیں۔

''برہان کہہ رہے تھے۔ میں بھی کہہ رہی ہوں ذرا احتیاط سے رہیے گا۔''

کبیر چوھری کی بظاہر لطیف انکساری کے پیچھے فولادی خوداعتمادی نہاں تھی۔ ان کی ہنسی میں جیسے وہی خوداعتمادی جلوہ گیر ہوئی۔ ''موت سے پہلے مرنا نہیں جانتا۔''

کبیر چودھری کے جاتے ہی فقیر آن پہنچے۔ ''شریف کہاں ہے؟''

''ابھی تک نہیں لوٹے۔ بیٹھئے ابھی آجائیں گے۔ کھانا کھا کر جایئے گا۔

شریف کے آنے کے بعد ہم چاروں کھانا کھانے بیٹھے۔ فقیر نے چاروں جانب نظر گھما کر کہا، ''رومی کہاں ہے؟''

''اوہو! بتانا بھول گئی۔ اس کے دوست خورشید کو.... وہ جو سامنے کے مکان میں رہتا ہے، کسی ضروری کام سے گاؤں جانا پڑا۔ اکیلے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا سو رومی کو ساتھ لے گیا ہے۔''

''اوہ۔'' شریف نظریں جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ فقیر جانتے ہیں کہ رومی جنگ لڑنے گیا ہے مگر یہ بات زبان پر لانا ممنوع ہے۔ بانکا کا بھانجا خالد مشرف کریک ڈاؤن کے فوراً بعد سرحد عبور کر گیا تھا۔ کافی دنوں تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ سب نے سوچا پاک فوج نے شائد اسے مار ہی ڈالا ہوگا۔ حال ہی میں پتہ چلا ہے

کہ اگرتلہ کی طرف کہیں پر سرحدی محاذ پر لڑائی کر رہا ہے مگر ہم لوگ کبھی بھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لاتے۔ بانکا جانتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ بانکا کو معلوم ہے مگر بانکا اور ہم لوگ آپس میں ملیں تو اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔ یہی دستور ہے۔ فقیر نے شائد غلطی سے رومی کے بارے میں سوال کر دیا تھا۔

ڈھاکہ کو احترام بخشنے کے لئے فوجی حکومت نے کمر باندھ لی ہے۔ مختلف سڑکوں کے نام تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ آج کے اخبار میں طویل فہرست شائع ہوئی ہے۔ لال موہن دار لین بدل کر ابدال کریم غزنوی سٹریٹ ہوگئی ہے، شنکاری بازار لین.... گل بدن سٹریٹ، نبین چاند گوسوامی روڈ.... بختیار خلجی روڈ، کالی چرن واحار روڈ.... غازی صلاح الدین روڈ، ایس کے داس روڈ.... سراج الدین روڈ، سی وسن چٹرجی لین.... صید سلیم سٹریٹ۔ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد کوفت ہونے لگی۔ اتنے نام پڑھے نہیں جا سکتے۔ پڑھتے پڑھتے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔

جامی نے کہا، ''ایک چیز پر غور کیا ہے امی؟ جتنے لین تھے سب سٹریٹ یا پھر روڈ ہو گئے ہیں۔''

شریف ہنس پڑے۔ ''ڈھاکہ کی گلیاں اتنے دنوں کے بعد جا کر عزت و وقار کی دعوے دار ہوئی ہیں!'' اخبار کے صفحے الٹاتے ہوئے کہا، ''ایک اور خبر دیکھی ہے، بہت سی کتابیں بین کر دی گئی ہیں۔''

کس کس کی کتابیں؟ کس طرز کی کتابیں؟ دیکھنا ذرا ہمارے گھر پر کوئی ایسی کتاب موجود ہے یا نہیں۔''

شریف نے پڑھتے پڑھتے کہا، ''ہر اسلوب کی کتابیں شامل ہیں، سیاست، سنگیت، ناٹک۔ البتہ بہت سے مصنفوں کا نام لگتا نہیں ہے کہ پہلے کبھی سنا ہو۔'' شریف خاموشی سے پڑھتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک دیکھنے کے بعد تنگ آ کر میں نے کہا۔ ''اونچی آواز میں کیوں نہیں پڑھتے تا کہ ہم لوگ بھی سن سکیں۔'' شریف نے فہرست پر نظر رکھتے ہوئے کہا، ''میں بھی پھر تمہاری طرح تھک جاؤں گا۔ صرف دیکھ رہا ہوں کوئی کتاب ہمارے گھر پر ہے یا نہیں۔'' تھوڑی دیر کے بعد بولے، ''یہ پرو بودھ کمار سینیل کی کتاب ''ہاسو بانو'' اور کے ایم الیاس کی کتاب ''بھاشانی یورپ میں''.... یہ دو کتابیں ہمارے گھر پر موجود ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو ہٹا دینا ہوگا۔''

''بھاشانی یورپ میں'' یہ کتاب تو بہت پہلے سے ہی ممنوع ہے۔ ہم نے تو بہت عرصہ پہلے ہی اسے ڈریسنگ روم کی الماری کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔'' بیچ میں شائد اس کتاب پر سے بین اٹھا لیا گیا تھا، مجھے اتنا یاد نہیں ہے۔ اس مرتبہ مکان کے اندر چھپانا کافی نہیں ہوگا۔ باہر کہیں پر ہٹا کر رکھنا پڑے گا یا پھر جلا دینا ہوگا۔''

''رومی نے باؤنڈری وال میں جس جگہ پر ملو کی کتاب رکھی ہے وہیں پر رکھ چھوڑوں گی۔''

جامی بہت دیر سے اخبار پر جھک کر انگلیاں رکھ رکھ کر کچھ گن رہا تھا۔ غور سے دیکھا کہ ڈھاکہ کی سڑکوں کے ناموں کی تبدیلی کی فہرست دیکھ رہا ہے اور منہ ہی منہ کچھ کہہ رہا ہے۔ کافی دیر کے بعد سر اٹھا کر اس نے کہا، ''اف ایک سو پچاس سڑکوں کے نام تبدیل کئے گئے ہیں اور اب بھی آخر میں لکھا ہے ''نامکمل''۔ اس کا مطلب ہے کہ اور بھی نام تبدیل کئے گئے ہیں۔ اخبار والے اتنے نام چھاپنے کے لئے جگہ نہیں دے سکے اور جن پر ذمہ داری تھی اتنے سارے مسلمان نام تلاش کرنے کے لئے ان کی کیسی درگت بنی ہوگی وہ تو اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

۲۰ جون ۱۹۷۱ء بروز اتوار

عالمی بینک کا مشن تحقیق کر کے واپس چلا گیا ہے۔ پرنس صدر الدین مشاہدہ کر کے واپس چلے گئے ہیں۔ چار روز قبل تین نمائندوں پر مشتمل برٹش وفد بھی دورہ کر گیا ہے۔ ان لوگوں نے کھلنا، جیسور، سلہٹ، چٹا گانگ کا دورہ کیا، ٹاٹ کا کارخانہ، چائے کے باغات دیکھے، مل اور کارخانے دیکھے، بینا پول کی سرحد پر گئے، جھکر کاچھا کے استقبالیہ کیمپ کا بھی دورہ کیا۔ اس کے بعد گزشتہ روز وہ بھی لوٹ گئے ہیں۔

یہ تمام نمائندے واپس جا کر اگر اطمینان بخش رپورٹ نہ پیش کریں تو شائد کسی بھی مغربی ملک سے یحییٰ حکومت کے لئے امداد حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن اطمینان بخش رپورٹ دینے کی کیا کوئی گنجائش اب باقی رہ گئی ہے؟ چند دنوں سے آکاش بانی، بی بی سی، آزاد بنگلہ بے تار، ریڈیو آسٹریلیا..... تمام سٹیشنوں سے کسی انتھونی مسکرن ہاس صاحب کی رپورٹ کا بہت تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ سنا ہے کہ یہ جرنلسٹ پاکستان کے شہری ہیں۔ کراچی کے مارننگ نیوز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ مغربی پاکستان سے یحییٰ حکومت نے انہیں صحافیوں کے ایک ٹولے کے ساتھ مشرقی بنگال بھیجا تھا۔ سارا کچھ دیکھنے کے بعد واپس جا کر پہلے بیوی بچوں کو لندن منتقل کیا اس کے بعد خود بھی فرار ہو کر لندن پہنچ گئے اور سنڈے ٹائمز میں اپنی رپورٹ شائع کروائی۔

اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد یورپ اور امریکہ میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ اتنے دن میں سب کو عملاً اس بات کا ادراک ہو گیا ہے کہ مشرقی بنگال میں یحییٰ کی حکومت جس عمل میں مصروف ہے اسے قتل عام کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

طبیعت جانے کیوں بوجھل لگ رہی ہے۔ جسم سے زیادہ ذہن تھکا ہوا ہے۔ لوہے کے شکنجے سے پسلیوں کو دونوں طرف سے جکڑ لیا جائے تو جیسے دم اٹکنے لگتا ہے، اکثر اس طرح کا درد محسوس ہوتا ہے سینے میں۔ کیا رومی کامیابی کے ساتھ سرحد عبور کر گیا ہے؟ راستے میں کہیں پر پاک فوج کے بالمقابل تو نہیں ہونا پڑا؟ کیسے معلوم کروں؟ معلوم کرنے کا کوئی بھی طریقہ نہیں ہے۔ صرف صبر ہی کیا جا سکتا ہے۔

گھر پر شریف اور جامی اور باہر سے اگر صاد آئے تو اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس بارے میں گفتگو کر کے طبیعت ہلکی کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام لوگوں کے سامنے ہنس مکھ رہ کر اداکاری کرنی پڑتی ہے حتیٰ کہ امی اور لالو کے ساتھ بھی۔ امی نے ذرا کوشش کی تھی جرح کر کے حقیقت معلوم کرنے کی۔ گمبھیر صورت بنا

کران سے کہا کہ رومی اپنے دوست کے ساتھ گاؤں گیا ہے۔

مظہر صاحب اکثر آتے ہیں۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف گئے تھے، ان کے بڑے بیٹے شمیم کئی روز سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک دن بے خیالی میں سوال کر بیٹھی۔ مظہر صاحب نے بہت خوش دلی کے ساتھ کہا، ''شمیم؟ وہ تو گاؤں گیا ہے، آ جائے گا چند روز کے اندر۔''

سمجھ گئے کہ شمیم بھی مکتی باہنی میں شامل ہونے گیا ہے۔

۲۷ جون ۱۹۷۱ء بروز اتوار

صبح سے طبیعت خراب ہے، ساتھ سینے میں درد ہے۔ لوہے کے شکنجے میں جکڑے جانے جیسا درد۔ سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔

جی سی جی (ڈھاکہ کلب جمخانہ ریس) میں شریف کو کوئی کام تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہیں پر گئے ہیں۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ لہٰذا ایک نیا کام لے کر بیٹھی ہوں۔ گھر پر جتنے تالے موجود ہیں، چھوٹے، بڑے، زنگ آلود، بے کار تالے.... سب لے کر بیٹھی ہوں۔ ایک افواہ ہوا کی لہروں کی طرح پھیلی ہوئی ہے کہ میر پور، محمد پور سے بہاری جھنڈ کی شکل میں اس طرف کو آئیں گے۔ تہلکہ مچا ہوا ہے ہر طرف۔ یار دوست، عزیز رشتہ داروں کو فون کرتی ہوں۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کے دروازوں کھڑکیوں کی کنڈیوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جہاں ضرورت ہے وہاں مستری بلوا کر مرمت کروا رہے ہیں۔ ہمارے گھر پر باہر کی طرف کھلنے والے دونوں دروازے خستہ ہو گئے ہیں۔ انہیں بدل کر بھاری بھرکم سے دروازے لگانے چاہئیں۔ اپنے پرانے مستری چیتیا کو خبر بھیجی ہے مگر اس کا کوئی نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔ لگتا ہے نیو مارکیٹ سے مسلمان مستری بلوا کر کام کرانا پڑے گا۔ ابھی تالے لے کر بیٹھی ہوں۔ زنگ آلود تالوں میں تیل دے کر، چابی ٹھیک ٹھاک کر کے، ڈپلیکیٹ چابیاں الگ کر کے، مختلف چھلوں میں ترتیب سے ڈال کر رکھی ہیں۔

شریف لوٹے شام کے بعد۔ آتے ہی کہا، ''تیار ہو جاؤ۔ بانکا کی طرف جانا ہوگا۔''

''خیریت؟''

بانکا نے فون کیا تھا۔ کوئی ضروری مسئلہ ہے۔ فون پر بتانا ممکن نہیں ہے۔''

بانکا کے گھر گئے۔

خالد مشرف کا خط لے کر مکتی باہنی کے دو لڑکے پچھلے روز سہ پہر کو بانکا کے پاس آئے تھے۔ سگریٹ کے پیکٹ کے اندر جو پنی ہوتی ہے اس کی دوسری طرف مختصر سا خط لکھ کر دوبارہ پیکٹ کے اندر ڈال کر پیکٹ کو سگریٹوں سے بھر دیا گیا تھا۔ اتنے خفیہ انداز میں دونوں لڑکے خالد کا خط لے کر آئے ہیں۔

شریف نے سوال کیا، ''لکھائی پہچان گئے ہیں؟''

بانکا نے جواب دیا، ''ہاں مونی کی ہی تحریر ہے۔''

''کیا لکھا ہے مونی نے؟''

بانکا نے خط دکھایا۔ صرف دو سطروں کا خط۔ ''خط پہنچانے والے لڑکوں کی ضرورت پڑنے پر مدد کیجئے گا۔ میں خیریت سے ہوں۔ مونی۔''

شریف نے دوبارہ سوال کیا ''کیسی مدد چاہتے ہیں وہ لوگ؟''

''فی الحال روپئے پیسے۔''

''کچھ پیسے دیئے ہیں؟''

''نہیں۔ کل وہ شام کے وقت آئے تھے۔ آج اتوار ہے۔ ویسے بھی تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کی ضرورت تھی۔''

شریف نے کہا، ''مونی کے ہاتھ کی لکھائی جب پہچان گئے ہیں تو ان لڑکوں پہ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ پیسوں کی تو سخت ضرورت ہے ان لوگوں کو۔''

میں نے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا، ''دیکھنے میں کیسے ہیں وہ؟ عمر کتنی ہے؟ کیسا لباس پہنا ہوا تھا؟''

''ان میں سے ایک ۲۶، ۲۵ سال کا ہوگا۔ دوسرا ذرا کم سن ہے۔ عام شرٹ پینٹ پہنے ہوئے تھے۔ لمبے بال، منہ پر مونچھیں۔''

''نام بتایا ہے؟''

''بتایا ہے۔ ایک کا نام شہادت چودھری ہے۔ اس نے ایک اور رقعہ دکھایا۔ اس پر مونی نے اسے اتھارٹی دی ہے۔ سیکٹر ٹو کی طرف سے وہ ضرورت کے مطابق کسی بھی قسم کا رابطہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ رقعے پر خالد کے نام کی مہر لگی ہوئی ہے۔ کم سن لڑکے کا نام عالم ہے۔''

شریف نے کہا، ''پھر تو شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ جس وقت بھی آئیں دے دیجئے گا۔''

گھر لوٹ کر ساری رات نیند نہیں آئی۔ سیکٹر ٹو سے دو لڑکے آ کر بانکا کے ساتھ رابطہ کر رہے ہیں۔ خالد مشرف سیکٹر ٹو سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ لگتا ہے اتنے دنوں کے بعد جنگ آزادی کے ساتھ ہمارا بھی تعلق جڑ گیا ہے۔

۳۰ جون ۱۹۷۱ء بروز بدھ

راجشاہی سے ڈاکٹر اے کے خان کی ٹرنک کال ملی۔ وہ اگلے روز ڈھاکہ آ رہے ہیں۔

سات خیرہ سے آئنو ڈھاکہ آیا ہے۔ اس کا بڑا بھائی شامو یعنی ڈاکٹر شمس الحق، امریکہ کی ریاست مشی گن میں رہتا ہے۔ شامو نے آئنو کے لئے مشی گن جانے کا سب انتظام مکمل کر لیا ہے۔

آئنو کی زبانی سات خیرہ سے ڈھاکہ کے درمیانی راستے میں مختلف جگہوں پر پاک آرمی کے غیر انسانی تشدد کی بہت سی کہانیاں سنیں۔

نیا پن کچھ بھی نہیں ہے.... وہی ٹھا ٹھا ٹھا، مشین گن چلا.... نہتے گاؤں والوں کا قتل عام، بچوں اور بوڑھوں کو سنگین گھونپ کر مارنا، لڑکیوں کی بے حرمتی، گاؤں کے گاؤں نذر آتش کر دینا.... قصہ پرانا بھی ہو تو آئنو کے لئے سب نئے تجربے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ کر آئنو گھبرا گیا ہے۔ دیوانگی سی طاری ہے اب تک۔

گیارہ بجے کے قریب بدیع الزمان کا فون ملا۔ ''آپا آپ مہر آپا کو تو پہچانتی ہیں؟''

''کون سی مہر آپا؟''

''مسز دلاور حسین۔ دھان منڈی چھ نمبر روڈ پر جن کا گھر ہے۔''

''ہاں، ہاں پہچانتی ہوں۔ سرسری سا تعارف ہے۔ ان کی بیٹی کا نام یاسمین ہے، لڑکے کا نام نسیم ہے۔''

''جی وہی۔ انہوں نے آپ کو اطلاع دینے کے لئے کہا ہے۔ آپ آج ہی وقت نکال کر ضرور ان سے ملئے گا۔''

''ملاقات کروں؟ کس سلسلے میں؟''

''رومی کی خبر ہے۔'' اتنا کہہ کر بدیع الزمان نے فون بند کر دیا۔

''رومی کی خبر! میرا دل دھڑکنے لگا۔ فوراً جاؤں؟ یا شام کو؟ گھڑی پر نظر ڈالی، ابھی ساڑھے گیارہ بجے ہیں اوہو! شام تک انتظار کرنا ناممکن ہے فوراً جاؤں گی۔ جامی کو بلا کر بابا کے پاس بیٹھنے کے لئے کہا، بارق اور قاسم کو باورچی خانے کا سارا کام سمجھا کر اسی وقت ایک رکشہ منگوایا اور مسز حسین کے گھر چلی گئی۔

مسز حسین نے دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھایا۔ خیر و عافیت دریافت کرنے سے پہلے ہی اچانک وہ

کھڑکی سے باہر جھانک کر چونک اٹھیں۔ تیزی سے کھڑے ہو کر سرگوشی میں کہا، ''آپا جلدی سے میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلئے۔'' بات ختم کرنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ تھام کر کھینچنے لگیں۔

کوئی بھی ماجرا سمجھے بغیر بے وقوفوں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے ایک اور کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کمرے میں ان کے بچے موجود تھے، انہوں نے گھر کے دوسرے کونے میں ایک چھوٹے سے ڈریسنگ روم کے اندر مجھے داخل کر کے کہا، ''یہیں پر تھوڑی دیر خاموشی سے کھڑی رہئے۔ میں نے گیٹ سے ایک خاتون کو اندر آتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے آپ کو یہاں پر دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ بعد میں سب کچھ سمجھا دوں گی۔'' وہ دوبارہ تیزی سے واپس ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئیں۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ماجرا ہے؟ رومی کی خبر معلوم کرنے کے لئے آ کر کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی؟

دس پندرہ منٹ کے بعد مسز حسین نے آ کر مجھے بچوں کے کمرے میں ہی پلنگ پر بٹھایا۔ سارا ماجرا وضاحت سے بیان کیا۔

اس وقت مسز ایم گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ قسمت اچھی تھی کہ مسز حسین جس جگہ پر بیٹھی تھیں وہاں سے بروقت کھڑکی سے باہر گیٹ پر نظر پڑ گئی ورنہ مصیبت ہو جاتی۔ مسز ایم کو میری موجودگی کا علم نہیں ہوا۔

مسز ایم، مسز حسین اور ڈھاکہ کی دوسری بہت سی خواتین کی پرانی واقفکار ہیں البتہ گزشتہ دو ایک برس سے اتنا رابطہ نہیں رہا تھا۔ اچانک گزشتہ دو ماہ سے وہ تمام واقفکاروں کے گھر پر جا کر پرانی دوستی بحال کرتی پھر رہی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جن گھروں پر جاتی ہیں، اس کے ایک آدھ دن کے اندر ہی ان گھروں میں یا تو فوجی چھاپا مار رہے ہیں، یا پھر ان کنبوں کے مکتی باہنی سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کو پکڑا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے سب کو یوں گمان ہو رہا ہے کہ شاید مسز ایم کسی طرح سے خفیہ طور پر پاک آرمی سے ملی ہوئی ہیں۔

مسز حسین نے کہا، ''سمجھیں آپا، وہ میری پرانی جاننے والی ہیں حالانکہ آپ سے نیا تعلق ہے لہٰذا آپ کو میرے یہاں دیکھ لیتیں تو وہ اصل بات بھانپ جاتیں۔ آپ کا لڑکا لڑائی میں شامل ہونے گیا ہے، اس بات کا وہ کھوج لگا لیتیں۔''

مسز حسین کے بہت سے رشتہ داروں کے لڑکے مکتی باہنی جوائن کر چکے ہیں۔ ایک بہن کے دیور کا لڑکا حال ہی میں ڈھاکہ آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ رومی اگرتلہ کے قریب ایک کیمپ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ تربیت لے رہا ہے۔ خیریت سے ہے۔

بس اتنی سی خبر؟ جس لڑکے کی زبانی خبر معلوم ہوئی ہے اسے ابھی تک اپنی نظروں سے نہیں دیکھا۔ براہ راست اس کی زبانی کچھ نہیں سنا! دل بہت اداس ہو گیا۔ اس لڑکے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مسز حسین نے کہا، ''وہ لڑکا آج کل بہت بیمار ہے، بیماری کی وجہ سے ہی ڈھاکہ لوٹ آیا ہے، ابھی اس سے ملاقات کرنا محفوظ نہیں ہے۔''

میں دل برداشتہ ہو گئی۔ مایوس ہو کر گھر لوٹ آئی۔

یکم جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

دیبا کی خالہ زاد بہن شمس النہار عظیم کی، جس کے شوہر کو گوپال پور شوگر مل میں آرمی نے ہلاک کر دیا تھا، خبر ملی ہے۔ شمس النہار اپنے تین بچوں اور چھوٹے بھائی صالح الدین کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گھومتے پھرتے بالآخر بہت تکالیف کے بعد پچھلے ماہ کے درمیان میں ڈھاکہ پہنچ گئے ہیں۔ ان سے ہمارا تعارف نہیں۔ دیبا اور منی بھائی کی زبانی ہم نے پورا واقعہ سنا۔

شمس النہار کے شوہر انوار العظیم گوپال پور شوگر مل کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ بنگلہ بندھو کی تحریک عدم تعاون کی کال پر اس علاقے کے عوام کے ساتھ مل کر انہوں نے بھی مثبت ردعمل اختیار کیا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کے دوران گوپال پور شوگر مل میں چینی کی پیداوار بند کر دی گئی تھی۔ ۲۹ مارچ تک وہ علاقہ پاک آرمی کی رسائی سے آزاد تھا۔ ۳۰ مارچ کی صبح کو لوگوں کی زبانی خبر ملی کہ ناٹور بن پاڑا کی سڑک سے پاک آرمی مل کی طرف آ رہی ہے۔ اس موقع پر مل ایریا کے لوگوں نے مل تک پہنچنے کے راستے پر موجود ریلوے کراسنگ پر کھینچ تان کر ایک انجن کھڑا کر کے رکاوٹ تیار کی۔ پاک آرمی نے رکاوٹ کے پیچھے پوزیشن سنبھال کر گولیاں، مارٹر شیل اور بھی جو کچھ ان کے پاس موجود تھا، برساتے رہے۔ اس پار سے مکتی فوجوں نے بندوق اور رائفلوں سے گولیاں چلا کر ان کا جواب دیا۔ اس بار تو پاک آرمی چند زخمی فوجیوں کو ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔ صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگا کر عظیم نے مل کے جتنے ہندو ملازم تھے انہیں بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے خود بھی آدھے میل کے فاصلے پر نریندرا پور کے فارم میں وقتی طور پر پناہ لے لی۔ ۱۲، ۱۰ دن تک وہ وہیں پر رکے۔

اپریل کے دوسرے ہفتے میں مل ایریا سے کچھ لوگوں نے نریندرا پور جا کر عظیم کو بتایا کہ سنا گیا ہے کہ چند روز پہلے مولا ڈول میں پاک آرمی اور مکتی باہنی کے درمیان جھڑپ ہوئی ہے۔ لڑائی کے دوران اسلم نامی ایک پاکستانی میجر اور دو جوانوں کو مکتی فوج نے حراست میں لے لیا۔ مکتی باہنی نے انہیں لال پور نام کی ایک جگہ پر لے جا کر گولی مار کر ہلاک کر دیا مگر افواہ پھیل گئی ہے کہ ان کی لاشیں مل کے احاطے کے اندر پھینکی گئی ہیں۔ ناٹور میں پاکستانی میجر شیروانی خان بہت طیش میں آئے ہوئے ہیں۔ ان ساری خبروں کے بعد عظیم نے بھارت چلے جانے کا فیصلہ کیا مگر علاقے کے عوام نے عظیم سے التجا کی کہ انہیں وحشیوں کے حوالے کر کے وہ خود کہیں پر کھسک نہ جائیں۔ عظیم گوپال پور میں تین سالہ نوکری کے دوران سب کے عزیز اور واقف کار بن گئے تھے۔ علاقے کے لوگ

انہیں رہنما کی طرح عزت دیتے تھے۔ ان کی گزارشات کی وجہ سے عظیم کا بھارت جانا رہ گیا البتہ احتیاطاً مزید تھوڑے سے فاصلے پر کرشن فارم میں چلے گئے۔ وہاں پر سات آٹھ دن تک رکے۔

اسی اثنا میں راجشاہی پر فوجیوں نے قبضہ حاصل کرلیا۔ شمال کے پورے علاقے پر فوجیوں کا زور بڑھ گیا۔ مل سے کچھ لوگوں اور گنے کے کاشتکاروں نے عظیم کے پاس جا کر کہا، ''آپ مل میں واپس آ جایئے۔ آرمی کہتی ہے کہ مل چالو کرنا ہوگا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

عظیم لوگ مل پر واپس چلے گئے لیکن مل چالو کرنا کوئی آسان بات تو نہیں تھی، اس کے لئے خاصا وقت درکار تھا۔ پاک آرمی کوئی بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ناٹور میں پاکستانی میجر شیروانی خان موجود تھے۔ عظیم اور دیگر کچھ افسروں کو ان کے سامنے حاضر کر کے مل چالو کرنے کا حکم دیا گیا۔ گوپال پور مل کے اندر بہاری مزدوروں کی تعداد خاصی تھی۔ اب انہی کے دن تھے۔ وہ لوگ بظاہر انکساری دکھا کر کہتے، ''سر ہمیں چھوڑ کر آپ کہیں پر مت جایئے گا۔ ہم لوگ مل چالو کرنے کے لئے ہر طرح سے تعاون کریں گے۔'' زبانی ایسی باتیں کرتے اور عملاً پہرا دے کر نظر میں رکھتے۔ کبھی کبھی مل کے اندر فوجیوں کا ٹولا آتا تھا۔ بہاریوں کے ساتھ مل کر خوب غل غپاڑا کرتے۔ ایسے موقعوں پر مل میں موجود بنگالیوں پر خوف طاری ہو جاتا۔ کوارٹر چھوڑ کر بھاگ جاتے پھر واپس بھی آ جاتے۔ کبھی کبھار کچھ فوجی بنگالیوں کے گھر میں داخل ہو کر روپیہ پیسہ مانگتے، قیمتی اشیاء اٹھا کر لے جاتے۔ عظیم کے کوارٹر پر بھی ایک مرتبہ اسی نوعیت کا حملہ ہوا۔ اس موقع پر گھر جتنے پیسے موجود تھے فوجیوں کو دے کر بلا ٹالی گئی۔ اب عظیم نے فیصلہ کیا کہ اپنے کوارٹر میں نہیں رہیں گے۔ ایک اور سٹاف کے کوارٹر میں رہنے لگے۔ مل چالو کرنے کے سلسلے میں عظیم کی حیل و حجت پر پاکستانی فوجی دن بدن بے صبر ہوتے جا رہے تھے۔ ملک کے ہر علاقے میں مل اور کارخانے حسب معمول چل رہے ہیں اس بات کی مشہوری بہت ضروری تھی تاہم عظیم نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ مل چالو نہیں کریں گے۔ شروع میں بہاریوں کو دھوکے میں رکھنے کے لئے کچھ کارروائیاں شروع کی تھیں مگر اندر ہی اندر چند بنگالی افسروں کے ساتھ مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ پانچ مئی کو مل کو مسدود قرار دے کر ڈھاکہ چلے جائیں گے۔

پانچ مئی کی صبح کے وقت چند دوسرے افسروں کے ساتھ عظیم مل سے باہر گئے۔ مل کے سٹور آفیسر ان دنوں اپنی حاملہ بیوی کو لے کر مل ایریا سے باہر رہ رہے تھے۔ پانچ مئی کو بہت سویرے خبر پہنچی کہ سٹور آفیسر کی رہائش گاہ پر ڈکیتی ہوگئی ہے۔ عظیم جلدی سے ناشتہ کر کے کسی طرح کپڑے تبدیل کر کے وہاں پر جا پہنچے۔ شمس النہار کے ساتھ اس کے شوہر کی یہی آخری ملاقات تھی۔

بعد میں عظیم لوگ مل کی پچھلی طرف کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر دفتر گئے، شمس النہار کو اس بات کا علم نہیں ہوا۔ دن کے تقریباً دس بجے وہ چھوٹے بچے کے کپڑے اتار کر نہلانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اتنے میں جن صاحب کے کوارٹر میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، انہی اسسٹنٹ کیمسٹ رحمان صاحب کے نوکر نے بھاگ کر آ کے بتایا کہ مل کے اندر فوجی گھس آئے ہیں۔ گھروں کے دروازوں پر دھکے دے کر سب کو باہر نکال رہے ہیں۔ ہر طرف لوگ بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ ایک بہاری فورمین کا کوارٹر خالی تھا۔ پچھلے دروازے سے داخل ہو کر اندر سے دروازہ

بند کر دیا۔ کوارٹر کے سامنے کے دروازے پر تالہ لٹک رہا تھا۔ اسی تالے نے ان کی زندگی بچالی۔

شمس النہار کو علم نہیں ہوا کہ فوجی مل کے دفتر سے عظیم اور دوسرے بنگالی افسروں کو بلا کر مل ایریا کے اندر جو تالاب ہے اس کے کنارے پر لے گئے ہیں۔ اسی تالاب کے کنارے پر عظیم، دیگر افسر اور مزدوروں کو ملا کر تقریباً تین سو بنگالیوں کو پاک آرمی نے مشین گن کے برسٹ فائر سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شمس النہار لوگ جس کوارٹر کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے وہ تالاب سے خاصا دور ہے، کچھ نظر آتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شوگر مل کے بوائلر سے پیدا ہونے والی مسلسل جھک جھک کی آواز کی وجہ سے بھی وہ مشین گن کی آواز سن نہیں سکے۔ اس کمرے میں بیٹھ کر شمس النہار تصور کر رہی تھی کہ عظیم تو مل ایریا سے باہر گئے ہوئے ہیں چنانچہ وہ محفوظ ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد وہ لوگ اس کوارٹر کی پچھلی طرف باؤنڈری وال کے ٹوٹے ہوئے مقام سے نکلے۔ میدان سے بھاگتے، آدھے میل کا فاصلہ طے کر کے ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ چاروں جانب لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ مل کے اندر گولی سے زخمی ہونے والے ایک شخص کو اس کے عزیز پھٹے پر اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اس گاؤں کے لوگ بھی خوف کے مارے گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ مزید ایک میل کے فاصلے پر بل سریا نام کے ایک گاؤں میں شمس النہار لوگوں نے پناہ حاصل کی۔ یہاں پر مل کے ایک افسر شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی جو اپنی حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر بھاگ آئے تھے۔ گاؤں کے ایک غریب آدمی کے گھر پر بڑی تکلیف میں رات گزاری۔ دوسرے روز بیل گاڑی پر سوار ہو کر پانچ میل کے فاصلے پر واقع ایک دوسرے گاؤں بل ماریا میں ایک گرہست کے گھر پر پناہ لی۔ اس گھر پر وہ سب لوگ بارہ دن تک پناہ گزین رہے۔ شمس النہار نے ایک لباس میں بارہ دن گزارے۔ بچہ ننگے بدن.... نہلانے کے لئے جو کپڑے اتارے تھے، اسی حال میں بھاگنا پڑا تھا۔ شوکت کو معلوم تھا کہ عظیم کو مار دیا گیا ہے مگر اس حالت میں انہوں نے شمس النہار کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ بعد میں مل کے باہر آ کر بھی عظیم کا کوئی پتہ نہ چلا اور گاؤں کے مختلف لوگوں کی بات چیت سن کر شمس النہار کو شبہ ہو گیا۔ اس نے شوکت صاحب سے جرح کر کے حقیقت اگلوالی۔

شمس النہار جانتی تھی کہ بیس، تیس میل کے فاصلے پر جوگی پاڑا گاؤں میں اس کے نانا سسر کا گھر ہے۔ ایک شخص کو کچھ پیسے دے کر جوگی پاڑا میں خبر بھجوائی۔ جوگی پاڑا سے آدمی آیا اور دو بیل گاڑیاں کرائے پر لے کر شمس النہار کو لے گیا۔ آدھا فاصلہ طے کر کے بیل گاڑی والوں نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اب تانگے پر سوار ہو کر تھوڑی دور تک گئے۔ دریا کے کنارے آ کر تانگہ فارغ کر دیا۔ کشتی پر دریا پار کر کے کچھ دور تک پیدل گئے۔ اس طرح وہ جوگی پاڑا تک پہنچے۔ یہاں پہنچ کر شمس النہار نے لباس تبدیل کیا۔ بچے کے بدن پر قمیض چڑھائی۔ یہاں پر وہ لوگ بیس پچیس دن تک رکے۔

راجشاہی کے رانی نگر میں شمس النہار کا سسرال ہے۔ اس کا سسر بھارتی ریڈیو پر اپنے بیٹے کی موت کی خبر سن کر پاگلوں کی طرح بہو اور پوتے پوتیوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ آخر کار جوگی پاڑا سے انہیں اطلاع ملی۔ انہوں نے اپنے چھوٹے لڑکے کو بھیج کر شمس النہار لوگوں کو جوگی پاڑا سے شہر لانے کا انتظام کیا۔ دوبارہ کچھ دور تک بیل

گاڑی، کچھ دور تک کشتی، کچھ فاصلہ پیدل اور پھر آخر میں تانگے پر سوار ہو کر سب لوگ رانی نگر پہنچے۔

دوسری طرف شمس النہار کے والدین باریسال گاؤں میں تھے۔ وہ بھارتی ریڈیو پر داماد کی موت کی خبر سن کر پاگلوں کی طرح ڈھاکہ آ گئے۔ بیٹی کو ڈھونڈ نکالنے میں انہیں بہت دن لگ گئے۔ اس کے بعد بی آئی ڈی سی میں کہہ سن کر رانی نگر میں ایک جیپ بھجوادی۔

رانی نگر سے ڈھاکہ تک کا سفر بھی اتنا خوشگوار نہیں تھا۔ رانی نگر تک جیپ لے کر جانا ممکن نہیں ہوا تھا۔ دریا اترائی کے اس پار جیپ رکی رہی۔ شمس النہار کشتی پر دریا پار کر کے کافی دور تک پیدل چلی۔ پھر جیپ پر سوار ہوئے۔ گزشتہ مہینے کے وسط میں تین چھوٹے بچے اور چھوٹے بھائی صالح الدین کے ساتھ بے انتہا تکالیف جھیل کر بالآخر ڈھاکہ پہنچے۔

سارا واقعہ سن کر سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ کربلا کا واقعہ کیا اس سے بھی زیادہ دردناک تھا؟

۲ جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

گزشتہ روز شام کے وقت ڈاکٹر لوگ پہنچ گئے۔ خود گاڑی ڈرائیو کر کے آئے ہیں۔ پرسوں ٹرنک کال پر کہا تھا سویرے ہی روانہ ہوں گے۔ اس لحاظ سے انہیں سہ پہر کے تین چار بجے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ دیر ہوتے دیکھ ہم سب کافی فکرمند ہو گئے تھے۔ خاص طور پر کھکو تو بہت پریشان ہو رہی تھی۔ دیر کی وجہ انہوں نے بتائی کہ راستے میں بہت سی جگہوں پر پاک آرمی نے گاڑی روک کر چیک کیا۔

یہ سن کر کہ وہ اجلاس میں شامل ہونے کے لئے راولپنڈی جائیں گے اور کراچی سے ارسال شدہ دعوت نامہ دیکھ کر انہیں ہر جگہ پر چھوڑ دیا گیا۔ کل سے ہی ان سے راجشاہی کے بارے میں جاننے کے لئے دل بے تاب ہو رہا تھا لیکن پورا دن راستے میں گزارنے کی وجہ سے ان کے چہروں پر اتنی تھکاوٹ تھی کہ میں نے اپنی خواہش کو ضبط کر کے ان سے کہا، ''آج آرام کیجئے، کل ساری باتیں سنیں گے۔''

آج سارا دن پی جی ہسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر نورالاسلام سے ملاقات کرنے اور جہاز کا ٹکٹ اور سفر کے دوسرے انتظامات مکمل کرنے میں مصروف رہے۔ شام کے بعد ہمارے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم، سانو بھی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا، ''ہم نے تو پہلے سوچا تھا کہ ڈھاکہ میں کچھ بھی سالم نہیں رہا ہوگا۔ سارا کچھ توڑ کر، گرا کر، جلا کر تباہ کر دیا ہوگا۔ کسی بھی طرف سے خبر دریافت کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا، بس بھارتی ریڈیو، بی بی سی، ریڈیو آسٹریلیا اور وائس آف امریکہ کی خبریں ہی رہ گئی تھیں۔ ان کی نشر کردہ خبریں سن کر تو ہمارا دماغ گھوم گیا تھا۔ ڈھاکہ کے اصل حالات معلوم کرنے میں بہت دن لگ گئے۔''

''راجشاہی کا زوال کب ہوا؟''

''شائد تیرہ یا چودہ اپریل کو۔ صبح سویرے دریا کے کنارے سے فوجی شہر میں داخل ہو گئے۔ اس دن کی یادیں اذیت ناک ہیں۔ ٹاؤن کے ۸۵ فیصد لوگ فرار ہو گئے تھے۔ باقی ۱۵ فیصد لوگ گھروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے رہے۔ راجشاہی شہر اس روز قبرستان کی طرح ویران نظر آ رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پاک آرمی سڑک کے دونوں طرف سب کچھ جلاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ ان کی گولیوں سے مرے۔ ایک دو روز کے اندر ہی پاک فوج نے پورے شہر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ ہم لوگوں کو حکم جاری کیا گیا' کام

پر واپس جانے کے لئے، ہسپتال چلانے کے لئے۔ ہم لوگ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہسپتال جانے لگے۔"

"ہسپتال میں مریض تھے؟"

"درمیان میں کچھ دن تک نہیں تھے مگر ہسپتال دوبارہ شروع ہونے کے بعد پھر سے مریض آنے لگے۔ زیادہ تر زخمی مریض۔"

"زخمی مریض؟"

"ہاں۔ بہت دن تک عام مریضوں کو کوئی ہسپتال میں نہیں لایا۔ لائے تو صرف گولی کھائے ہوئے، سنگین کھبوئے ہوئے، ٹانگیں یا بازو اڑے ہوئے مریضوں کو۔ ایک اور قسم کے مریضوں کو لوگ ہسپتال میں لے کر آتے تھے۔ وہ ہماری زندگی کا درد بنے ہوئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی آواز بھاری ہو گئی۔ ہم لوگ خاموشی سے نظر اٹھا کر انتظار کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً آہ بھرتے ہوئے کہا، "(جبری) زنا کی شکار عورتیں۔ کم عمر لڑکیوں سے لے کر عمر رسیدہ عورتیں، مائیں، نانیاں، دادیاں.... کسی کو معافی نہیں ملی۔ بہت سی بوڑھی عورتیں گھروں سے نہیں بھاگیں۔ کم عمر لڑکیوں کو ہٹا کر خود سامنے آ گئیں۔ سوچتی تھیں کہ انہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا مگر پاکستانی حیوانوں نے انہیں بھی نہیں بخشا۔ ایک مریضہ کی زبانی سنا کہ وہ نماز ادا کر رہی تھیں۔ اسی حال میں انہیں کھینچ کر ریپ کیا گیا۔ ایک اور خاتون قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ شیطانوں نے قرآن شریف پرے دھکیل کر ان کے ساتھ زنا کیا۔"

ڈاکٹر صاحب بوجھل آنکھوں سے زمین کی طرف تکتے رہے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ زبان پر سے الفاظ گم ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خود کلامی کی، "اگر اللہ تعالیٰ موجود ہے تو ان شیطانوں کی تباہی یقینی ہے اور اگر یہ تباہ نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

۳ جولائی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج ڈاکٹر اے کے خان، ڈاکٹر نورالاسلام کے ہمراہ راولپنڈی جانے کے لئے کراچی کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل کا اجلاس بلایا گیا ہے راولپنڈی میں۔ یہ دونوں ڈاکٹر مشرقی پاکستان سے کونسل کے رکن ہیں۔ صرف چار پانچ روز کے لئے گئے ہیں۔ پھر بھی فکر ہوتی ہے۔ خیریت سے لوٹ کر تو آئیں گے؟ کتنے لوگ گاؤں سے شہر واپس آ کر نوکری جوائن کرنے کے لئے دفتر گئے لیکن دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے البتہ ایک آسرا ہے، ڈاکٹر ابراہیم کراچی میں مقیم ہیں۔ وہاں کے جناح پی جی ہسپتال میں تعینات ہیں۔ وہ میڈیکل ریسرچ کونسل کے چیئرمین بھی ہیں۔ اس اجلاس کا اہتمام انہوں نے ہی کیا ہے۔

سہ پہر کے وقت باغ میں کرسی ڈال کر سانو کے ساتھ بیٹھ کر یہی باتیں کر رہی تھی۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی سانو اٹھ کر اپنے مکان کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں شریف بھی گاڑی لے کر گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ گاڑی سے اتر کر انہوں نے دھیمی آواز میں کہا کمرے میں چلو۔ ان کی دونوں آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کسی دبے ہوئے اضطراب کی وجہ سے سارا چہرہ سرخ تھا۔

بیڈروم میں داخل ہو کر شریف نے کہا، ''رومی کا خط.....''

رومی کا خط! میرے ہاتھ پاؤں کانپ کر سارا جسم سن ہو گیا۔ اچانک بستر پر بیٹھ گئی۔ ''کدھر ہے؟''

شریف نے پتلون کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھا۔ غور سے دیکھا وہی پیاری جانی پہچانی لکھائی میں تین سطریں ''میں خیریت سے ہوں۔ مونی بھائی لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ان لوگوں کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو دے دینا''۔ رومی۔

''کہاں سے ملا؟ کون لایا ہے؟''

''وہ دولڑکے.... شہادت اور عالم، جو پچھلے ہفتے بانکا کے گھر پر گئے تھے۔ وہ لوگ آج میرے دفتر میں آئے تھے۔''

''پیسے مانگنے؟''

''نہیں۔ اب وہ برج مانگ رہے ہیں۔''

''برج؟ کیا مطلب؟''

شریف نے قہقہہ لگایا۔ اتنا دل کھول کر ہنستے ہوئے انہیں بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی سنجیدہ طبیعت کے کم گو آدمی ہیں۔ ہنستے بھی ناپ تول کر ہیں۔ اس قدر بے خود ہو کر ہنستے ہوئے کم ہی دیکھا ہے انہیں۔

شریف نے وضاحت کی، ''خالد مشرف نے بنگلہ دیش کے تمام برج (Bridge) اور کلورٹوں (Culverts) کی فہرست منگوائی ہے۔ ساتھ ہی برج اور کلورٹ تباہ کرنے کے بارے میں چند اطلاعات۔ برج کے کس کس پوائنٹ پر دھماکہ خیز مواد باندھ کر دھماکہ کرنے سے برج ٹوٹ جائے گا مگر نقصان بھی سب سے کم ہوگا، یعنی ملک آزاد ہو جانے کے بعد آسانی سے مرمت کیا جا سکے گا۔ اس بارے میں تفصیلی اطلاعات و ہدایات منگوائی ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ جتنا زیادہ ممکن ہو، ملک کے اندر برج اور کلورٹ ناقص کر کے پاک فوجیوں کی حرکت کو محدود کر دیا جائے۔

رومی کے بارے میں زبانی کچھ نہیں پوچھا آپ نے؟ وہ جہاں ٹھہرا ہے اس جگہ کا نام کیا ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟''

''وہ لوگ اگرتلہ کے قریب ایک جگہ پر مقیم ہیں۔ اس جگہ کا نام انہوں نے سیکٹر ٹو رکھا ہے۔ خالد مشرف اس سیکٹر کے کمانڈر ہیں۔ ڈھاکہ کے زیادہ تر لڑکے وہیں پر جاتے ہیں۔ ڈھاکہ سے اگرتلہ کی طرف کا علاقہ ہی سب سے زیادہ قریب پڑتا ہے۔ رومی وہاں پر گوریلا ٹریننگ لے رہا ہے۔''

''وہ کب تک آئے گا، انہوں نے کچھ نہیں بتایا؟''

''اتنی باتیں پوچھنا کیسے ممکن تھا؟ اتنے لوگوں کا رش اور کام کا دباؤ ہے دفتر میں۔''

۵ جولائی ۱۹۷۱ء بروز پیر

جامی سکول نہیں جاتا ہے۔ میں ہر مہینے ایک مرتبہ جا کر اس کی فیس دے آتی ہوں۔ ہیڈ ماسٹر خان محمد سالک صاحب اگر مصروف نہ ہوں تو ان کے ساتھ یا پھر ٹیچرز روم میں دوسرے ٹیچروں کے ساتھ بات چیت کر آتی ہوں۔ ڈھاکہ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں صرف دو سال نوکری کی ہے مگر اس دوران گورنمنٹ لیبارٹری سکول کے اساتذہ کے ساتھ جو پرخلوص تعلق بنا تھا اس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

آج سالک صاحب اپنے کمرے میں اکیلے ہی بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا کچھ بے تکلف گفتگو کا موقع ملا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ سالک صاحب فون پر بات کرنے لگے۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔ کسی طالب علم کے والد یا والدہ سے ہی بات ہو رہی تھی۔ سالک صاحب کی باتیں اس طرح کی تھیں۔

''جی ہاں، سکول تو کھلا ہوا ہے۔ ٹیچر، دفتر کے لوگ، چپڑاسی سب لوگ حاضر ہیں۔''

''جی، جی، روزانہ آتے ہیں۔ آج بھی پینتالیس کے قریب طالب علم آئے ہیں۔''

''نہیں، نہیں، ایک جماعت میں کیوں ہوگا۔ اٹھارہ جماعتیں۔''

''بھیجنا چاہیں تو ضرور بھیجئے۔ راستے کی ذمہ داری ہم لوگ کیسے لے سکتے ہیں بتائیے؟ سکول کے گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد سے ہماری ذمہ داری ہے۔''

مزید کچھ دیر تک تحمل کے ساتھ سنتی رہی۔ ''جی ہاں، جی نہیں، ہاں ہاں''، کرتے گئے۔ اس کے بعد فون بند کر کے ہنس دیئے۔ ''بے چارے گارجن! کسی طرح سے بھی فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں، بچے کو بھیجیں یا نہیں۔ گھر پر رکھنے کا اعتماد نہیں ہے، سکول بھیجنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی ہے گویا سر پر رکھنے سے جوں کھائے گی اور زمین پر دھرنے سے چیونٹی کھائے گی۔''

سالک صاحب کی بیگم اور بچوں میں سے کوئی بھی کوارٹر میں نہیں رہتا۔ ہر ایک کو مختلف جگہ پر رکھنے کا انتظام کیا ہے انہوں نے۔ صرف ایک لڑکا جونویں جماعت کا طالب علم ہے وہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا، ''کم از کم دیکھنے کے لئے ایک مگرمچھ کا بچہ ساتھ میں رکھا ہے۔''

کیا کروں بتائیے۔ سر پر تلوار لٹک رہی ہے چنانچہ محتاط رہنا ہی پڑتا ہے۔ رات کو گھر پر نہیں رہتا۔ ویسے پروا بھی نہیں کرتا۔ جب تک زندگی ہے کوئی نہیں مار سکتا۔ سو پہلے سے مرنے کا کیا فائدہ۔''

تھوڑی دیر کے بعد سوال کیا، ”جامی کہاں ہے؟ وہ گھر پر دل لگا کر پڑھائی تو کر رہا ہے نا؟ دیکھئے ڈھیل دے کر سب بھلوا مت بیٹھئے گا۔ سکول کا بائیکاٹ کرنا جتنا ضروری ہے، گھر پر بیٹھ کر سکول کی پڑھائی جاری رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

گھر پر لوٹ کر دیکھا صاد اور غالب، رومی کے بستر پر بیٹھ کر شطرنج کھیل رہے ہیں۔ جامی پلنگ کے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر بستر پر کہنیاں ٹکا کر گیم دیکھ رہا ہے۔ بارق کو آواز دے کر ناشتہ اور چائے کا کہہ کر میں بھی پلنگ کے دوسرے کونے پر کہنیاں رکھ کر فرش پر بیٹھ کر ان کی گیم دیکھنے لگی۔

۷ جولائی ۱۹۷۱ء بروز بدھ

پچھلے تین روز سے شریف اور بانکا کا نہانا، کھانا سب بند ہے۔ پورے ملک کے تمام برج اور کلورٹوں کی فہرست تیار کرنا آسان بات نہیں ہے۔ پہلا مرحلہ، روڈز اینڈ ہائی ویز کے ڈیزائن ڈویژن سے فائلیں نکلوانا تھا۔ ڈیزائن ڈویژن کے ایگزیکٹو انجینئر صمد، شریف کی بہت عزت کرتے ہیں۔ شریف جب ڈیزائن ڈویژن میں سرکاری نوکری پر تھے ان دنوں صمد کو ڈیزائن ڈویژن کے لئے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا لیکن پھول کے ساتھ کانٹے کی طرح صمد کے ساتھ قادر خان بھی موجود ہے، ڈیزائن ڈویژن کا غیر بنگالی ایگزیکٹو انجینئر۔ اس کی نظروں میں مشکوک ہوئے بغیر دفتر سے فائل نکلوانا کیسے ممکن ہوگا؟ بانکا، شریف اور منظور نے اکٹھے بہت صلاح مشورے کے بعد طے کیا کہ چیف انجینئر مسیح الرحمٰن صاحب سے رجوع کیا جائے۔ مسیح الرحمٰن صاحب نے قادر خان کو آرڈر کیا کہ برج کی فائلیں ان کے آفس میں پہنچا جائیں۔ وہاں سے رات کے اندھیرے میں فائلیں صمد کے گھر پر منتقل کی گئیں۔ اس کے بعد شریف اور بانکا کو دین و دنیا کا ہوش نہیں رہا۔ ۳۵۰۰۰ برج اور کلورٹیں۔ ان سب کی فہرستیں تیار کرنا آسان بات نہیں تھی پھر یہ کہ زیادہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلنا چاہئے۔ صمد کے گھر پر بیٹھ کر بانکا نے اپنے ہاتھوں سے فہرست کی نقل اتاری۔ شریف نے مختلف ٹائپ کے برجوں کی ڈرائنگ کروا کر ہر ایک کا حدود اربعہ درج کیا۔

شریف اور بانکا کے ہاتھ کی لکھائی کہیں پہچانی نہ جائے اس لئے ان دونوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کی کسی اور سے دوبارہ کاپی کروائی گئی۔

اب سب کچھ ریڈی ہو گیا ہے۔ کاغذوں کا پلندہ رول کر کے شریف گھر پر لے آئے ہیں۔ دونوں لڑکے آج کل میں گھر پر ہی آئیں گے، کاغذات لینے کے لئے۔ شریف نے انہیں بتا دیا تھا کہ اتنے سارے کاغذ اٹھا کر دفتر سے باہر نکلنا ان کے لئے مناسب نہیں ہوگا کیونکہ انجینئرز لمیٹڈ کے دفتر پر آئی بی کے لوگوں نے چوبیس گھنٹے نظر رکھی ہوئی ہے۔

۸ جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

پچھلی رات سے جامی بیمار ہے۔ بخار، کھانسی، سینے میں درد، سانس لیتے ہوئے شائیں شائیں آواز کے ساتھ تکلیف۔

شام کے وقت شریف اور میں باغ میں بیٹھے تھے۔ دولڑکے گیٹ سے داخل ہو کر آہستہ آہستہ چل کر ہمارے پاس آ کر کھڑے ہوئے۔ ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر بھی ایک نظر دیکھ کر ہی پہچان گئی۔ تن پر عام قمیض، پتلون، سر پر لمبے بال، تقریباً کندھوں تک چھوتے ہوئے، ہونٹوں پر مونچھیں.... سیکٹر ٹو کے جیالے.... شہادت اور حبیب العالم۔

لڑکوں نے مسکرا کر آداب کیا۔ شریف نے دھیمے لہجے میں کہا، ''بیٹھو۔'' دونوں سامنے رکھی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شریف نے کہا، ''سارا کچھ ریڈی ہے۔ گھر پر لا کر رکھا ہے ذرا سا سمجھ لینا ہوگا۔''

شریف کے میری طرف دیکھتے ہی میں اٹھ کر اندر چلی آئی۔ ڈائننگ ٹیبل کا جائزہ لیا، صاف ہی پڑا ہوا تھا۔ پاس کی کھڑکیوں کا پردہ بھی ڈالا ہوا تھا۔ کچن میں جا کر قاسم کو حکم دیا، ''چار عدد شامی کباب اور دو چوپ فوراً تل دو۔'' فرج کھول کر رس ملائی ایک پیالی میں نکال کر رکھ کے کہا، ''تلنا مکمل کر کے مٹھائی سمیت ٹرے پر سجا کر کوارٹر پلیٹ، چمچ، پانی سارا کچھ پندرہ منٹ کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر دے جانا۔ میں دوبارہ نہیں آسکتی۔ سمجھ گئے؟''

باہر نکل کر چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا، آس پاس کے کسی مکان کی کسی کھڑکی پر کوئی چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑک پر بھی کوئی نہیں تھا۔ شریف نے کہا، ''ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھو۔''

وہ تینوں کمرے کے اندر چلے گئے۔ میں باغ میں ہی بیٹھی رہی۔ گیٹ پر نظر رکھنے کے لئے۔ ان کے ساتھ جا کر بیٹھنے کو بہت دل چاہ رہا تھا، ان کی زبانی رومی کے بارے میں جاننے کو، مگر گیٹ چھوڑ کر اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جامی نے بھی بیمار ہو کر آج ہی بستر پر پڑنا تھا۔

شام گھنی ہو رہی تھی۔ ہمارے مکان سے الٹی طرف دو مکان چھوڑ کر رضا صاحب کا مکان ہے، وہاں سے ان کا لڑکا آ کر ہمارے گیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ ''خالہ ایک ضروری فون کرنا ہے۔'' میں نے کہا، ''فون تو خراب ہے بیٹے۔'' اس کے جاتے ہی تیزی سے مکان کے اندر آئی۔ ابھی فون کی گھنٹی بج جاتی تو مشکل ہو جاتی۔ دوسری منزل پر جا کر بیڈ روم میں ایکسٹنشن ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر ڈائل پر ایک نمبر گھما کر ریسیور فون پر سے

اتار کر رکھ دیا۔ اس کے بعد دوبارہ باغ میں جا کر بیٹھی۔ ہمارے گھر کی سیڑھیاں ڈائننگ روم کے اندر مشرق کی دیوار کے ساتھ ہیں۔ سیڑھیوں سے اترتے وقت قدم آہستہ رکھ کر ٹیڑھی نظروں سے کھانے کی میز کی طرف دیکھا۔ شریف میز پر ڈرائنگ والے کاغذات پھیلا کر ان پر انگلیاں رکھ کر سرگوشی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ ایک دو الفاظ ہی کانوں میں آئے: ایباٹمنٹ، پی آر، گرڈر، بیرنگ۔ دونوں لڑکے کاغذ کے اوپر جھک کر توجہ کے ساتھ سن رہے تھے۔

شام ڈھلنے کے بہت دیر بعد دونوں لڑکے کاغذوں کا رول ہاتھ میں اٹھا کر کمرے سے نکل آئے۔ میرے حلق میں لقمہ سا پھنس گیا۔ کاغذوں کا رول ہاتھ میں اٹھا کر زیادہ دیر باہر رہنا خطرناک ہے۔ انہیں جلدی سے اپنے ڈیرے پر پہنچ جانا چاہئے۔ ایک بھی سوال پوچھوں تو دیر ہوگی۔ گونگے کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ وہ لوگ بھی ماتھے تک ہاتھ اٹھا کر خاموشی کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل گئے۔

۹ جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج سویرے ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے اسباب ہلا جلا کر سیٹنگ تبدیل کر دی۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان میں روم ڈیوائڈر کے طور پر دو الماریاں رکھی ہیں۔ کمرے کا یہ حصہ ۱۶ فٹ چوڑا ہے۔ دونوں الماریاں چار چار فٹ کی ہیں۔ الماریوں کے دونوں طرف چار چار فٹ جگہ خالی ہے۔ مین دروازے سے اندر داخل ہو کر بائیں طرف ڈرائنگ روم اور دائیں طرف ڈائننگ روم ہے۔ کوئی شخص دروازے سے اندر داخل ہو کر دائیں طرف نظر ڈالے تو ڈائننگ ٹیبل سمیت پورا کمرہ نظر آ جاتا ہے۔ شریف، قاسم، بارکی اور ڈرائیور امیر الدین، چاروں نے مل کر دونوں الماریوں کو دھکیلا اور مین دروازے کے ساتھ والی دیوار پر لگا دیا۔ اب اس طرف کی دیوار سے لے کر کمرے کے آٹھ فٹ اندر تک دونوں الماریاں کھڑی ہو گئیں۔ دروازے کے اندر داخل ہو کر دائیں طرف نظر ڈالنے سے بھی ڈائننگ روم نظر نہیں آئے گا۔ اب باقی آٹھ فٹ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ڈائننگ روم کے شمال مغربی کونے میں چار فٹ چوڑی جو الماری رکھی تھی اسے دھکیل کر کمرے کی دوسری دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اب اس الماری اور پہلے کی دونوں الماریوں کے درمیان چار فٹ کا خالی رستہ بچا۔ بس خوبصورت دو علیحدہ کمرے بن گئے۔ درمیان کے خالی حصے میں ایک پردہ ٹانگ دوں گی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا ڈائننگ روم میں کون کیا کر رہا ہے مگر ایک مسئلہ رہ گیا۔ روم ڈیوائڈر کے طور پر استعمال ہونے والی دونوں الماریوں کے دونوں جانب پٹ لگے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم کی طرف کتابیں رکھنے کے لئے اور ڈائننگ روم کی طرف کے حصے میں پلیٹ، گلاس وغیرہ رکھنے کے لئے۔ ان الماریوں کی کوئی پشت نہیں ہے لیکن دوسری الماری کا پچھلا حصہ بغیر پالش کے حقیقتاً پشت ہے اور پشت کا حصہ ہی ڈرائنگ روم سے نظر آ رہا ہے۔ اس طرف کچھ لگا دینا چاہئے۔ درمیان کی چار فٹ جگہ کیلئے پردے کا کپڑا خریدتے وقت دکان سے پسند کر کے ایک موٹے کپڑے کا ٹکڑا لے آئی تھی۔ کریم کلر کے موٹے کپڑے پر بیچ بیچ میں مختلف رنگوں میں ملبوس رقاصاؤں کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ کپڑے کا یہ ٹکڑا الماری کی پشت پر کیلوں سے ٹھونک دیا۔ پردے کے لئے گہرے نیلے رنگ کا موٹا کپڑا خریدا تھا تاکہ پردے کے ایک طرف بیٹھ کر دوسری طرف کا کچھ نظر نہ آ سکے۔ یہ سارا کام ختم کرنے میں شام ہو گئی۔ سارا دن کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔

سارا کام مکمل ہونے کے بعد دونوں کمروں کے پنکھے فل سپیڈ میں چلا کر گھوم پھر کر جائزہ لینے لگی کہ کسی

طرح ڈائننگ روم کے اندر کا حصہ نظر آتا ہے یا نہیں۔ گہرے رنگ کا اتنا بھاری پردہ تیز پنکھا چلنے پر بھی نہیں اڑتا۔ پورے دن کی محنت کامیاب ہوئی ہے۔ اب جس وقت مرضی پڑوسی فون کرنے آئیں۔ فکر کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔

۱۰ جولائی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

ڈاکٹر صاحب صحیح وسالم راولپنڈی سے لوٹ آئے ہیں۔ دوپہر کے وقت اکٹھے کھانا کھانے کے بعد ان سے کراچی اور پنڈی کے دورے کے بارے میں سنا۔ کراچی پہنچ کر ہوٹل میں آنے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر ابراہیم صاحب کو فون کیا۔ وہ فوراً ان کے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ڈھاکہ اور پورے مشرقی بنگال کے حالت کے بارے میں جاننا چاہا۔ ڈاکٹر ابراہیم نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر پنڈی میں اجلاس کا انتظام کروایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں کے ذریعے اصل خبر معلوم کرسکوں۔ اے کے خان اور ڈاکٹر نورالاسلام کی زبانی ڈھاکہ اور پورے مشرقی بنگال کی حالت کے بارے میں سن کر وہ بہت رنجیدہ اور پریشان ہوگئے۔ کراچی میں ایک رات گزار کر اگلے روز ڈاکٹر ابراہیم سمیت تینوں ڈاکٹر میٹنگ کے لئے پنڈی چلے گئے۔

چار بجے کے قریب میں نے تجویز دی، ''چلیں سارے اکٹھے کاؤرن بازار چلتے ہیں۔ سرخ ''بروٹی'' چاول خرید لائیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا، ''چاول بعد میں خریدیں گے، پہلے ٹیوب ویل فٹ کروانے کا کام نمٹایا جائے۔''

ڈھاکہ میں کچھ روز سے افواہ پھیلی ہے کہ مکتی باہنی کے گوریلے آہستہ آہستہ سارے پاور سٹیشن ناقص کر دیں گے۔ شہر میں لائٹ، پانی کچھ نہیں رہے گا۔ شریف کئی روز سے گھر پر ٹیوب ویل فٹ کروانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہمارے باتھ روم میں ویسٹرن کموڈ ہے مگر پانی فلش کرنے کا سسٹم پرانے دور کا ہے۔ سات فٹ بلندی پر لگا ہوا ہے۔ چھت کی ٹنکی سے پائپ کے ذریعے پانی آتا ہے۔ انہیں تبدیل کر کے تین فٹ اونچائی پر ''لو ڈاؤن'' لگانے کے بارے میں بھی شریف غور وفکر کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ٹنکی میں پانی نہ رہے تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ''لوڈاؤن'' کا ڈھکنا اتار کر بالٹی سے پانی بھر کر فلش کیا جاسکے گا۔

ڈاکٹر صاحب راجشاہی واپس جانے سے پہلے ہی ٹیوب ویل فٹ کروانے کا کام مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مرتبہ وہ اکیلے جائیں گے۔ سانو بھکو، لونت ڈھاکہ میں ہی رہیں گے۔ عنائت پور میں خط لکھ کر کھوکن اور منجو کو ڈھاکہ آنے کے لئے کہہ دیا ہے۔

شام کو شریف ڈھاکہ کلب گئے ٹینس کھیلنے کے لئے۔ شام سے پہلے گھر پر لوٹ کر دیکھا بارق اور قاسم دونوں بستر، بکسے وغیرہ لے کر غائب ہوگئے ہیں! حیرت ہے! جامی اوپر کی منزل میں تھا۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

قسمت اچھی ہے کھلے دروازے سے کوئی چور یا فقیر اندر نہیں گھس آیا۔

۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء بروز پیر

بارق اور قاسم کے بھاگ جانے کے بعد پہلا ردعمل یہ تھا کہ چلو اچھا ہی ہوا ہے۔ اب اکثر پانی کے لئے آتے جاتے رہیں گے۔ گھر پر ملازم نہ رہنا ہی محفوظ ہے۔ پرسوں رات کو ٹیبل لگانا، کھانا گرم کرنا، کھانے کے بعد ٹیبل صاف کرنا، پلیٹ برتن وغیرہ دھونا ان سارے کاموں میں جامی اور شریف دونوں نے مدد کی۔ کل اتوار کا دن تھا۔ دونوں جا کر بازار سے سودا لے کر آئے ہیں۔ باورچی خانے کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹایا ہے چنانچہ تھکن کا اندازہ نہیں ہوا۔

اس گھر کی ایک بیماری ہے حد سے زیادہ مہمان آنا۔ میرے مہمان، شریف کے مہمان، جامی کے مہمان، بابا کے مہمان اور اب ایک نئی طرح کے مہمان آنے لگے ہیں۔ صبح مہمان، دوپہر کو مہمان، شام کو مہمان، رات کو مہمان۔ ان کی مہمانداری میں کتنی محنت ہوتی ہے نوکروں کی موجودگی میں پتہ نہیں چلتا۔ کل اتوار کے روز پھر بھی شریف اور جامی نے چائے بنائی، ٹرے پر لے جا کر مہمانوں کے سامنے رکھی لہٰذا مجھے اتنا پتہ نہیں چلا۔ اسی وجہ سے کل شام کے وقت مالو میاں جب دونوں مفروروں کو پکڑ کر لے آیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ انہیں دوبارہ نہیں رکھوں گی۔ (مالو میاں گورنمنٹ لیبارٹری سکول کا چپڑاسی ہے۔ بہت سالوں سے گھر پر کام کرنے کے لئے نوکر سپلائی کرنا اس کی ایک ایکسٹرا ڈیوٹی ہے۔)

مگر دو دن گزرتے گزرتے تنگ آ گئی ہوں۔ پرانی ملازمہ رینو کی ماں کو ڈھونڈ کر نکالا۔ دن میں دو مرتبہ آ کر کام کر کے چلی جائے گی۔ یہی بہتر ہے۔ گھر پر کون آیا کون گیا اتنا خیال نہیں کرے گی۔ شہادت اور عالم کے ساتھ رومی کے بارے میں بات چیت نہیں کر سکی، اس افسوس میں چند دن تک بہت تکلیف اٹھاتی رہی مگر اب وہ افسوس نہیں رہا۔ رومی جہاں پر گوریلا ٹریننگ لے رہا ہے اس "میلہ گھر" سے آ کر مختلف دنوں میں ضیاء، منو، دلو اور پرویز نے میرے ساتھ ملاقات کی ہے۔

پرویز نے کہا، "خالہ اس طرف آنکھوں کا ایک مرض پھیلا ہے۔"

میں نے اس کی بات ٹوک کر کہا، "یہاں پر بھی تو پھیلا ہوا ہے۔ پچھلے مہینے سے شروع ہوا ہے، ہمارے واقف کاروں میں سے بہت سے لوگوں کو لگی ہے۔ بہت تکلیف دیتا ہے۔ قسمت اچھی ہے کہ ہمارے گھر میں داخل نہیں ہوا۔ سنا ہے تم لوگوں کی طرف سے ہی مرض آیا ہے؟"

بات مکمل کرنے کا موقع نہ ملنے پر پرویز خاموش ہو گیا تھا۔اب اس نے دوبارہ منہ کھولا۔"سب لوگ تو کہتے ہیں اس طرف سے مرض ادھر گیا ہے۔"

"یہاں پر کیا مشہور ہے جانتے ہو؟ پاک فوجیوں نے اس مرض کا نام دیا ہے جوئی بنگلہ آنکھوں کی تکلیف۔سنا ہے انہی کو یہ مرض زیادہ ہو رہا ہے۔وہ کہتے ہیں بچھو گوریلاؤں سے بھی زیادہ بچھو ہے یہ مرض۔"

واقعی بچھو مرض ہے خالہ۔اتنی جلن ہوتی ہے کہ آنکھ کھولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ہر وقت کھجلی ہوتی رہتی ہے اور پانی بہتا ہے۔آنکھیں سرخ ٹماٹر ہوئی رہتی ہیں۔"

"ہاں۔یہاں کے اخباروں میں بھی اس بارے میں بہت لکھا گیا۔وائرل کنجنکٹیوائٹس کہتے ہیں شائد۔ٹھیک ہونے میں سات آٹھ دن لگ جاتے ہیں۔دوائی استعمال کرنے سے بھی اتنے دن تک تکلیف رہتی ہے۔اصل میں دوائی سے علاج نہیں ہوتا۔وقتی طور پر تکلیف میں کمی آتی ہے صرف۔"

"البتہ ہومیوپیتھی کی ایک دوائی ہے خالہ۔شروع میں ہی کھالی جائے تو مرض نہیں لگتا۔"

واقعی؟ نام جانتے ہو اس دوائی کا؟"

"ہاں بلیڈونا۔سکس۔"

"ٹھیک ہے پرویز میں بلیڈونا۔6 خرید کر رکھوں گی۔تم میلہ گھر واپس جاتے وقت میرے پاس سے لے جانا۔"

۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

آج ایس ایس سی کا امتحان شروع ہو گیا ہے۔ ٹٹو اسی سال کا امیدوار ہے لیکن وہ امتحان نہیں دے رہا۔ بنگالی طالب علموں کو امتحان کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے تقریباً ایک مہینے سے مختلف جگہوں پر خفیہ لیف لٹ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ اس بارے میں محلوں میں گھروں پر بات چیت، بحث و مباحثہ چل رہا تھا۔ امتحان کے امیدوار لڑکے لڑکیوں کے والدین کا دماغ چکرانے لگا ہے۔ ایسی باتیں بھی سنائی دے رہی ہیں کہ طلباء امتحان دینے گئے تو امتحانی سنٹر پر بم مارا جائے گا۔

دوسری طرف حکومت کی طرف سے امتحان کے حق میں بہت ڈنکہ بجایا جا رہا ہے۔ پچھلے کئی روز سے مائک پر اعلان کیا جا رہا ہے کہ طلباء اور طالبات ملک دشمنوں کی بدنیتی پر مبنی، جھوٹے پروپیگنڈے کے بہکاوے میں آ کر اپنا قیمتی سال ضائع نہ کریں۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے قیوم گروپ کے چیئرمین ہاشم الدین، پاکستان امن اور فلاحی کمیٹی کے چیئرمین فرید احمد اور جنرل سیکرٹری مولانا نور الزمان اور ان کی طرح کے بہت سے محب وطن عوام رہنما چند روز سے امتحان کے حق میں اتنے زور و شور سے بیانات جاری کر رہے ہیں کہ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا ہے۔ امتحانی مرکز پر پولیس متعین کی گئی ہے۔ ان کی مدد کے لئے کثیر تعداد میں رضا کاروں کو خصوصی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ہر چوک پر پولیس موجود ہے۔ سڑکوں پر موبائل پولیس گھوم رہی ہے۔ رضا کاروں کو اس موقع پر خاصی اہمیت مل گئی ہے۔

آج ڈھلو اور چشی اپنے کنبے کے ساتھ اسلام آباد سے ایک ماہ کی چھٹی پر ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ شریف پونے چار بجے گاڑی لے کر ائیر پورٹ گئے۔ جامی کو بابا کے پاس چھوڑ کر میں پانچ بجے امی کی طرف چلی گئی۔ ڈھلو لوگ سوا پانچ بجے آئے۔ کتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ دونوں بہنیں آپس میں لپٹ کر کچھ دیر تک روئیں۔ امی اور لالو نے بھی آنسو بہائے مگر میرے آنسو تو کسی بھی طرح رک نہیں رہے تھے۔ کیوں؟ کیا یہ آنسو رومی کے لئے بھی تھے؟

۱۷ جولائی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

کل شام کے بعد ڈاکٹر صاحب کا بیٹا کھوکن اور اس کی چھوٹی خالہ منجو عنائت پور سے ڈھاکہ پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پرسوں صبح راجشاہی چلے گئے تھے جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکی۔

آج صبح باورچی خانے میں ترکاری کاٹتے ہوئے منجو سے اس کے تلخ تجربے کے بارے میں سن رہی تھی جو اسے ڈھاکہ تک آنے کے دوران رستے میں پیش آیا۔ منجو لوگ عنائت پور سے دریائے جمنا کے گھاٹ سے لانچ پر سوار ہوئے۔ لانچ سراج گنج چھوتے ہوئے ٹنگائل کے بھوا پور گھاٹ پر آ کر رکی۔ یہاں پر منجو کے ایک بہنوئی شاہ جہان ڈھاکہ سے گاڑی لے کر آ گئے تھے۔ وہاں سے گاڑی پر ڈھاکہ آئے ہیں۔

لانچ پر دریا کے بیچ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے یاد کر کے منجو اب بھی سہم اٹھتی ہے۔

''سمجھیں آپا، سراج گنج کے گھاٹ سے لانچ چلنے کے بعد اچانک آرمی سے بھرا ہوا ایک سٹیمر ہماری لانچ کے قریب آ گیا، چیخ کر لانچ روکنے کا حکم دیا گیا۔ ہم لوگ تو خوف کے مارے سہم گئے شائد ابھی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مگر وہ لوگ ایک مخصوص شخص کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ سراج گنج کے قومی جوٹ مل کے انجینئر ہیں۔ انہیں پکڑ کو وہ لوگ لے گئے۔ دوسری سواریوں کو کچھ نہیں کہا۔

''انجینئر صاحب کو تم پہچانتی ہو؟''

''نہیں آپا۔ کیسے پہچانتی؟ ان کو پکڑ لے جانے کے بعد لانچ پر دوسرے لوگ بات چیت کر رہے تھے سو میں نے بھی سنا۔ مجھے سب سے بری بتاؤں کون سی بات لگی؟ فوجی جس طرح سے ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے، ''آپ جیسے مشہور شخص کو اتنی چھوٹی لانچ پر سفر کرنا زیب نہیں دیتا۔ یہ دیکھئے ہم آپ کے لئے کتنا بڑا سٹیمر لے آئے ہیں۔''

میرے سینے سے ایک دہکتا سانس نکل گیا۔ انجینئر صاحب یقیناً خفیہ طور پر جنگ آزادی میں شامل تھے۔ ان کی قسمت خراب تھی کہ یہ بات کسی طرح پاک آرمی کے علم میں آ گئی۔ مخبری کرنے والے دلال، رضا کاروں کی تو کمی نہیں ہے۔ دھرتی سے پیار کرنے کے نتیجے میں اسی طرح موت کو قبول کرنا پڑتا ہے! قسمت کو خراب کیوں کہہ رہی ہوں؟ یہ تو اس شخص کے لئے فخر کی بات ہے۔

فخر کی بات؟

یکا یک یاد آ جائے تو سانس رکنے لگتا ہے۔ لوہے کے شکنجے سے جیسے پھر کسی نے پسلیوں کو جکڑ لیا ہو۔
ترکاری کاٹنے کا کام جاری نہیں رکھ سکی۔ ڈرائنگ روم میں آ کر چوکی پر لیٹ گئی۔ منجو گھبرا کر جامی کو آوازیں دینے لگی۔ میں نے کہا، ''فکر مت کرو، چند روز سے طبیعت ذرا خراب ہے۔ محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے، کھانا پکانے والا ملازم نہیں ہے اس وجہ سے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

۱۸ جولائی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

شریف کے دانتوں میں شدید درد اٹھا ہے۔
الجھے ہوئے بال لے کر فقیر آ پہنچے.... بولے "بھابی بزرگوں کی دعا ساتھ تھی اس لئے بچ کر آ گیا ہوں۔"
"کیا ماجرا ہے؟ کہاں تھے.... کیا ہوا؟"
"زندگی میں پہلی مرتبہ آنکھوں کے سامنے گوریلا آپریشن ہوتے ہوئے دیکھا۔"
"سچ کہہ رہے ہیں؟ ٹھہریئے ابھی شروع مت کیجئے گا۔ چولہے پر سے ہانڈی اتار کر آتی ہوں۔"
"سہ پہر کے وقت ایک کام سے جناح ایونیو گیا تھا۔ وہ جو گینر کی دکان ہے وہاں پر کچھ نوجوانوں نے بچھو گولیاں اور گرینیڈ پھینکے جس سے چند پولیس والے مر گئے۔ اف! کیا ہمت ہے ان لڑکوں کی، بالکل سرعام، دن کی روشنی میں....."
خوشی اور جوش میں فقیر کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ پورا چہرہ سرخ ٹماٹر ہو گیا ہے۔ دانتوں کا درد بھول کر شریف سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، پوچھنے لگے، "آہا! ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ کتنے لڑکے تھے؟ کس چیز پر آئے تھے؟"
"گنا تو نہیں، دو لڑکوں کے تو دیکھا ہاتھوں میں سٹین گن یا شائد مشین گن ہو گی۔ دکان کے اندر داخل ہوئے اور برسٹ فائر کی آواز آئی۔ ایک گرینیڈ بھی چلایا، باہر گاڑی ایک تھی تو سہی مگر "گینز" کے سامنے نہیں تھی۔ دکان کے سامنے شائد ایک موٹر بائک تھی۔ ایک لڑکا موٹر بائک ہی پر بیٹھا ہوا تھا۔"
میں نے ٹوک دیا۔ "ایک بات بھی ٹھیک طرح سے نہیں بتائی! صرف "شائد" اور "لگتا ہے کہ.....!"
جامی نے کہا، "امی تم انکل کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ اس وقت مشین گن سے فائر ہو رہا تھا پولیس کے آدمی مر رہے تھے، لوگ یقیناً بھاگ دوڑ بھی رہے ہوں گے، ہے نا انکل؟ آپ نے اس وقت کیا کیا؟ کہیں بھاگ کر پناہ نہیں تلاش کی؟" فقیر صوفے پر ٹیک لگا کر بولے، "بھاگ تو یقیناً رہا تھا ایسی صورتحال میں، سیڑھیوں کے نیچے ایک کمرہ سا تھا وہاں گھس کر چھپ گیا۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔"
شریف نے پھر سوال کیا، "کتنے لوگ مرے ہیں، پتہ لگا؟"
"نہیں۔ لڑکوں کے چلے جانے کے بعد جلدی سے وہاں سے کھسک آیا۔ فوراً ہی تو فوجیوں سے بھر

جائے گا پورا علاقہ البتہ آتے ہوئے دیکھا کہ گیہیز کے دروازے کے سامنے چند ملیشیا گرے پڑے ہیں۔"

ایسے دلچسپ موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے کیسے دو گھنٹے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ آج کل گوریلے خوب پھرتیلے ہو گئے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں امتحانی مرکزوں پر اکثر بم کے دھماکے کر رہے ہیں، سخت پہرے کے باوجود۔ کس طرح سے کر لیتے ہیں وہ لوگ؟ موت کا ذرا بھی خوف نہیں ہے انہیں؟

زندگی اور موت ان کے پیروں کے غلام ہیں!

رات کے دس بج گئے تو فقیر سمیت ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔

۱۹ جولائی ۱۹۷۱ء بروز پیر

مالو میاں آج پھر سے بارق کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ان چند دنوں میں کام کی تھکن سے میرا دل پھر نرم پڑ گیا ہے۔ مالو میاں کی التجا اور بارق کے معافی مانگنے کے بعد اسے دوبارہ کام پر رکھ لیا ہے۔ قاسم کسی دوسرے مکان میں کام پر لگ گیا ہے۔ بارق کی نوکری کہیں نہیں لگی۔ جامی نے کہا، ''اچھا ہی ہوا ہے۔ ایسے ہنگاموں کے دنوں میں گاؤں جا کر فاقے سے مر جاتا۔'' میں نے ہنس کر کہا، ''ہاں.... اور بارقے نہ آتا تو تم بھی مر جاتے... دادا کی ڈیوٹی کرتے کرتے۔''

پرویز آیا ہے شام کے بعد۔ وہ اگلے روز واپس جائے گا۔ میں نے پہلے ہی بلیڈونا۔6 کی چند شیشیاں خرید رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک نیل کٹر اور تین عدد سن گلاس بھی خریدے ہیں۔ ''ایک سن گلاس اور ایک نیل کٹر رومی کیلئے ہیں، باقی تم سب لوگ استعمال کرنا، جسے جب ضرورت ہو۔'' پرویز کو دو سو روپے دیئے۔ ایک سو تم خرچ کرنا اور ایک سو رومی کو دینا۔

یہ باتیں کرتے کرتے اچانک گولیاں چلنے کی آواز پر چونک اٹھی۔ پرویز نے کہا لگتا ہے قریب ہی کہیں سے آواز آ رہی ہے۔''

بات ختم کرتے کرتے بجلی چلی گئی۔ میں نے ہنس کر کہا، ''لگتا ہے شروع ہو گیا۔'' موم بتی جلاتے ہوئے سوچنے لگی کہ گولیوں کی آواز کس طرف سے آئی تھی؟ شمال مشرق کی طرف سے ہی تو لگ رہا تھا۔ اس طرف کہاں پر۔۔۔؟ شریف نے کہا'' کیوں؟ پی جی ہسپتال کے راستے پر تالاب کے اس پار جو پاور سٹیشن ہے وہاں پر ہو سکتا ہے۔

جامی نے اچھل کر کہا، ''ہاں ہاں! ریلوے لائین پار کر کے مین روڈ کے بائیں طرف اونچی دیوار اور خار دار کانٹوں سے گھرا ہوا سب سٹیشن.....'' بات کرتے ہوئے درمیان میں جامی نے اچانک یاہو کہہ کے چیخ ماری اور ایک چھلانگ لگائی..... ''اس کو دھان منڈی سب سٹیشن کہتے ہیں نا؟ مار دیا معرکہ! جے ہو مکتی باہنی کے گوریلوں کی۔''

میں نے خوفزدہ ہو کر ڈانٹ دیا۔ ''چپ کرو۔ اتنا چیخو مت۔ کہیں کوئی سن لے گا۔''

پرویز نے بے چین ہو کر کہا، ''مجھے اب جانا چاہئے۔''

''تھوڑی دیر کے بعد چلے جانا۔ راستے کے اندھیرے میں کوئی مصیبت کھڑی ہے کہ نہیں، کون جانتا ہے؟''

"نہیں اندھیرے میں ہی ہلکہ سہولت ہے۔ گولیوں کی آواز تو شاہ باغ کی طرف سے آئی ہے۔ میں نیو مارکیٹ کی طرف سے چلا جاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا خالہ۔ اس سے کہیں زیادہ رسک لے کر ہم چلتے پھرتے ہیں۔"

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد یکا یک بتی جل اٹھی۔ دل اداس ہو گیا۔ اتنی جلدی مرمت کر لیا؟ البتہ وولٹیج بہت کم تھے۔ اتنے کم کہ موم بتی سے زیادہ روشنی نہیں ہے۔

رات کا کھانا کھاتے وقت دوبارہ بجلی چلی گئی۔ ہم نے موم بتی جلا کر کھانا مکمل کیا۔ اوپر بیڈ روم میں جا کر ریڈیو لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں وائس آف امریکہ سے بنگلہ کی نشریات شروع ہونی تھیں۔ آج کل ریڈیو میں سیل ہی استعمال کرتی ہوں ہر وقت تاکہ جب جہاں پر بیٹھ کر بھی ریڈیو سننے کو دل کرے سن سکیں۔ پورے مکان میں الیکٹرک تار اٹھائے پھرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت تو بجلی بھی نہیں ہے۔

آج وائس آف امریکہ کی خبر سن کر حیران رہ گئی۔ ڈھاکہ کی سڑک پر پاک فوج اور مکتی باہنی کے درمیان گن فائٹ۔ کیا کہہ رہے ہیں؟ بالکل روبرو لڑائی؟ گولیوں کا تبادلہ؟ کہاں؟ ہمیں تو پتہ نہیں چلا۔ گولیوں کی آواز تو سنی تھی مگر باقاعدہ گن فائٹ کی طرح خوفناک تو نہیں محسوس ہوئی۔

جانی نے کہا، "ہو سکتا ہے یہاں پر ہلکا پھلکا ہوا ہو، ڈھاکہ کے دوسرے علاقوں میں شدید لڑائی ہوئی ہو، ہمیں گھر پر بیٹھ کر پتہ نہ چل رہا ہو۔"

شریف نے کہا، "ابھی چاروں طرف کافی سنسان محسوس ہو رہا ہے۔ ایک بات تو طے شدہ ہے کہ اس وقت گن فائٹ نہیں ہو رہی۔ خیر کل پتا کروں گا کہاں پر کیا ہوا ہے۔ فی الحال سویا جائے۔"

میں نے کہا وائس آف امریکہ نے بی بی سی کا حوالہ دیا ہے۔ بی بی سی نے پہلے ہی بتایا ہے کیا؟ آج ہم نے بی بی سی نہیں سنا۔ لیکن بی بی سی کی بنگلہ نشریات کا وقت ہے پونے آٹھ بجے سے سوا آٹھ تک۔ یہاں پر واقعہ تو اسی وقت پیش آیا ہے۔ پھر؟

شریف نے کہا، "کیوں بی بی سی انگریزی خبر میں بھی تو بتا سکتی ہے۔ بی بی سی سے ہر گھنٹے کے بعد انگلش میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ کل پتا کر کے دیکھتا ہوں کسی نے سنا ہے یا نہیں۔"

رات کو نیند اچھی نہیں آئی۔ بے چینی کے مارے پورے جسم میں کانٹے چبھتے رہے۔ کیا افواہ حقیقت میں بدلنے لگی ہے؟ ڈھاکہ شہر میں بجلی نہیں رہے گی۔ لیکن کل صبح سے پہلے معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۲۰ جولائی ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج صبح سے پانی نہیں ہے۔ گزشتہ رات کو بجلی نہ ہونے کی وجہ سے میونسپلٹی کا پمپ نہیں چل سکا، یہی گمان ہوتا ہے۔ بارق کو ایک چھوٹی بالٹی دے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر کے ٹیوب ویل سے پانی بھر کر لانے کے لئے بھیجا۔ نیچے کے باتھ روم میں دو بالٹیاں بھر کر، باورچی خانے میں کئی دیگچیاں بھر لیں۔ نلکے پر پانی آنے سے پہلے کسی طرح پکانے اور ہاتھ منہ دھونے کا سلسلہ ہو جائے۔

شریف نے دفتر جا کر ہی فون کیا۔ ''سنو، جامی کو پی جی کی طرف والی سڑک پر جانے سے منع کرو۔ دھان منڈی پاور سب سٹیشن کے سامنے اور آس پاس چاروں طرف بہت سے فوجی موجود ہیں۔ پورا علاقہ گھیر رکھا ہے۔ ریلوے لائین کے پاس سے ٹریفک کا رخ تبدیل کروا رہے ہیں۔ میں تو گاڑی گھما کر دوبارہ اپنے گھر کے سامنے سے بلا کا، نیل کھیت ہوتے ہوئے دفتر آیا ہوں۔''

''اور کوئی خبر ہے؟''

''ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے۔ خبر ملتے ہی فون کروں گا۔''

ساڑھے نو بجے کے قریب دھلو اور چشی آئے۔ راجشاہی ٹرنک کال کریں گے۔ لائن ملنے میں گیارہ بج گئے۔ بہت دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ کا موقع ملا۔

مغربی پاکستان کے عام لوگ، سنا ہے جانتے ہی نہیں ہیں کہ مشرقی پاکستان میں فوج اتنا خون خرابہ کر رہی ہے۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کے مضبوط انتظام کے باعث وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں بھارت نے مداخلت کی ہے اور اندرون ملک کچھ ''غدار بنگالی'' ان کی مدد کر رہے ہیں چنانچہ پاکستانی فوج بھارتیوں کو کچلنے اور ہندوؤں کو مارنے کی ذمہ داری نبھا رہی ہے۔

''آپا جانتی تو ہیں کہ مغربی پاکستان والے کس قدر بھارت مخالف ہیں۔ نفرت میں زیادہ شدت پیدا ہوئی ہے ۶۵ء کی بھارت پاکستان جنگ کے بعد سے۔ یحییٰ حکومت ان جذبات کا فائدہ اٹھا کر اس قدر بے شرمی کے ساتھ جھوٹا پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ اس کے علاوہ وہاں کے عوام بھی پاکستان کے اتنے عاشق ہیں کہ حکومت انہیں جو کچھ بتا رہی ہے، بغیر سوچے سمجھے اسی پر یقین کر کے بے فکری سے دن گزار رہے ہیں۔''

''وہاں کے لوگ کیا بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو آسٹریلیا وغیرہ نہیں سنتے؟''

''سنتے ہیں مگر یقین نہیں کرتے۔ وہ لوگ سرکاری گیت سن کر ہی مطمئن ہیں۔''

شریف نے گیارہ بجے کے قریب دوبارہ فون کیا۔ کل رات کو اولن اور گل باغ کے پاور سٹیشن پر شارٹ سرکٹ ہوا ہے۔''

''اور شاہ باغ میں؟''

''نہیں وہاں پر ٹھیک سے نہیں ہوا ہے۔''

''اولن کہاں پر ہے؟ اور گل باغ؟''

''اولن رامپورے کی طرف اور گل باغ کھل گاؤں میں۔ ایک اور خبر سنو، کل سہ پہر کے وقت صرف کیبیز میں ہی نہیں ووگ میں بھی حملہ ہوا ہے۔''

''واقعی؟ بہت خوب۔ ایک ہی ٹولا؟''

''صحیح معلوم نہیں ہوا۔ کوئی بھی نہیں بتا سکا۔''

''سنو، آج ہی دفتر سے واپسی پر لو۔ ڈاؤن خرید لانا۔ کموڈ استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ بالٹی سے پانی ڈالنے سے اچھی طرح فلش نہیں ہوتا ہے۔''

''لے آؤں گا۔ تم احد مستری کو سہ پہر کے وقت آنے کے لئے کہہ دو۔''

چشی سے کہا، ''تم لوگ واپس جاتے وقت دو لالٹین اور چند موم بتیاں خرید کر لے جانا۔''

ایک بجے کے قریب لولو آیا۔ کہنے لگا، ''کیا ہوا، کچھ معلوم ہے ممانی؟ دھان منڈی پندرہ نمبر روڈ پر کل رات کو کسی نے ایک گاڑی پر بم پھینک کر اسے تباہ کر دیا ہے۔ آج صبح سویرے وہاں پر لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ حرے کی بات جانتی ہیں؟ جیسے ہی روشنی بڑھی سب لوگ کھسک گئے۔''

''کیوں؟''

''روشنی بڑھنے کے بعد فوجی آئیں گے۔ وہ لوگ تو بچھوؤں کے خوف سے خود ہی اپنے اوپر کرفیو جاری رکھتے ہیں ساری رات۔''

''تم تو عظیم پور روڈ پر رہتے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا پندرہ نمبر روڈ کا واقعہ؟''

''ارے واہ! میں روزانہ صبح مارننگ واک کرنے نہیں جاتا؟''

''لولو، تم نے اولن، لال باغ کے بارے میں سنا ہے کسی سے؟ اور ہمارے محلے کا واقعہ؟''

لولو نے حیران ہو کر پوچھا، ''نہیں تو، کیوں کیا ہوا ہے؟''

لولو کو مختصراً پچھلی رات کا واقعہ اور شریف کے فون کے بارے میں بتایا۔ تمہارے ماموں آئیں تو ساری باتیں تفصیل سے معلوم ہوں گی۔ بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔''

ڈھائی بج گئے۔ شریف ابھی تک نہیں آئے۔ بے چین ہو رہی ہوں۔ ان کے آنے پر ہی اولن اور گل باغ کے واقعات کی تفصیل معلوم ہوگی۔ فون پر براہ راست بات کرنا خطرناک ہے۔ شارٹ سرکٹ سن کر ہی مطمئن

رہنا پڑا ہے۔

شریف نے واپس آ کر بتایا کہ "گوریلے ان دونوں پاور سٹیشنوں کے ٹرانسفارمر اڑا کر کامیابی سے ساتھ فرار ہو گئے ہیں۔ پاک فوجی کسی کو بھی پکڑ نہیں سکی البتہ دھماکے کے بعد سے دونوں علاقوں میں دہشت کا راج قائم ہو گیا ہے۔ پکڑ دھکڑ، گھر گھر تلاشی، سنا ہے کہ رامپور اور کھل گاؤں کے علاقوں میں پاک فوجی چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہے۔ اس طرف کی سڑکوں پر پیدل چلنا بھی خطرناک ہو گیا ہے۔

مجھے ڈر لگا۔ دھان منڈی سب سٹیشن کے واقعے کی وجہ سے فوجی دہشت میرے گھر تک تو نہیں پہنچ جائے گی؟ شریف نے کہا، "لگتا نہیں ہے۔ ہمارا مکان اس جگہ سے خاصا دور، گلی کے اندر ہے۔ وہ لوگ سب سٹیشن کے چاروں طرف تلاشی لے رہے ہیں۔ وہاں پر بچھوا اندر کی مشینوں کو خاص نقصان تو نہیں پہنچا سکے ہیں البتہ پولیس کے کافی سارے آدمیوں کو مار گئے ہیں۔"

شریف تین عدد لو۔ ڈاؤن خرید لائے ہیں اور مستری کام پر لگ گیا ہے۔ کم از کم ایک لو۔ ڈاؤن آج ہی لگا کر مکمل کرانا پڑے گا۔ پہلے دوسری منزل پر بابا کے باتھ روم کا کام شروع کروایا ہے۔ احد اسی محلے کا آدمی ہے۔ ضرورت پڑنے پر رات کے دس بجے تک بھی کام کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ٹیوب ویل بروقت لگا یا لیا گیا تھا۔ اس نے آج بہت کام دیا۔ میں نے تو صبح ہی پانی منگوا لیا تھا۔ سہ پہر کو دیکھا تمام گھروں سے لوگ، گھڑے، بالٹی، جگ لے کر جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کی طرف۔

دن کے وقت ڈومیسٹک لائن یعنی بتی اور پنکھوں کی لائن پر کرنٹ آیا تھا ایک دو مرتبہ۔ لائین پر پاور بالکل ہی نہیں تھی۔ شام کے بعد کسی لائین پر بھی بجلی نہیں رہی۔ سارا ڈھاکہ شہر گھپ اندھیرے میں ڈوبا رہا۔

سہ پہر کو ہی چار عدد لالٹین خرید لی تھیں۔ دکان پر شریف اور جامی گئے تھے آ کر بتایا، "لالٹین اور موم بتی خریدنے کے لئے دکان پر انتارش لگا ہوا ہے کہ کچھ نہ پوچھو، سب لوگ ہی خرید رہے ہیں۔ دکانداروں نے موقع پا کر قیمت بھی بڑھا دی ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹی ہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا دیکھا کہ منو آیا ہے۔

"اف خالہ! سارا شہر پانی میں ڈوب گیا ہے۔ اتنی بارش کبھی نہیں دیکھی۔"

ہمارے گھر کے اندر بھی تو پانی آ گیا تھا۔ فرش کے اوپر ایک فٹ تک اور سڑک پر کمر کمر پانی۔ ابھی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے سڑک پر سے پانی اترا ہے۔"

منو نے کمرے کے اندر ہر طرف بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھا۔ "واقعی؟ اچھا ہی ہوا ہے خالہ۔ اس بارش میں پاک فوجی بہت مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ اول تو انہوں نے کبھی اتنے بڑے دریا، ندیاں وغیرہ دیکھی ہی نہیں اس پر اتنی شدید بارش.... ڈھاکہ کی سڑکوں پر کمر برابر پانی تھا۔ اپنے ملک میں تو ڈرین جتنی نہر کے گھٹنوں برابر پانی میں بے چارے ڈوب مرتے ہیں۔"

ہم خوب ہنسے۔ پھر میں نے سنجیدہ ہو کر کہا، "اس کے بعد سے زیادہ محتاط رہنا منو۔ حکومت نے تو رضا کاروں کو بہت اختیار دے دیا ہے۔ فوجی آئین کا ضابطہ ۱۹۵ جاری کر کے رضا کاروں کو مرضی کے مطابق کسی کو بھی گرفتار کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ انہیں کثیر تعداد میں اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ کسی بھی شخص کو شک کی بنیاد پر گرفتار کر سکیں گے۔ گولی چلانے پر مختار ہوں گے۔"

شریف نے ذرا سا ہنس کر کہا، "یہ اختیارات رضا کاروں کو پہلے سے ہی حاصل تھے۔ اب فوجی آئین کا اعلان کر کے ان اختیارات کو جائز کرایا گیا ہے۔"

منو نے کہا، "پاکستان کی حکومت اب خاصی پریشان ہو چکی ہے۔ ڈھاکہ شہر میں بچھو روزانہ کوئی نہ کوئی واقعہ برپا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پورے ملک کے سرحدی علاقوں میں تو زوروں پر لڑائی جاری ہے۔ کچھ کچھ سرحدی علاقے آزاد بھی ہو گئے ہیں لہٰذا حکومت کو اب رضا کار تو کیا کوئی دوسری فورس بھی تشکیل دینا پڑے تو وہ بھی کر دے گی۔"

"مغربی پاکستان سے کثیر تعداد میں ملیشیا بھی تو لا رہے ہیں وہ جو گرے رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس سپاہی ہیں۔"

"ہاں وہ بھی تو پورے ملک میں پھیل گئے ہیں۔"

کچھ دنوں سے دل پر بالکل بھی قابو نہیں پا رہی تھی۔ (منو کے آنے سے ذرا بہتر محسوس کیا)۔ دل ہر وقت اداس رہتا ہے۔ کوئی تھوڑا سا جواز مل جائے تو چھپ کر یا سب کے سامنے ہی رو پڑتی ہوں۔ ہر وقت سینے میں درد رہتا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک اور بات دل میں بار بار جاگ رہی ہے "دوسرے لڑکے اکثر ڈھاکہ آ رہے ہیں مختلف قسم کی ذمہ داریاں لے کر۔ روی کیا ایک بار بھی نہیں آ سکتا؟" آخر یہ بات لب پر آ ہی گئی۔

منو بولا، "آئے گا خالہ۔ ضرور آئے گا۔ اس کی ٹریننگ شائد ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ تو بہت دیر سے گیا ہے۔"

"درست بات ہے۔ روی کو جانے سے میں ہی شروع میں روکتی رہی۔"

منو اگلے روز واپس جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں دو سو روپے دیئے۔ مکتی باہنی کو ان دنوں پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ جب جس کے ذریعے ممکن ہو بھیج رہی ہوں۔ پرویز لے کر گیا ہے۔ ٹٹو کے ہاتھ دو بار دو سو دیئے ہیں۔ ٹٹو کے ذریعے راجو نام کے مکتی باہنی کے ایک لڑکے سے تعارف ہوا ہے۔ اس کے ذریعے بھی کئی موقعوں پر دو سو، پانچ سو بھیجا ہے۔ ہمارے پاس خود زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہی پیسوں کا انتظام کر دیتا ہے۔ شریف کے انجینئر دوست، پاکستان کنسلٹنٹس کے ڈائریکٹر مجید صاحب صرف دو لڑکیوں کے والد ہیں۔ دونوں لڑکیوں کی شادیاں کر دی ہیں۔ وہ اب ملک سے باہر ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ اب ملک کی فلاح کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں مگر پیسے بھیجنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے لہٰذا شریف سے گزارش کی ہے۔ اپنا سیونگ سرٹیفکیٹ تڑوا کر پانچ پانچ ہزار کی دو قسطوں میں دس ہزار کی رقم شریف کے حوالے کر گئے ہیں۔ شریف نے یہ پیسے وقتاً فوقتاً مکتی باہنی کے مختلف آدمیوں کے ذریعے بھجوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک وقت میں لڑکے بڑی رقم لے جانے کا رسک نہیں لینا چاہتے۔ بہتر ہے کہ جب بھی کوئی آئے تھوڑی بہت رقم لے جائے۔

مجید صاحب نے ایک شرط بھی رکھی ہے کہ ان کے پیسوں کے بارے میں کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ شریف آمادہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے البتہ مجھے اس بارے میں آگاہ کر دیا ہے تاہم اپنی زوجہ کو بتانا شرط کی خلاف ورزی میں شمار نہیں ہوتا۔

تینوں باتھ روم میں لو۔ ڈاؤن لگانے کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ احد مستری نے آج سے مکان کے اندر صحن میں ٹیوب ویل لگانے کا کام بھی شروع کیا ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج احد مستری نے ٹیوب ویل کا کام مکمل کرلیا اور ساتھ ہی دوپہر سے ڈائریکٹ نلکے پر بھی تھوڑا تھوڑا پانی آنا شروع ہوگیا۔ سہ پہر تک پاور لائین بھی درست ہوگئی۔

لائٹ اور پانی آنے کی وجہ سے سہولت تو ہوئی ہے مگر دل کے کسی گوشے میں کسی ایک ناکامی کا احساس تکلیف دے رہا ہے۔ ڈھاکہ جیسے شہر میں کرنٹ نہ رہے، بجلی کی بتیاں نہ جلیں، نلکے پر پانی نہ آئے، روشنی کے لئے لالٹین جلانی پڑے، ٹیوب ویل سے پانی حاصل کرنا پڑے.....اس طرح کی صورتحال میں دل ۲۵،۳۰ سال ماضی میں، بچپن کے دنوں میں واپس جانے کے لئے بے تاب ہوا تھا۔

چند دنوں کی اندھا دھند محنت کی وجہ سے طبیعت میں بہت تھکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ کاموں کے بیچ میں اکثر لیٹ کر ذرا آرام کر لینے کو دل چاہتا ہے۔ ڈرائنگ روم کی چوکی پر لیٹنا ممکن تو ہے مگر مہمان موجود ہوں تو ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آج کھانے کی میز اور سیڑھیوں کے درمیان والی جگہ پر شمالی دیوار کے ساتھ ایک چوکی پر دیوان ڈال لیا ہے اس پر گدہ ڈال کر اوپر خوبصورت بیل بوٹوں والا بیڈ کور بچھا کر ڈھانک دیا ہے۔ اب صحیح بندوبست ہوگیا ہے۔ باہر کے کمرے میں مہمان رہیں بھی تو میں ہنڈیا پکاتے ہوئے بیچ بیچ میں یہاں پر لیٹ کر آرام کرسکوں گی۔ اس دیوار کے قریب سیڑھیوں کے پاس مشرقی دیوار کے برابر دو صوفے بھی رکھ دیئے۔ منو، دلو، پرویز، ٹٹو وغیرہ آج کل اکثر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ انہیں آج کل اسی طرف بٹھاتی ہوں تاکہ باہر کے کمرے میں اچانک کوئی آ بھی جائے تو انہیں دیکھ نہ سکے۔ چند دن پہلے ایک روز پرویز نے بتایا تھا: ''خالہ، دو مکان چھوڑ کر اس تیسرے گھر کا ایک لڑکا جب بھی مجھے دیکھے مختلف سوال پوچھتا ہے۔ رومی میرا کیا لگتا ہے۔ وہ کہاں گیا ہے..... ایسی باتیں۔''

یہ بات سننے کے بعد سے منو، ضیاء، راجو سب سے کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی پوچھے تو کہنا کہ تم رومی کے چچا زاد بھائی ہو۔

معصوم مارچ میں گاؤں گیا تھا۔ آج شام کو اچانک گاؤں سے آن ٹپکا۔ اسے دیکھ کر خوش ہوگئی، گھر بہت سنسان ہوگیا تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنی آرام کی چوکی پر لیٹ کر میں نے کہا، ''اب بتاؤ گاؤں کی کیا

خبریں ہیں؟ ۲۵ مارچ کو چلاہاٹی سے ای پی آر کا ایک ٹولا کھٹوریا کے اوپر سے سید پور کی طرف مارچ کر گیا۔"

"وجہ؟"

"سید پور کینٹونمنٹ پر حملہ کرنے کے لئے۔ انہوں نے کھٹوریا میں کئی بنکر بھی تیار کئے تھے۔"

"بنکر کیوں؟"

"ان کی زبانی جو کچھ سنا تھا وہ یہ ہے کہ چلاہاٹی سے شروع کر کے مختلف مقامات پر بنکر بناتے ہوئے آ رہے تھے اگر جنگ کے دوران ضرورت پڑے تو سہولت رہے گی۔"

"لڑائی ہوئی تھی؟"

"وہ ٹولا سید پور تک نہیں پہنچ سکا۔ راستے کے بیچ میں دروانی پر پاک آرمی نے ہلہ بول کر انہیں منتشر کر دیا۔ دو دنوں کے بعد وہ تتر بتر ہو کر گھٹوریا سے ہوتے ہوئے کہیں اور بھاگ گئے۔"

"نیل بھماری کی خبر معلوم ہے؟"

"نیل بھماری کھٹوریا سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے رشتہ دار نیل بھماری میں رہتے ہیں۔ معصوم نے کہا، "چھ اپریل تک نیل بھماری آزاد تھا۔ سات تاریخ کی صبح کو پاک آرمی نے لڑائی کر کے مکتی باہنی کو پسپا کر دیا۔"

جامی نے کہا، "ایک بات پر غور کیا ہے امی؟ ڈھاکہ کے علاوہ بنگلہ دیش کے دوسرے تمام علاقوں پر شروع میں مکتی باہنی کا قبضہ تھا۔ بنگلہ دیش کے تمام صدر ضلعوں میں شروع میں پاک آرمی کینٹونمنٹ تک محدود تھی پھر انہوں نے باہر نکل کر اور مقابلہ کر کے مکتی باہنی کو ہٹایا ہے۔ اس کے بعد ہی سے انہوں نے مارو، کاٹو، جلاؤ کی مہم شروع کی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔"

معصوم نے کہا، "ہم نے تو ۲۶ مارچ کو ہی آکاش بانی، بی بی سی، وائس آف امریکہ سن کر سوچا تھا کہ ڈھاکہ بالکل بے نشان ہو گیا ہے۔"

"حقیقت میں بھی تقریباً ایسا ہی ہوا تھا۔ ڈھاکہ میں جتنی بستیاں، بازار، کچے مکانات تھے سب کو جلا دیا تھا۔ پکی عمارتوں کو جلا کر راکھ کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ گولے برسا کر جس حد تک ممکن تھا، اقبال ہال، جگن ناتھ ہال، شہید مینار تباہ کر دیا تھا۔ شہید مینار ابھی تک اسی حال میں پڑا ہے۔ وہاں پر "مسجد" لکھ کر ایک سائن بورڈ ٹانگ رکھا ہے۔ ڈھاکہ کی سڑکوں پر ٹینک اتار دیئے گئے تھے۔" جامی نے کہا، "معصوم بھائی رمنا ریس کورس کے کالی مندر کا اب وجود نہیں رہا ہے.... اس پر گولے برسا کر نیست و نابود کرنے کے بعد وہاں کی زمین کو بھی برابر کر دیا ہے۔"

میں نے کہا، "تم پہلے بھی تو ڈھاکہ آ سکتے تھے۔"

"کیا کرتا۔ ابا جان آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ اس طرف ان دنوں افواہ تھی کہ ڈھاکہ کے میر پور، محمد پور کے علاقوں سے لوگوں کو پکڑ کر ائیر پورٹ کے کام پر لگایا جا رہا ہے۔ اس طرف کی تمام یونین کونسلوں کے چیئرمینوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے اپنے علاقے کے گاؤں سے روزانہ ایک خاص تعداد میں آدمی بھیجیں۔ مٹی کاٹنے

کے کام سے لے کر ائیر پورٹ کی عمارت بنانے تک اور پھر رن وے تیار کرنا.... تمام کاموں میں ان لوگوں کو بنا مزدوری کے کام پر لگایا جا رہا ہے۔ پورے علاقے میں افراتفری پھیل گئی ہے۔ ہر ایک چیئرمین مخصوص تعداد میں لوگوں کو بھیجنے پر مجبور ہے۔ کسی گاؤں میں مزدور موجود نہ ہوں تو تعلیم یافتہ لوگوں کو شامل کر کے تنگ پورا کرنا پڑ رہا ہے۔ چھٹکارے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس علاقے سے جتنے مزدور بھیجنے کا حکم ہے اتنے ہی آدمی بھیجنے ہوں گے بے شک گاؤں کے چودھری کو یا اس کے بیٹے کو یا دوسرے کسی تعلیم یافتہ معزز شخص کو شامل کرنا پڑے۔ اس پر ابا جان تھوڑے سے خوفزدہ ہوئے تو ڈھاکہ آنے کی اجازت مل گئی۔"

"راستے میں کیسی پریشانی ہوئی؟ پہنچنے میں تو کافی دیر لگ گئی۔"

"وقت لگنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر برج خراب ہیں۔ مکتی باہنی نے اڑا دیئے ہیں۔ ایک بس سے اتر کر کشتی پر دریا پار کرنا اور دوبارہ دوسری بس پر سوار ہونا۔ سوار ہوتے ہوئے دوبارہ چیکنگ۔ ڈھاکہ کے اندر داخل ہونے سے پہلے اور بھی سخت چیکنگ۔ بس سے تمام سواریوں کو اتار کر قطاروں میں کھڑا کر کے بوڈی چیکنگ۔ سامان اتروا کر کھول کھول کر چیکنگ، ہر چیک پوسٹ پر ایک ہی صورتحال۔ بالآخر پہنچ ہی گیا ہوں اسی پر خدا کا لاکھ شکر ہے۔"

جامی بے سری آواز میں گا اٹھا، لگتا ہے "جھیل آیا ہوں طویل تر وہ راہیں۔ آنے میں ڈھاکہ کے در پہ۔" (جامی نے بچپن میں کچھ عرصے تک بلبل لتا کلا اکیڈمی میں گانا سیکھا تھا!)۔

۲۵ جولائی ۱۹۷۱ء بروز اتوار

صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں نے کہا، ''بہت دن سے عطاء بھائی کی طرف نہیں گئے۔ معصوم آیا ہے، چلو اسے لے چلتے ہیں۔''

شریف نے کہا، ''ساتھ ہی فقیر کی طرف سے بھی ہو آئیں گے۔ اسے ذرا فون کر دو تا کہ کہیں نکل نہ جائے۔''

عطاء بھائی نارندہ میں رہتے ہیں۔ فقیر لارنس سٹریٹ پر۔

فون کرتے ہی فقیر نے کہا، ''آج اس طرف نہ آنا ہی بہتر ہے۔ کل رات بھر جاترا باڑی کی طرف گولیاں چلتی رہی ہیں۔ صبح سے ہاٹ کھولا کے چوک سے لے کر جاترا باڑی، ڈیمرا کے علاقے تک کرفیو لگا رکھا ہے۔''

''واقعی؟ قصہ کیا ہے، کچھ معلوم ہو سکا ہے؟''

''نہیں۔ واقعہ جاننے کے لئے نکلنا محفوظ نہیں ہے۔ جاترا باڑی، ڈیمرا کے علاقے میں پکڑ دھکڑ کر رہے ہیں، مار پیٹ رہے ہیں۔ ہم لوگ تو قریب ہی رہتے ہیں۔ ویسے میں اگر چاہوں تو نواب پور روڈ کی طرف سے نکل سکتا ہوں مگر میری بیگم کہہ رہی ہیں کہ کیا ضرورت ہے؟ کم از کم چھٹی کا ایک روز بیوی بچوں کے ساتھ گزارنے میں کیا حرج ہے؟''

''ہم لوگ بھی پھر ایسا ہی کر لیتے ہیں۔''

عطاء بھائی کو بھی فون کر کے دریافت کیا۔ ''رات کو گولیاں چلنے کی آواز سنی ہے؟''

انہوں نے جواب دیا، ''سنی ہے، کثرت سے، ہم لوگ تو ڈر ہی گئے تھے، کہیں ہمارے محلے میں بھی نہ شروع ہو جائے مگر اس طرف کو نہیں آئے۔''

''آپ کے اندازے کے مطابق گولیاں کس طرف چلی ہیں؟''

''آوازیں تو جاترا باڑی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ ہاٹ کھولا کے چوک سے اس طرف کے پورے علاقے میں آج کرفیو ہے۔''

دل بے چین ہو گیا۔

جاترا باڑی کی طرف ساری رات گولیاں چلی ہیں۔ جانے کیسی لڑائی ہوئی ہے۔ کس سے، کس طرح اصل واقعہ معلوم کروں؟

۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء بروز پیر

جاترا باڑی کے واقعے نے سارے شہر میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ کل سے کتنے ہی لوگوں کی زبانی ایک ہی واقعے کا تذکرہ سنا ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ ہم سب کے لئے خوشی اور تسکین کی بات یہ ہے کہ رات بھر گولیوں کا تبادلہ پاک فوجیوں کے ہی دو گروہوں کے مابین ہوتا رہا ہے۔

اصل واقعہ یوں ہے کہ جاترا باڑی کی سڑکوں پر رات بھر فوج کی بڑی بڑی لاریاں چلتی رہتی ہیں۔ ان کی آمد و رفت میں سہولت دینے کے لئے رات کے دس بجے کے بعد سے دوسری تمام گاڑیوں کے لئے وہ سڑک ممنوع کر دی جاتی ہے۔ پرسوں رات کے وقت کچھ بچھوؤں نے کسی طرح آنکھ بچا کر اس سڑک پر کچھ مائین لگا دیئے۔ نتیجتاً پاک فوجیوں سے بھری ہوئی دو لاریاں الٹ کر سڑک کے نیچے ڈھلوان پر جا گریں۔ رات کے اندھیرے میں دھماکے اور چیخ و پکار سن کر جاترا باڑی چیک پوسٹ کے فوجیوں نے سوچا کہ وہاں پر گوریلے کسی کاروائی میں مصروف ہوں گے فوراً انہوں نے اس طرف گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس پر ڈھلوان میں گرے ہوئے فوجیوں نے سمجھا کہ مکتی باہنی ان پر گولیاں برسا رہی ہے۔ انہوں نے بھی جوابی گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اس طرح پاک فوجی اماوس کی اندھیری رات میں ''مکتی'' سمجھ کر ایک دوسرے پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے رہے۔

ہم لوگ جتنی بار سنتے ہیں ہنسی آتی ہے۔ اخباروں میں ویت نام کی جنگ کے سلسلے میں اکثر ''سیم سائڈ'' کا لفظ پڑھا ہے۔ اس مرتبہ ڈھاکہ میں ہی سیم سائڈ کا واقعہ پیش آیا۔

۲۷ جولائی ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج ایمن کی سالگرہ ہے۔ بے چاری کو اب تک ہسپتال سے چھٹی نہیں ملی ہے۔ ایسا برا وقت جا رہا ہے انور کے کنبے پر۔

صبح ڈالی آپا کو ساتھ لے کر ایمن کے لئے گڑیا خریدی۔ ایک دو اور چھوٹے موٹے تحفے بھی خریدے۔

ساڑھے تین بجے ڈالی آپا کی طرف سے آ کر ایک پیالی چائے لے کر سکون سے بیٹھی تھی اتنے میں دادا بھائی اور مرتضٰی بھائی آ گئے۔ ایم جی مرتضٰی ایس اوایل کمپنی کے سینئر ایگزیکٹیو اور شریف کے دوست ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ایم جی مصطفٰی نیشنل سیکورٹی انشورنس کمپنی کے منیجر، مرتضٰی کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی دادا بھائی بن گئے ہیں۔ ہفتے میں کم از کم چار مرتبہ ہم ایک دوسرے کے گھر پر آتے جاتے ہیں۔

اندر داخل ہوتے ہی دادا بھائی نے کہا، ''سات تو بج گئے۔ خالی چائے لے کر بیٹھی ہیں؟''

میرے حیرت سے دیکھتے ہی دادا بھائی نے ہنس کر کہا ''بھئی ریڈیو کہاں ہے؟ آزاد بنگلہ بے تار شروع بھی ہو گیا ہوگا۔''

آزاد بنگلہ بے تار ہم لوگ شوق سے سنتے ہیں مگر دوسرے کاموں کے جھمیلے میں کبھی کبھی بروقت یاد نہیں رہتا۔ دادا بھائی اور شریف کے سلسلے میں یہ ناممکن ہے۔ جامی کو ریڈیو لانے کے لئے کہہ کر میں نے کہا، ''اتنی جلدی کیا ہے۔ صبح تو یہی پروگرام دوبارہ نشر کیا جائے گا۔''

''صبح میڈم ہم نوکری پر جاتے ہیں۔ آپ کی طرح گھر پر بیٹھے رہنے جیسی تقدیر لے کر تو پیدا نہیں ہوئے ہیں۔''

مرتضٰی نے سوال کیا، ''بھابی مام بھائی کہاں پر ہیں؟''

''وہ ایک کام سے امی کے گھر تک گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔''

بات ختم ہونے سے پہلے ہی دروازے پر گھنٹی بجی، شریف واپس آ گئے۔

ریڈیو کو کھانے کی میز پر رکھ کر ہم لوگ چاروں طرف بیٹھ گئے۔

یکم اگست ۱۹۷۱ء بروز اتوار

تین عدد خلا باز اپولو۔۹ خلائی جہاز پر کروڑوں میل کا خلائی فاصلہ عبور کر کے چاند پر اتر کر مزے سے گھوم پھر رہے ہیں۔ کاش مجھے ایک ٹوٹا پھوٹا سا خلائی جہاز مل جاتا جس پر سوار ہو کر میں صرف چند سو میل کا فاصلہ طے کر کے میلہ گھر نام کے ایک خطہ ارض پر اتر کر صرف ایک لمحے کے لئے اپنے رومی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ سکتی!

رومی کو گئے ہوئے آج اڑتالیس دن ہو گئے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے اسے اڑتالیس مہینوں سے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ رومی نام کا کوئی فرد تھا بھی یا....؟ رومی نام کا کوئی شخص تھا کبھی؟ یا رومی ایک جھوٹی مایا ہے؟

آج سے ڈاکٹر نورالاسلام کے نسخے کے مطابق دوائی کھانا شروع کی ہے۔ انہوں نے پہلے دیکھ کر بلڈ ٹیسٹ سے لے کر ایکسرے تک جتنی طرح کے ٹیسٹ ہیں سب مکمل کروانے کے لئے کہا۔ ان ٹیسٹوں کی رپورٹ دیکھ کر پھر انہوں نے دوائی لکھی ہے۔ دوائی تو دی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری اصل دوائی میلہ گھر میں ہے۔ وہ دوائی مجھے کون لا کر دے گا؟

سہ پہر کو کلیم آئے۔ ان کا دل بھی بہت اداس ہے۔ نیل پھماری سے ان کا چھوٹا سالا پاور (لطیف الرحمٰن پردھان) آیا ہے۔ وہ خبر لایا ہے کہ پاک آرمی نے اس کے بڑے بہنوئی کو مار ڈالا ہے۔ یہ خبر سننے کے بعد سے کلیم کی بیوی سلینہ بہت رو رہی ہے۔ سلینہ کے بڑے بہنوئی مقبول حسین چلاہاٹی میں رہتے تھے۔ بہت بھلے مانس تھے۔ سلینہ کے والدین پاور سمیت دو اور بچوں کے ساتھ مارچ کے آخری ہفتے تک نیل پھماری میں اپنے مکان میں ہی تھے۔ اس وقت نیل پھماری میں ای پی آر، ای بی آر، انصر، مجاہد اور علاقے کے نوجوانوں نے مل کر جو دفاعی فوج قائم کی تھی اس میں سلینہ کے بڑے بھائی ابو (رشید رحمٰن پردھان) تھانہ کمانڈر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اپریل کی سات تاریخ کو جب پاک آرمی نے نیل پھماری پر قبضہ حاصل کر لیا تو یہ دفاع منتشر ہو گیا۔ بہت سے دوسروں کے ساتھ ابو بھارت چلا گیا۔ پاور اپنی والدہ کو لے کر ایک قریبی گاؤں میں چلا گیا۔ ان کے والد بھی الگ سے بھارت جا کر تین مہینوں کے بعد لوٹ آئے۔ امی کو لے کر پاور نیل پھماری میں واپس آ گیا۔ نیل پھماری سے اکثر لوگ بھارت جاتے آتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی زبانی پاور نے سنا کہ ان کے بھائی آزاد بنگلہ ریڈیو میں کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اے کے خان ایک مہینے کی چھٹی لے کر آج شام کو راجشاہی سے ڈھاکہ پہنچے ہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج کل شب و روز بھرپور ہیں، واقعات سے، مہمانوں سے، کلیجہ ہلا دینے والی آوازوں سے۔ کلیجہ ہلا دینے والی وہ آوازیں سنائی نہ دیں تو ہمارا دل ہی نہیں لگتا۔ رات کو وہ آوازیں سن لیں تب ہمیں چین کی نیند آتی ہے۔ یہ صرف میرا کہنا نہیں ہے، دادا بھائی کہتے ہیں، مرتضیٰ کہتے ہیں کہ ''ولیم کی بکری گھٹ گئی ہے۔ ان آوازوں سے ہی آج کل خوبصورت نیند آجاتی ہے۔''

بلکہ اب تو ایسا ہو گیا ہے کہ کسی رات وہ آوازیں نہ آئیں تو دل میں خوف پیدا ہوتا ہے.... وہ کیا....!

نہیں۔ وہ پکڑے نہیں گئے ہیں۔ رات کے پہلے پہر میں اگر کسی وجہ سے مس ہو جائے تو گہری رات کو اچانک بو۔م۔م۔م سے ایک بڑے دھماکے کی آواز چاروں طرف سب کچھ لرزا کر ہمارے بے تاب اعصاب پر چین کی کومل انگلیاں پھیر دیتی ہے۔

ڈھاکہ میں بچھوؤں کی کارکردگی دن بدن خطرناک روپ اختیار کر رہی ہے۔ ابھی پچھلے ہی روز شام سے پہلے سٹیٹ بینک کے گیٹ پر ملٹری پولیس کی ناک کے نیچے، رستے کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے، بم پھینک کر بھاگ گئے۔ فوجی کسی کو بھی پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ گرینیڈ کی طرح ہی زندگی کو ہاتھ کی مٹھی میں لے کر پھرتے ہیں۔ ان لڑکوں کے دل میں خوف نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ آزاد بنگلہ بے تار پر سنتی ہوں جو لوگ محاذوں پر لڑائی کر رہے ہیں وہ بھی اسی طرح دلیری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مرنے سے شہید، بچ جانے سے غازی.... جان کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ زندگی اور موت حقیقتاً ان کے پیروں کی غلام ہے۔

آزاد بنگلہ بے تار سے نغمہ نشر کیا جا رہا ہے

بن ساحل موجوں کا بحر پار کریں گے
ہم جواں ملاحوں نے اب حال تھاما ہے
جیون جائے جنگ کرتے
جان کی کب پرواہیں کرتے
در و بام کی خبر نہیں
شب و روز کا ہوش نہیں

راہ کا کوئی قیاس نہیں
اتنا جانیں چلنا ہے
کشتی پار لے جانا ہے
ساگر کے ہم ملاح ہیں

۱۶ اگست ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج مجھے بخار ہو گیا ہے۔ پرسوں سے ہی ذرا ٹھنڈ لگی تھی۔ اتنی پروا نہیں کی۔ روز کی طرح گھر کا کام، باہر کی بھاگ دوڑ، سب کچھ معمول کے مطابق کرتی رہی مگر یہ مشقت طبیعت کو کیونکر راس آتی؟ دوپہر کو کھکو آ کر گوشت اور سبزی کی ایک ہانڈی پکا گئی ہے۔ بارق نے چاول ابال دیئے ہیں۔ میں پورا دن ڈرائنگ روم میں اپنی چوکی پر آرام کرتی رہی۔ سہ پہر کو امی آئی تھیں۔ ''بار بار طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ خیر بے چاری کا بھی کیا قصور ہے'' اس طرح سے کچھ سرگوشی کرتے کرتے بالآخر بات مکمل کئے بغیر ہی خاموش ہو گئیں۔ امی عام طور پر دل کی بات چھپا نہیں پاتی ہیں۔ زبان سے بات ٹپک جاتی ہے مگر آج جیسے انہوں نے خود ہی اپنی زبان کو روک لیا۔ البتہ ماتھے کے بل، دبے ہوئے ہونٹ، اور پورے چہرے کی سختی ایسے تھی جیسے وہ خاموش شکوہ کر رہی ہوں۔ ان کی کوکھ کی اولاد ہو کر ان سے رومی کی بات چھپائی، اس پر اندر ہی اندر سلگ رہی ہوں۔ ان سے گفتگو کر کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر پا رہی ہوں۔ یہی حقیقت وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر برداشت نہیں کر پا رہی ہوں گی، خواہش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہی ہوں گی، میری اٹل خاموشی کی وجہ سے۔

۱۸ اگست ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج بخار اتر گیا ہے طبیعت میں بہت کمزوری ہے۔ صبح سے گھر پر مہمانوں کا رش لگا ہوا ہے۔ یکے بعد دیگرے دادا بھائی، مرتضٰی، فقیر، نور جہان، منان، شریف کے دو اور انجینئر دوست واحد اور مکی، لالو، سانو، کھکو، ایڈووکیٹ ملا اور چشی آئے ہیں۔ اتنے مختلف لوگ صبح کے نو بجے سے دوپہر کے دو بجے تک آتے جاتے رہے ہیں مگر سب کی زبان پر ایک ہی موضوع ہے، گزشتہ روز شام کے بعد فارم گیٹ کی ملٹری چیک پوسٹ پر گوریلا کارروائی۔

فارم گیٹ پر ملٹری چیک پوسٹ خاصی بڑی ہے۔ وہاں کے ٹریفک آئلینڈ کے درمیان میں دو خیموں میں بہت سی ملٹری پولیس چوبیس گھنٹے موجود رہتی ہے۔ قریب ہی فٹ پاتھ پر لائٹ مشین گنوں سے مسلح ملٹری پولیس، ساتھ ہی گرین روڈ کے چوک پر جو سینما ہال تعمیر ہو رہا ہے، اس کے سامنے بھی لائٹ مشین گن سے مسلح فوجی.... سارا کچھ ملا کر خاص نوعیت کا اہتمام ہے۔ اس طرح کے خطرناک مرکز پر بچھوؤں نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ بھی خاصا بڑا ہے۔

مرتضٰی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا، ''کیسی بے باکی ہے ذرا اندازہ لگائیے! اتنی شدید سیکورٹی کے باوجود وہ لوگ دس بارہ پاک فوجیوں کو مار گئے ہیں!''

دادا بھائی خوشی سے ہنستے ہوئے بولے، ''وہ بھی پلک جھپکنے کی مہلت دیئے بغیر۔ ایک منٹ بھی لگا ہوگا کہ نہیں، شک ہے۔''

فقیر نے کہا، ''ان کے پاس یقیناً مشین گنیں تھیں۔''

مکی..... ''یقیناً... برسٹ فائر کئے بغیر اتنی سی دیر میں اتنے ساروں کو مار کر بھاگنا ممکن ہے؟''

شریف نے مسکرا کر کہا، ''اور نہیں تو کیا.... انہیں بچھو کیوں کہا جاتا ہے!''

نور جہان۔۔۔ ''کوئی بے چارہ پکڑا تو نہیں گیا۔''

منان نے ڈانٹ ہی دیا، ''کیا فضول سوال کرتی ہو۔ انہیں کوئی پکڑ سکتا ہے؟''

میں نے کہا، ''وہ نظر بھی نہیں آتے۔ چند روز پہلے الٹی میٹم میں اس بارے میں کہا ہے.... جامی ذرا سناؤ نا۔''

جامی نقلیں خوب اتار لیتا ہے۔ اس کی یادداشت بھی بہت تیز ہے۔ اکثر وہ الٹی میٹم کے دو چار جملے دوہراتا رہتا ہے۔ ابھی اتنے سارے انکل آنٹیوں کے سامنے پہلے تھوڑا سا شرمایا۔ اس کے بعد الٹی میٹم پڑھنے

والے کا لہجہ نقل کر کے کہنے لگا، ''چار مہینوں سے لڑائی کرنے کے بعد حملہ آور فوجیوں نے دریافت کیا ہے کہ مکتی باہنی کے بچھو دیکھنے میں کیسے ہیں؟ یہ بچھو کس طرح کا لباس پہنتے ہیں؟ ان نشانیوں کا علم نہ ہو تو ہم کن کے ساتھ لڑائی کریں گے؟ یہ دشمن کھلی آنکھوں سے دیکھائی کیوں نہیں دیتے؟''

طبیعت میں خاصی تازگی آ گئی۔ سرِ شام باغ میں بیٹھ کر شریف، فقیر اور میں گپ شپ کر رہے تھے۔ فقیر دوپہر کو گھر نہیں گئے، ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ گیٹ کے سامنے رکشے سے لالو اتری۔ ذرا حیران ہوئی۔ صبح ہی تو ہو کر گئی ہے، پھر سے آ گئی، خیریت تو ہے؟ کوئی بری خبر تو نہیں ہے؟ لگتا تو نہیں کیونکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ رکشے سے اتر کر رکی نہیں۔ ''باجی ذرا اندر آیئے'' کہہ کر سیدھا مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر آ گئی۔ لولو نے بہت آہستہ سے کہا، ''رومی آیا ہے، ہمارے گھر پر۔ شریف بھائی سے کہئے جا کر لے آئیں۔''

اچانک جیسے سانس رک گئی، کھڑی نہیں رہ سکی کرسی پر بیٹھ گئی۔ باہر شریف کے ساتھ فقیر بیٹھے ہیں۔ چند منٹ تک سن ہو کر بیٹھی رہی اس کے بعد باہر نکل کر شریف سے کہا، ''امی کو اچانک کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی ہے، اس لئے لالو کو بھیجا ہے۔ اسے پیسے دے دیئے ہیں تم ذرا گاڑی پر جا کر اسے چھوڑ آؤ، شام ہو گئی ہے۔''

جامی اچانک اچھل پڑا۔ ''پورے دن سے گھر پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ابو میں بھی ذرا آپ کے ساتھ گھوم کر آتا ہوں۔''

وہ دونوں لالو کو لے کر چلے گئے۔ میں چین سے بیٹھ نہیں پا رہی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ ایک سو تین ڈگری بخار چڑھ گیا ہے۔ گال، حلق، آنکھیں سب کچھ سلگ رہا ہے۔ فقیر نے شائد کچھ اندازہ کر کے کہا، ''صبح سے گھر سے باہر ہوں، اب میں بھی چلتا ہوں۔'' فوراً ہی گردن ہلا کر ہاتھ ماتھے تک اٹھا کر کہا، ''اچھا خدا حافظ۔''

میں نے دروازہ بند کر کے ایک مرتبہ باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا بارق کیا کر رہا ہے۔ وہ توجہ کے ساتھ چولہے کے سامنے کسی کام میں ڈوبا ہوا تھا۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں کے پاس ایک دروازہ ہے' اس سے بھی باہر نکلا جا سکتا ہے۔ اس دروازے کے قریب کھڑے ہو کر دل ہی دل میں دعا مانگی، ''اے اللہ اس وقت کوئی ملنے والا یا فون کرنے والا نہ آ جائے۔'' دل دھڑک رہا ہے۔ رومی سیدھا گھر پر بھی تو آ سکتا تھا۔ یہ انتظار کی گھڑیاں اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔

گاڑی کی آواز آئی، پورچ پر رکی۔ خاموشی سے دراوزہ کھولتے ہی تیز قدم چل کر سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر بیڈروم میں چلی گئی۔

رومی آ کر کمرے میں داخل ہوا۔ رومی کے گالوں پر داڑھی، بال گردن تک لمبے، تانبے جیسا بدن کا رنگ، دھوپ میں جل کر سیاہ فام، دونوں آنکھوں میں چمک، مونچھوں کے جنگل کے بیچ میں کھلی ہوئی، وہی دنیا بھلانے والی مسکراہٹ۔ رومی دونوں بانہیں پھیلا کر قریب آیا۔ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رومی نے سرگوشی کی، ''امی، امی رک جایئے۔ دادا سن لیں گے، تمہیں روتے سن کر وہ شک کریں گے۔'' دروازے کے پردے کے اس پار ہی سیڑھیوں کے سامنے چوکور درمیانے سائز کا ہال ہے، اس میں ایزی چیئر ڈال کر لیٹے رہتے

ہیں۔شریف اور جامی خاموشی سے رومی کی طرف دیکھ رہے تھے۔رومی نے ایک بار میری اور ایک بار شریف کی طرف دیکھ کر کہا،''دیکھا؟تم لوگوں کی شادی کی سالگرہ سے ایک روز پہلے آ گیا ہوں!''

ذرا سا سنبھل کر میں نے کہا،''سیدھے گھر پر کیوں نہیں آئے؟''جذبات کی روانی کم ہوتے ہی تصور کے آئینے پر امی کا چہرہ نظر آیا۔ان کے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ تھی ساتھ ہی ان کے شکوے....''اب کیسا رہا؟ مجھے تو نہیں بتایا تھا نا؟اب دیکھو سارا راز فاش ہو گیا۔''

رومی نے میری بات کے جواب میں کہا،''ویسے ہی،رسک لینے میں ڈر لگا۔اگر گلی کے موڑ پر کسی فوجی سے واسطہ پڑ جاتا یا کوئی شک کرتا؟''

معصوم گھر پر نہیں تھا جب وہ لوٹا تو ہمارے جذبات مدھم پڑ چکے تھے۔رومی اپنے دادا جان کے مختلف سوالات کے فرضی جواب دے کر نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس چکا تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ معصوم سے سچی بات نہیں چھپائیں گے۔ایک ہی گھر کے اندر رہتے ہوئے چھپانا ممکن بھی نہیں ہے۔

رات کے کھانے کے بعد ہمارے پلنگ پر سارے مل کر بیٹھے۔میں نے کہا،''اب سنا اپنی داستان۔''

رومی تھوڑا سا ہنسا۔''داستان جو ہے وہ الف لیلیٰ کی طرح فرضی کہانی معلوم ہوگی۔میلہ گھر پر پہنچ کر دیکھا کہ ڈھاکہ کے یونیورسٹی اور کالجوں کے جتنے لڑکے ہیں،دھان منڈی اور گلشن میں رہنے والے،گاڑیوں پر گھومنے والے امیر زادے،کھیل کے میدان کے پھرتیلے لڑکے،ملازمت پیشہ باپ کے جھجکنے والے لڑکے،سب کے سب وہاں پر اکٹھے ہیں۔تمام لڑکے جنگ میں شمولیت اختیار کرنے کے لئے گئے ہیں۔وہاں پر جا کر میرے پہلے کے واقف کار اتنے لڑکے ملے۔ڈھاکہ سے اگرتلہ کی طرف یہ سرحد سب سے قریب ہونے کی وجہ سے ڈھاکہ کے تقریباً سارے لڑکے ہی اس رستے سے سرحد عبور کرتے ہیں۔اس کے بعد سیکٹر ٹو سے ہوتے ہوئے بہت سے لڑکے کسی دوسرے سیکٹر میں چلے جاتے ہیں۔ضلع ڈھاکہ سیکٹر ٹو کے اندر ہے لہٰذا ڈھاکہ کے زیادہ تر لڑکے سیکٹر ٹو میں ہی شامل ہیں۔ملک کے چاروں طرف کی سرحدوں پر جنگ جاری ہے۔سرحد کی دوسری طرف بھارت کی سرزمین پر ہمارے سیکٹروں کے ہیڈ کوارٹر ہیں۔ریگولر بنگلہ دیشی آرمی کے ساتھ ہم لوگ گوریلا فوج کے طور پر موجود ہیں۔

آزاد بنگلہ بے تار،آکاش بانی،بی بی سی سے یہی باتیں سنتی آ رہی تھی۔مگر وہ محض سنی ہوئی باتیں تھیں۔ یقین کرتی تھی۔سچائی کے طور پر ہی جانتی تھی مگر جیسے دل نہیں بھرتا تھا۔ابھی رومی کی زبانی سن کر جیسے ساری باتیں دل پر نقش ہوتی جا رہی ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ذرا جھجک کر رومی نے کہا،''امی میں نے سگریٹ پینا شروع کر دیا ہے۔تم سے وعدہ کیا تھا کہ شروع کرنے سے پہلے تمہیں ضرور بتاؤں گا۔مگر ممکن نہیں ہوا۔''

یاد آیا رومی جب آٹھویں جماعت میں تھا'اسی وقت ایک مرتبہ کہا تھا،''دیکھو سگریٹ پینی اگر شروع کرو تو بتا کر شروع کرنا ورنہ چھپا کر پیو گے،مجھے پتا نہیں چلے گا،اس کے بعد کسی روز اگر کسی سہیلی نے آ کر کہا کہ رومی

کو سگریٹ پیتے دیکھا ہے تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔"

رومی نے کہا تھا، "امی، جب ابو نہیں پیتے تو عین ممکن ہے کہ میں بھی نہ پیوں، ویسے اگر کبھی پی تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"

اب رومی نے ہنستے ہوئے کہا، "وہاں پر سگریٹ پیئے بغیر گزارہ نہیں ہے امی۔ کھانے پینے کا کوئی ٹھیک ٹھکانا نہیں رہتا۔ ایکشن پر جا کر کبھی کبھی فاقے سے بھی رہنا پڑتا ہے۔ کھانے پینے کو کچھ بھی میسر نہیں آتا۔ سگریٹ ہی واحد چیز ہے جو ساتھ میں رکھنا ممکن ہوتا ہے۔ امی تم لوگوں کے سامنے پیوں یا ایک طرف ہٹ جاؤں؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فروری میں، صرف چھ ماہ پہلے ہمارے گھر پر میرے سامنے سگریٹ سلگانے کے جرم میں عشراق کو گھر سے نکال دیا تھا۔ دوست کی غلطی پر رومی کو بھی بہت ڈانٹ ہضم کرنا پڑی تھی۔ ابھی بھیگے ہوئے لہجے میں کہا، "نہیں۔ سامنے ہی پیو۔ تھوڑے سے دنوں کے لئے آئے ہو۔ سگریٹ پینے جتنی دیر کے لئے بھی تجھے آنکھ سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی۔"

رومی نے ایک سگریٹ سلگا کر کہا، "امی ڈاک کی بات یاد ہے؟ پچھلے سال دسمبر میں جب ہم باریسال میں ریلیف ورک کے لئے گئے تھے۔"

"یاد ہے، وہ جس نے ابھی نئی نئی ڈاکٹری پاس کی تھی اور نئی نئی شادی کی تھی، وہی ڈاکٹر نا..... جس کا اصل نام اختر احمد تھا۔ کیا ہوا ہے اسے؟"

"وہی ڈاکٹر سیکٹر ٹو میں موجود ہے۔ اس کی بیوی بھی۔"

"واقعی؟ دلچسپ بات ہے۔"

"صرف وہی نہیں، اور بھی ہیں، لولو آپا، ٹولو آپا بھی وہاں پر موجود ہیں۔"

"وہ لوگ بھی؟ وہ وہاں پر کیا کر رہے ہیں؟"

"سیکٹر ٹو میں ایک ہسپتال قائم کیا گیا ہے۔ ڈاک وہاں کا ڈاکٹر ہے۔ کھکو بھابی، لولو، ٹولو آپا لوگ وہاں نرس ہیں۔"

سن کر میں حیران ہوئی۔ رومی کی قسمت، کہنا چاہئے کہ بہت اچھی ہے۔ اجنبی جگہ پر جا کر اسے چند پیارے واقف کار مل گئے ہیں۔ پچھلے سال نومبر کی آندھی کے بعد بیگم صوفیہ کمال کی رہنمائی میں ایک ریلیف ٹیم باریسال کے چند متاثرہ علاقوں میں امدادی مہم پر گئی تھی۔ اس ٹیم میں موجود تھے ڈاکٹر اختر احمد (ڈاک)، رومی، صوفیہ کمال کی دو لڑکیاں لولو اور ٹولو، قاضی نور الزمان کی بیگم سلطانہ زمان اور دو لڑکیاں نائلہ احمر اور لبنیٰ مریم، دینا اور منی بھائی کے بڑے لڑکے ظہیر کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے۔ اس امدادی مہم کے بعد سے رومی کا ان تمام لوگوں سے، خاص طور پر ڈاک، اس کی بیوی کھکو، لولو اور ٹولو سے قریبی تعلق ہو گیا تھا۔

رومی نے کہا، "ایک اور مزے کی بات بتاؤں امی؟ میں ڈھاکہ سے گیا تھا ۱۴ جون کو۔ لولو، ٹولو آپا لوگ ایک بڑے ٹولے کے ساتھ ۱۵ جون کو پہنچے تھے۔ ۱۳ جون کو میں ان کے گھر پر ان سے ملاقات کرنے گیا تھا مگر

کسی نے کسی کو جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہم لوگ گئے تھے منو بھائی لوگوں کے ساتھ، ان کے ٹولے کو لے گئے تھے شہادت بھائی۔ وہ لوگ سونا موڑا کے ہسپتال پر گئے تھے۔ تین چار روز کے بعد اختر بھائی ان کو لے کر میلہ گھر گھومنے کے لئے آئے۔ اس وقت ڈرامائی انداز میں میری ان سے ملاقات ہوگئی۔''

''اختر کن دنوں وہاں پر گیا تھا؟''

''کریک ڈاؤن کے بعد ہی، اختر بھائی کی داستان اور بھی دلچسپ ہے۔ اختر بھائی کو اس سال جنوری میں فوج میں ڈاکٹر کی نوکری ملی تھی۔ کومیلا کی فورتھ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ان کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ مارچ کے وسط میں فورتھ ایسٹ بنگال کی دو کمپنیوں کا برہمن باڑیا میں تبادلہ کیا گیا تھا۔ میجر شرافت جمیل، اختر بھائی، یہ لوگ بھی برہمن باڑیا چلے گئے تھے۔ اصل میں یہ تبادلہ پاکستانیوں کی ایک سازش تھی۔ خالد مشرف کو بھی مارچ کے آخری دنوں میں کومیلا کی اسی فورتھ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں بھیجا گیا تھا۔ اس سے قبل خالد بھی ڈھاکہ کی کسی بریگیڈ میں بریگیڈ میجر تھے۔ کریک ڈاؤن سے چند روز پہلے خالد بھائی کو کمانڈنگ آفیسر بنانے کے بہانے سلہٹ کے شمشیر نگر میں بھیج دیا گیا۔ وہاں پر نکسل والے بھارت سے داخل ہو کر بدامنی پیدا کر رہے تھے۔ انہیں کچلنے کے لئے فوجیوں کی ایک کمپنی لے کر وہاں جانے کے لئے کہا گیا۔ خالد بھائی کے دل میں شک پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستانی لوگ کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ برہمن باڑیا میں فوجیوں کی دو کمپنیاں بھیجی گئی تھیں۔ اب انہیں فوجیوں کی ایک اور کمپنی دے کر شمشیر نگر میں جانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ خالد بھائی نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس طرح ایسٹ بنگال رجمنٹ کی مختلف کمپنیوں کو ادھر ادھر بھیج کر کمزور کیا جا رہا ہے۔ خالد بھائی تھوڑا سا محتاط ہو گئے تھے۔ اسی سے ان کی زندگی بچ گئی۔ وہ مین روڈ سے جانے کی بجائے دوسری ایک کچی سڑک سے شمشیر نگر گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ کہیں پر بھی کچھ نہیں ہے۔ نکسل والوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ بعد میں پتا لگا کہ مولوی بزار کے پاس مین روڈ کے قریب پاکستانی فوجیوں کی ایک کمپنی چھپ کر بیٹھی تھی، خالد بھائی لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے۔

دوسری طرف برہمن باڑیا میں کیا ہوا کہ میجر شرافت جمیل، اختر بھائی اور دوسرے جو لوگ موجود تھے انہیں پتا لگ گیا کہ ڈھاکہ میں کیا واقعہ برپا کیا جا چکا ہے۔ کومیلا کے کینٹونمنٹ میں کیا بیت گئی ہے۔ رنج و غم سے ان کا لہو کھولنے لگا لہٰذا ۲۷ مارچ کی صبح شرافت بھائی کے ساتھ اختر بھائی اور دوسرے تمام لوگوں نے بغاوت کر کے وہاں پر موجود پاکستانی افسروں کو گرفتار کر لیا۔ شرافت بھائی نے پہلے ہی خفیہ طور پر اختر بھائی کو ایک سٹین گن اشو کر دی تھی، کیونکہ ڈاکٹروں کو اسلحہ دینے کا آرڈر نہیں تھا۔ ادھر خالد مشرف لوگ بھی شمشیر نگر سے واپس آ کر شرافت جمیل لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

''جانتی ہو امی اختر بھائی جب ان لوگوں کے ساتھ گشت کر رہے تھے اس وقت تک انہیں کھکو بھابی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کھکو بھابی کومیلا میں تھی۔ اختر بھائی خالد مشرف کے ساتھ سلہٹ کے تلیا پاڑا چلے گئے۔ وہاں پر چائے کے باغ کے اندر خالد بھائی نے ڈیرہ قائم کیا۔ وہیں نت نئے لڑکے اکٹھے ہونے لگے، تربیت حاصل کرنے کے لئے۔ خالد مشرف نے اختر بھائی سے کہا، ''تمہیں تو فی الحال کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ تم ان لڑکوں کو

تربیت دینا شروع کردو''۔ٹریننگ کمپنی تشکیل دی گئی۔اختر بھائی کو کمپنی کا کمانڈر بنایا گیا۔کیپٹن حیدر بھی انہی دنوں کومیلا سے فرار ہوکر پیدل چل کر تلیا پاڑا جا پہنچے۔تلیا پاڑا میں سیکنڈ بنگال اور فورتھ بنگال کے بہت سے بنگالی ملٹری افسر فرار ہوکر جا اکٹھے ہوئے۔ندیم کے والد بھی بھاگ کر پہلے اس تلیا پاڑا میں پہنچے۔میجر ضیاء بھی تلیا پاڑا گئے تھے، خالد مشرف کے ساتھ میٹنگ کرنے کے لئے۔

کچھ دنوں کے بعد خالد مشرف نے جب بھارتی سرحد کے اندر سونا موڑیا میں اپنا ڈیرہ منتقل کیا تو اختر بھائی بھی وہاں چلے گئے۔خالد بھائی نے اس مرتبہ انہیں کیمپ ہسپتال قائم کرنے کی تیاری کرنے کو کہا۔اس وقت تک سرحدی علاقوں میں زوروں کی لڑائی شروع ہوچکی تھی۔مکتی باہنی کے جوان زخمی بھی ہورہے تھے۔

سونا موڑا میں سرحد کے قریب سری منت پور کے نام سے ایک جگہ پر ایک سرحدی چوکی موجود ہے۔ اس سے قریب ہی ایک سکول کے اندر خالد مشرف نے اپنا کیمپ قائم کیا۔قریب کے ایک بیل خانے میں اختر بھائی کو مریض دیکھنے کے انتظامات مکمل کرنے کے لئے کہا گیا۔اختر بھائی نے دو لمبے پھٹوں کا انتظام کر کے انہیں کمرے کے دونوں طرف، بانس کی دو کھونٹیوں پر ڈال دیا۔یوں ایک تو مریض کا بیڈ بن گیا اور دوسرے پر دوائیاں، بینڈ تیج وغیرہ رکھ دی گئیں۔یہی تھا سیکٹر ٹو کا پہلا سنگل بیڈ ہسپتال۔

''بعدازاں سونا موڑا فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے بڑے سے ڈاک بنگلے میں ہسپتال منتقل کیا گیا۔اب ہسپتال دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے جس میں اور بھی بہت سے ڈاکٹر اور نرسیں آکر ذمہ داری سنبھال رہے ہیں۔''

''کھکو کب گئی؟''

''اختر بھائی نے سری منت پور میں رہتے ہوئے مکتی باہنی کے آدمی بھیج کر کھکو بھابی کو ڈھونڈ نکالا۔اس کے بعد ان کے جانے کا بندوبست کیا۔یہ اپریل کا وسط تھا۔''

میں نے سینے سے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے کہا،''واقعی! الف لیلیٰ کی پراسرار کہانیوں سے بھی زیادہ گہری لگتی ہیں یہ ساری باتیں۔سننے میں بہت مزا آرہا ہے۔تمہیں وہاں پر جا کر بھی پرانے واقف کار مل گئے ہیں مجھے اسی کی تسلی ہے۔سونا موڑا میلہ گھر سے کتنے فاصلے پر ہے؟ اکثر وہاں جاتے رہتے ہو کیا؟''

''ہسپتال اب سونا موڑا میں نہیں رہا ہے۔وہ جگہ سرحد سے بہت قریب تھی۔وہاں سے داروغہ باغیچہ کے نام سے ایک جگہ پر منتقل کر دیا گیا تھا۔اب حال ہی میں بسرام گنج نام کی ایک جگہ پر منتقل کیا گیا ہے۔یہیں پر مستقل طور پر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔میلہ گھر سے آٹھ ایک میل کے فاصلے پر ہے۔میں کبھی کبھی چھٹی لے کر وہاں پر جاتا ہوں۔''

''کیسا ہسپتال ہے؟''

کچی دیواریں۔بانسوں کی چوکی پر دھان کے خشک پودے ڈال کر گدہ بنایا گیا ہے۔ڈاکٹر اور نرسوں کے لئے رہائش گاہ بھی اسی طرح کی کچی دیواروں والے کمروں میں ہے جن کے اندر بانسوں کی چوکی پر خشک گھاس وغیرہ ڈال کر بیڈ تیار کیا گیا ہے۔اختر بھائی صرف مریضوں کا علاج ہی نہیں کرتے، موقع ملنے پر سٹین گن

ہاتھوں میں اٹھا کر ایکشن پر نکل جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ہسپتال میں دوائیاں ختم ہو گئیں۔ اختر بھائی نے مکتی باہنی کے چند جاں بازوں کو ساتھ لیا۔ ایک جیپ پر سرحد عبور کر کے ایسٹ پاکستان کے اندر داخل ہو کر ایک ہسپتال لوٹ لیا۔ فرج سے لے کر دوائیاں، آپریشن کے اوزار، بینڈ تیج وغیرہ سب کچھ اٹھا کر لے آئے۔ پھر تفریح کے لئے ایک رقعہ بھی چھوڑ آئے جس پر انہوں نے لکھا تھا، ''یہ چیزیں بنگلہ دیش کے فوجیوں کے لئے لے جائی گئی ہیں۔''

''میلہ گھر میں تم لوگ کس طرح سے رہتے ہو؟ کیا کچھ کھاتے ہو؟ جگہ کیسی ہے؟ گاؤں ہے یا ٹاؤن؟''

''گاؤں بھی نہیں ہے ٹاؤن بھی نہیں، بالکل پہاڑی جنگلی علاقہ ہے۔ ٹیلے کے اوپر بانسوں کی باڑھ کی جھونپڑی میں یا پھر خیمے کے اندر ہم لوگ رہتے ہیں۔ کھانے پینے کی بات نہ پوچھو۔ اسی کی تکلیف سب سے زیادہ ہے۔''

جامی نے طنزیہ کہا، ''ہاں۔ اور تم تو کھانے پینے کے شوقین بھی ہو۔''

''عام طور پر کھانے کو کیا مل جاتا ہے؟''

''دال چاول۔ کبھی سبزیاں اور کبھی کبھی مچھلی۔ صبح کے ناشتے میں روٹی اور گھوڑے کی دال۔''

میں چونک گئی، ''گھوڑے کی دال؟ یہ کیسی چیز ہے بھلا؟''

''چھلکوں سمیت پکی ہوئی ثابت دالیں۔ عام طور پر شائد گھوڑے کو کھلائی جاتی ہوں گی۔ اور روٹی؟ جانتی ہو امی کتنی مرتبہ ان روٹیوں کے اندر سے سینکے ہوئے کیڑے ملے ہیں۔''

''پھر کیا کرتے تھے؟ روٹی پھینک دیتے تھے؟''

''پھینک دیں گے؟ تم کیا دیوانی ہو گئی ہو؟ کیڑے کو ناخن سے کھرچ پھینکتے تھے اور روٹی کھا لیتے تھے۔''

میں نے بے اختیار آتی ہوئی آہ کو بمشکل روکا۔ وہی رومی جو گھر میں صاف شفاف پلیٹوں اور گلاسوں میں بھی میل ایجاد کر لیا کرتا تھا اور پھر انہیں دوبارہ دھلوایا کرتا تھا۔ جس کے لئے گندم کا آٹا دو دو مرتبہ چھاننا پڑتا تھا۔ دالوں کو کتنی مرتبہ دھونا پڑتا تھا اس کا کوئی حساب نہیں ہے کیونکہ پکی ہوئی دالوں میں ایک بھی چھلکا نظر آ جاتا تو وہ اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔

''مگر جو کچھ بھی کہو امی۔ وہی کھانا اس قدر لذیذ لگتا تھا کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ایسا کھانا بھی تو روزانہ میسر نہیں ہوتا تھا۔ کتنے روز درخت سے پھل اتار کر کھا کر گزارا کیا ہے۔ میدانی تربوز، خربوزہ، انناس، اس قسم کے پھل توڑ کر کھا کے گزارا کیا ہے۔''

''جنگ انسان میں کتنی تبدیلیاں لے آتی ہے۔ ورنہ تم جیسا صفائی پسند بچہ....''

رومی نے شرارتی ہنسی ہنس کر کہا، ''واقعی جنگ انسان کو بہت بدل دیتی ہے۔ ورنہ تم جیسی سخت ماں....''

میں بھی ہنس دی۔ ''رکو! بہت ہو گیا ہے۔ اب بتاؤ میلہ گھر میں کیا کیا ٹریننگ حاصل کی ہے؟''

''اوہو! وہ بتانا ممنوع ہے۔ صرف اتنا جان لو کہ کیپٹن حیدر نے ہم لوگوں کو کمانڈو ٹائپ گوریلا ٹریننگ دی ہے اور یہ کہ ہم لوگ کچھ مخصوص نوعیت کی ذمہ داری لے کر ڈھاکہ آئے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ جاننے کا اصرار

مت کرو۔"

جامی اور معصوم اونگھ رہے تھے۔شریف نے جماہی لے کر کہا، "رات کے تین بجے ہیں۔اب سو یا جائے۔باقی باتیں کل سنیں گے۔"

۱۹ اگست ۱۹۷۱ء بروز پیر

آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔۲۴ سال مکمل ہوئے ہیں۔ ہر سال ہم اس دن کو چند عزیز دوستوں کے ساتھ مناتے تھے۔ میں نے اگلے سال پر نظر رکھی ہوئی ہے۔۲۵ سال مکمل ہوں گے۔ سلور جوبلی کا جشن خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔

صبح سے بہت بارش ہو رہی ہے۔ دوپہر کے لئے کھچڑی اور گوشت کا سالن بنایا۔ ساتھ ہی فزلی آم بھی تھے۔ اس سال کسی کو مدعو نہیں کیا، صرف گھر کے افراد ہی موجود تھے۔ تقریب کرنے جیسی ذہنی کیفیت بھی نہیں اور تقریب کرنا درست بھی نہیں تھا تاہم رومی نے آتے ہی جس طرح سے کہا کہ دیکھا امی آپ کی شادی کی سالگرہ سے ایک روز پہلے ہی آ گیا ہوں، اسی کے پیش نظر یہ ہلکا پھلکا سا اہتمام کر لیا۔

رومی دوپہر کے بارہ بجے سو کر اٹھنے کے بعد نہا کر کھانے کی میز پر آیا تو خوش ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رومی باہر نکل ہی رہا تھا کہ عادت کے مطابق اسے ٹوک دیا "کہاں جا رہے ہو؟" رومی نے پیچھے مڑ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ماتھے پر بل ڈال کر کہا، "امی کوئی سوال نہیں پوچھنا البتہ اس مرتبہ جواب دے دیتا ہوں۔ سیلون جا رہا ہوں ڈاڑھی شیو کروانے کے لئے۔ اس کے بعد اور کام ہیں۔"

میں نے کہا، "ارے رک جاؤ، ایک تصویر اتار کر رکھتی ہوں۔"

رومی چہرے پر ہنسی پھیلا کر "نووے" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

رومی میں ایک یہ خرابی ہے کہ تصویر بالکل نہیں اتر واتا۔ گوریلا بننے کا اسے بہت دنوں سے شوق تھا۔ ایک مرتبہ تو فلسطینی لبریشن آرمی میں شامل ہونے کے لئے بہت ضد شروع کر دی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ گوریلاؤں کی کوئی تصویر نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے انہیں پکڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔

رومی لوٹا شام کے بعد۔ کھانے کی میز کے گرد بیٹھ کر شریف، میں، دادا بھائی، مرتضٰی، ڈاکٹر صاحب، فقیر، سب لوگ دھیمی آواز میں آزاد بنگلہ بے تار سٹیشن کی نشریات سن رہے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی شریف نے تیزی سے سٹیشن بدل دیا۔ دروازہ کھولنے کے بعد رومی کو دیکھ کر سکون کا سانس لے کر دوبارہ سوئی پہلے کی جگہ پر لے گئے۔ رومی کو دیکھ کر مرتضٰی کہہ اٹھے، "کیوں رومی تم تو نظر ہی نہیں آتے؟ جب بھی آتا ہوں پتا لگتا ہے کہ تم چھت کے کمرے میں جوڈو پریکٹس کر رہے ہو یا پھر دوست سے ملنے کے لئے گئے ہو۔ اتنی آوارہ گردی کرنا اچھا ہے کیا؟"

رومی سب کو سلام کر کے دیوان پر بیٹھا۔ ہنس کر دھیمے لہجے میں بولا، ''زیادہ آوارہ گردی تو نہیں کرتا انکل۔ چھت کے کمرے میں ہی زیادہ وقت گزارتا ہوں۔ جوڈو کراٹے کی پریکٹس کرتا ہوں، کتابیں پڑھتا ہوں اور ڈرائنگ کرتا ہوں۔''

مرتضٰی نے ہنس کر کہا، ''اپنا چھت کا کمرہ کسی روز دکھانا تو سہی۔''

میں نے کہا، ''ہاں، آپ کو ضرور دیکھنا چاہئے اس کا شوق پورا کرنے کے لئے کتنا خرچا کرنا پڑا ہے ہمیں دیکھئے گا۔ پورے فرش پر تین انچ اونچا ناریل کا گدہ ڈالنا پڑا ہے، صاحبزادے اندھا دھند گریں گے اس لئے۔ چھت کے ایک کونے میں رنگ ڈال کر اور فرش پر تین من کا کنکریٹ سلیب ڈال کر پنچنگ بیگ لٹکایا گیا ہے، صاحب زادے مکے برسا کر باکسنگ کی پریکٹس کرتے ہیں۔''

دادا بھائی نے کہا، ''بڑی اچھی بات ہے۔ کالج یونیورسٹی بند ہیں۔ باہر کی آفت سے بچنے کے لئے گھر پر ہی اگر مصروف رکھا جا سکے تو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے؟ ہمارے بچے تو گھر پر بیٹھے بیٹھے بور ہو گئے ہیں۔ باہر نکلنے کی اجازت دیتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

۱۲ اگست ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

پچھلے تین روز سے رومی کی شکل نظر آنی بھی مشکل ہوگئی ہے۔ کس وقت نکل جاتا ہے کب آتا ہے، اس کا کوئی ٹھیک ٹھکانہ نہیں ہے۔ پرسوں دوپہر کے وقت گھر پر دو اور گوریلا دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ بدیع اور جویل تھے۔ بدیع اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کا مانا ہوا طالب علم تھا۔ جویل بھی شہرت یافتہ ہے تاہم کرکٹ کے میدان میں۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی انہیں لے کر رومی نکل گیا۔ کہہ کر گیا کہ رات کو نہیں لوٹے گا۔

کل دھلو لوگوں نے دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھایا۔ چشی کی چھٹیاں تقریباً ختم ہوگئی ہیں۔ وہ لوگ ۱۵ تاریخ کو اسلام آباد لوٹ جائیں گے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر دھلو پوچھ رہی تھی ''رومی کہاں ہے؟ کھانا نہیں کھائے گا؟'' میں نے جواب دیا تھا، ''ابھی آجائے گا۔ ہم شروع کر دیتے ہیں۔''

مگر رومی لوٹا سہ پہر کے وقت۔ اتنی دیر میں دھلو لوگ جا چکے تھے۔ میں نے کہا، ''رومی ایک مرتبہ وقت نکال کر خالہ خالو سے ملاقات کر آنا۔'' کل بھی گھنٹہ ایک گھر پر رہ کر باہر نکل گیا۔ کہہ گیا کہ رات کو نہیں لوٹے گا۔

کچھ بھی نہیں کہہ رہی ہوں، کہنے کا موقع بھی نہیں ہے مگر رات کو نیند نہیں آتی۔ جامی کو دو روز سے بخار آ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے اینٹی بائیوٹک دی ہیں۔

میری طبیعت بھی بہت کمزور لگتی ہے۔ ہر وقت دل دھڑکتا رہتا ہے۔ رومی ساری باتیں کھول کر بتاتا تو شائد اتنی بے چینی نہ ہوتی۔

آج دوپہر کے کھانے کے بعد میز پر رومی کا کھانا ڈھانک کر چوکی پر لیٹی رہی۔ رومی آیا سہ پہر کے وقت۔ آتے ہی کہا ''امی کھانا دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' میز پر نظر پڑتے ہی کہنے لگا، ''واہ پہلے سے کھانا ریڈی ہے۔ گڈ اولڈ مم۔''

میں نے اٹھ کر ڈھکنا اتار کر رومی کی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا ''کل سہ پہر کے وقت انٹرکان میں حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہے۔ بالکل اندر کے ایک کمرے میں بچھوؤں نے بم کا دھماکا کیا ہے۔ تم جانتے ہو اس بارے میں؟''

''جانتا ہوں۔ کمرے میں نہیں پہلی منزل کے لاؤنج کے قریب ایک باتھ روم میں۔''

''تم شامل تھے اس مہم میں؟''

''نہیں۔''

''جولوگ تھے انہیں جانتے ہو؟''

''امی۔'' رومی کے لہجے میں تھوڑی سی خفگی۔

میں بھی اچانک غصے میں آ گئی۔ ''ٹھیک ہے تم سے اور کوئی سوال نہیں کروں گی لیکن جان لو کہ ہمارے بہت سے ذرائع ہیں۔ اس ڈھاکہ شہر میں خبر جیٹ پلین کی رفتار سے اڑتی ہے۔ سمجھ آئی؟''

رومی ہنس پڑا لیکن میں دھم دھم کر کے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے بیڈ روم میں رومی داخل ہوا۔ پاس بیٹھ کر کہا، انٹر کان کے اندر بم نہیں پھینکا ہے۔ وہ پلاسٹک ایکسپلوسیو تھا مختصراً پی کے کہتے ہیں۔''

میں نے بات نہیں کی۔ رومی کہتا رہا، ''جنہوں نے وہ کارروائی کی ہے انہیں تم نے پہلے نہیں دیکھا ہے۔ میں بھی پہلے نہیں پہچانتا تھا۔ میلہ گھر میں جا کر ملاقات ہوئی ہے۔''

میں خاموش رہی۔ رومی بھی تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا، ''وہ جو پی کے ہے دیکھنے میں بالکل پٹی کی طرح کا ہے۔ پیلے سے رنگ کا۔ بڑی بے ضرر سی شکل ہے۔ دیکھنے سے یوں لگے گا کہ فرنیچر کی دکان کی پٹی (Putty) ہی ہے۔''

میں پھر بھی خاموش رہی۔ میں نے سبق سیکھ لیا ہے۔ رومی نے جتنا بتانا ہے اتنا ہی بتائے گا۔ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں۔ میرا سوال کرنا بے معنی ہے۔

رومی تھوڑی دیر تک اپنے ہی خیالوں میں سیٹی بجاتا رہا۔ اس کے بعد نظم پڑھنے لگا:

دیکھنے میں کیسے ہو تم؟
کیسا لباس پہن کر گھومتے پھرتے ہو تم؟
سر پر ہے کیا الجھے بالوں کا جتھا؟
دیکھ لیتے ہو پیٹھ پیچھے نجومی سنت کی طرح؟
ٹوپی میں پر لگا کر
بے ڈھب ڈھیلی قمیض پجامے میں ملبوس
پیڑ کی بلند شاخ پر سیٹی بجاتے ہو پرندے کی طرح
یا سائے دار چائے کی ہٹی میں بیٹھتے ہو؟
دیکھنے میں کیسے ہو تم؟
پوچھتے ہیں اکثر لوگ
ڈھونڈتے ہیں تمہاری نسلی شناخت
تمہاری تلاش میں پھرتے ہیں تجربے کار جاسوس

گلی گلی فوجی تہس نہس کر کے تمام گھر ڈھونڈتے ہیں
تمہار ٹھور ٹھکانا
میں اٹھ کر بیٹھی۔ سوال کیا، ''کس کی نظم ہے؟''
''ڈھاکہ کے کسی مشہور شاعر کی۔ نام مجھے بھول گیا ہے۔ شہادت بھائی اور عالم کبھی کبھی ان سے لے کر جاتے ہیں اس پار۔ میلہ گھر میں ہم ان نظموں کو پڑھتے ہیں۔ اچھی لگے تو ایک آدھ نظم کاپی بھی کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ میں کسی کے پاس بھیج دی جاتی ہے۔''
''یہ نظم تو تم لوگوں کے بارے میں ہی لکھی گئی ہے۔''
''ہاں، اس کا عنوان ہے گوریلا۔ باقی حصہ سنو
بس میں ہوتا تو آسمان چیر کر نکال لاتے
وہ غوطہ لگاتے پاتال کے اندھیروں میں
تم مستقبل کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑھ رہے ہو
ہر طرف تمہارے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے
دکھ ہوتا ہے، تم میرے بھائی ہو
اے میری اولاد دو.....''
میں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا، ''شہادت اور عالم اب ڈھاکہ میں نہیں آتے؟''
''آتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں۔''
''اس مرتبہ نہیں آئے؟'' کہتے ہی فوراً بات بدل کر میں نے کہا، ''یعنی اس مرتبہ آئیں تو شاعر کا نام پوچھ لینا۔''
رومی ہنس دیا، ''امی یو آر سمپلی انکریڈبل، وہ شاعر ڈھاکہ میں ہی رہتے ہیں۔ میں جو نام بھول گیا ہوں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ تم دوبارہ کیوں جاننا چاہتی ہو؟ اس سے تم بھی مصیبت میں پڑ سکتی ہو اور شاعر کی بھی درگت بن سکتی ہے۔''
یہ ایک آنکھ مچولی چل رہی ہے۔ رومی کہتا ہے کہ ساری باتیں جاننے کی کوشش مت کرو۔ پکڑے جانے سے ٹارچر کے دوران ہو سکتا ہے کہ کہہ دو۔ میں کبھی اچھی بچی کی طرح اور کبھی روٹھ کر رومی کی بات ماننے کے باوجود تھوڑی دیر کے بعد بھولے سے دوبارہ سوال کر دیتی ہوں۔
اس مرتبہ غصہ نہیں کیا۔ ہنس کر کہا، ''سچ مچ بڑی مصیبت ہے۔ بار بار بھول جاتی ہوں۔ بوڑھی عمر میں سارا نظام الٹ گیا ہے۔ ابھی تم بابا ہوئے ہو اور میں تمہاری چھوٹی سی بچی۔ سو دل کا ارمان مٹا کر ڈانٹ لو۔''

۱۵ اگست ۱۹۷۱ء بروز اتوار

ہم سب لوگ بہت اداس ہیں۔ گزشتہ روز صبح چھ بجے جوبلی نے فون کر کے بتایا کہ رات کے ڈیڑھ بجے فوجی آ کر فقیر کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ مشکل سے منہ ہاتھ دھو کر ایک پیالی چائے کی پی کر جوبلی لوگوں کے گھر پر گئی۔ گھنٹہ ایک خاموش بیٹھی رہی۔ اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عتیق، بولو، رینو، چمو، کچھ پڑوسی۔ جوبلی میگھلا اور برسن کو گود میں لے کر ویران آنکھیں کھول کر خاموش بیٹھی تھی۔ کسی کی زبان پر کوئی بات نہیں تھی۔

آج دھلو لوگ اسلام آباد واپس چلے گئے۔ امی اور لالو کو لے کر ائیر پورٹ پر گئی تھی۔ ایک بہن کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ دوسری بہن بیلو، اس کا شوہر عزیز اور تین بچوں کے ساتھ اسلام آباد میں ہے۔ ان کا ابھی چھٹی پر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ان کے ساتھ کب ملاقات ہوگی کون کہہ سکتا ہے؟ آیا کبھی ملاقات ہوگی بھی کہ نہیں کون جانتا ہے؟

ائیر پورٹ سے واپسی پر جوبلی لوگوں کے گھر پر گئی۔ رفیق کے ساتھ اسی رات تین اور پروفیسروں کو پکڑا ہے۔ وہ لوگ ہیں، شعبہ ریاضیات کے شہید اللہ، شعبہ معاشرتی علوم کے صادالدین اور شعبہ تاریخ کے ابوالخیر صاحب۔

امی اور لالو کو جوبلی لوگوں کے گھر چھوڑ کر شریف اور میں نیو مارکیٹ گئے۔

چند دنوں سے وقت ملنے پر ہی مختلف دکانوں پر ایک چیز ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ واٹر پروف گھڑیاں بازار میں دستیاب ہیں لیکن واٹر پروف سگریٹ کیس آج تک کسی کمپنی نے تیار کیا ہے ایسی بات میں نے کبھی نہیں سنی۔ چند دن پہلے رومی نے کہا تھا، ''امی ذرا پتا کر کے دیکھنا کوئی ایسا سگریٹ کیس ملتا ہے کہ نہیں جس کا ڈھکنا بہت کس کر بند ہو جائے تا کہ پانی میں گرنے سے بھی پانی اندر نہ جائے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا تھا، ''کیوں ایسے کیس کا کیا کرو گے؟''

''ایکشن میں پاک آرمی یا رضا کار پیچھا کریں تو ہمیں دوڑ لگانی پڑتی ہے۔ کبھی تالاب یا دریا میں چھلانگ لگانی پڑ جاتی ہے، کبھی گلے تک پانی کے اندر چل کر دشمن کی طرف آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ایسے مواقع پر سگریٹ اور ماچس بھیگ جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے چند ایک لائٹر بھی خرید لانا۔ لیکن دیکھنے میں زیادہ شوخ یا فینسی نہ ہو۔ کسی کو پسند آ گیا تو کوئی مانگ لے گا۔''

لہٰذا ہم کچھ دنوں سے واٹر پروف اور فرسودہ گھسی ہوئی شکل کا سگریٹ کیس اور لائٹر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جناح ایونیو پر ایک ملا تھا، ڈھکنا خوب سختی سے بند ہو جاتا تھا مگر دیکھنے میں بہت شوخ اور خوبصورت تھا۔ اس لئے نہیں خریدا۔ نیو مارکیٹ میں نہیں ملا۔ میں نے کہا، جناح ایونیو والا ہی کل خرید لوں گی۔ جھانواں پھیر کر اور گھس کر باہر کی شکل پرانی کر لوں گی۔ آج مزید اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ چلو گھر چلیں۔"

واپسی پر ایک کارٹن ۵۵۵ سگریٹ خرید لیا محلے میں رشید کی دکان سے۔

سہ پہر کے وقت رومی نے کہا، "امی چلو تمہیں ایک گھر پر لے جاؤں۔ تمہاری طبیعت بالکل تازہ دم ہو جائے گی۔"

"کہاں پر؟"

"پہلے سے نہیں بتاؤں گا۔ سرپرائز!"

"مگ بازار کے چوک سے تیج گاؤں انڈسٹریل ایریا کی طرف تھوڑا سا جا کر ریلوے لائین کے اس پار گاڑی تھوڑی دور جانے کے بعد دائیں طرف ایک گلی میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دور تک جانے کے بعد دوبارہ دائیں مڑ کر ایک منزلہ مکان کے سامنے رک گئی۔ ۲۸ بڑا مگ بازار۔ دو قدم سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ریلنگ سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا برآمدہ، برآمدے میں ایک صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر مجھے آداب کیا۔ رومی نے کہا، "امی یہ ہے آزاد۔ اسے تم نے بچپن میں دیکھا ہے، بہت سال پہلے ہم ان کے گھر پر بہت مرتبہ مدعو کئے جا چکے ہیں۔"

یاد نہیں کر سکی مگر کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جب اس کی امی کو دیکھا تو سب کچھ یاد آ گیا، بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ بہت سال پہلے کی بات ہے، کم از کم دس بارہ سال تو ہو ہی گئے ہوں گے، ان کے گھر کتنا آتے تھے، ان کے ساتھ کتنا کھایا پیا تھا، سب یاد ہے۔ آزاد کے والد مسٹر یونس احمد تاجر تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا تعارف ہوا تھا۔ ہمارے ایک بھانجے مصر کے توسط سے۔ آزاد کی امی کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں۔ ہم لوگ اکثر چھٹی کے روز ان کے گھر پر دعوت کھانے جاتے تھے اور آزاد کی امی کے ہاتھ کا لذیذ کھانا کھا کر چٹخارے لیتے تھے۔ وہ لوگ شروع میں پرانے ڈھاکہ میں رہتے تھے۔ اس کے بعد مسٹر چودھری نے نیو اسکاٹن روڈ پر مکان تعمیر کروایا۔ بہت بڑا سا مکان، پورے مکان میں موزائک لگا ہوا، ساری فٹنگ مہنگی اور اجلی۔ آزاد کی امی کا ڈریسنگ روم ہی ایک پورے بیڈ روم جتنا تھا۔ مکان کے سامنے کافی ساری خالی زمین باغ کے لئے چھوڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف ہرن کا بڑا سا پنجرہ جس کے اندر ایک خوبصورت سا ہرن بھی تھا۔ آزاد اس وقت دس بارہ سال کا بچہ تھا۔

اس کے بعد کئی سال تک نہیں یاد کیسے رابطہ منقطع رہا۔ لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ مسٹر چودھری نے دوسری شادی کر لی ہے۔

اب آزاد کی امی نے پوری بات خود ہی بتائی۔ شوہر نے جب دوسری شادی کی تو وہ اپنے واحد بچے آزاد کو ساتھ لے کر شوہر کا گھر چھوڑ کر آ گئی بہت سال پہلے ہی۔ بہت دکھ اور تکلیف اٹھا کر بچے کی پرورش کی۔ اب

آزاد نوکری کرے گا، کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔

آزاد کی امی کی طرف گھورتی رہی۔ ہمیشہ سے دیکھتی آئی ہوں کہ باہر سے نرم لہجے اور شیریں مزاج کی یہ خاتون اندر سے بڑے مضبوط دل کی مالک ہیں مگر اس قدر خود مختار اور ضدی ہیں پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اب بہت دبلی ہوگئی ہیں۔ تن پر باریک حاشیے والی سفید ساڑھی، گلے میں کوئی زیور نہیں ہے۔ پہلے صحت مند، گورا رنگ، بازو، کان، گلے میں سونے کے زیورات چمک رہے ہوتے تھے۔ چوڑے حاشیے والی ساڑھی کے آنچل میں چابیوں کا گچھا بندھا ہوا رہتا تھا۔ پان کے رس سے ہونٹ سرخ رہتے تھے۔ ہونٹوں پر ہر وقت ہلکی سی مسکراہٹ، روائتی بنگالی سگھڑ بیوی کا ماڈل، وہی مسز چودھری شوہر کی دوسری شادی کے احتجاج میں شدید خودداری کا احساس لے کر، دولت سے بھرا، محفوظ گھر چھوڑ کر چلی آئیں۔

میں نے ایک لمبی آہ کو سینے ہی میں دبا دیا۔ سکاٹن کا مکان آزاد کے نام پر ہے۔ وہ مکان چھوڑ کر وہ اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر نکل آئی تھیں۔ رہ رہی ہیں کرائے کے مکان میں۔

لڑکے کو دیکھ کر دل کو سکون ملا۔ صحت مند خوش شکل نوجوان، اپنی ماں کی طرح ہی ہنس مکھ۔

ہماری موجودگی ہی میں ایک لڑکا آیا وہاں پر۔ رومی نے دھیمے لہجے میں تعارف کرایا، ''قاضی کمال الدین، پروفیشیل باسکٹ بال ٹیم کا نامور کھلاڑی۔ میلہ گھر میں تعارف ہوا ہے۔ جانتی ہو امی، قاضی بھائی کو اس مرتبہ نیشنل باسکٹ بال ٹیم کے کیمپ میں بلایا گیا تھا مگر قاضی بھائی نے انکار کر دیا۔''

۱۸ اگست ۱۹۷۱ء بروز بدھ

صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ کئی دنوں سے ہی خوب مینہ برس رہا ہے۔ بیچ بیچ میں رکتا ہے، آج رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اسی اثناء میں شریف، ڈرائیور امیر الدین کے ساتھ جا کر بازار سے سودا لے آئے ہیں۔ رومی نے چند دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔

۲۸ نمبر روڈ کے جس مکان پر ان کا مرکزی ڈیرہ ہے وہاں پر چند دنوں میں بہت سے گوریلا نوجوان آ گئے ہیں۔ بہت رش ہو گیا ہے۔ رومی لوگوں کو چند لڑکوں کے ساتھ الگ بیٹھ کر کچھ پلاننگ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری چھت کا کمرہ اس مقصد کے لئے بالکل آئیڈیل ہے۔ پورے فرش پر گدہ ڈالا ہوا ہے، رومی اور جامی کی جوڈو پریکٹس کے لئے۔ صبح اس کو اوپر سے چادر ڈال کر ڈھانک دیا تھا۔ دوسری منزل سے چند ایک تکیئے اور ایش ٹرے لا کر رکھ دی تھی ساتھ ہی ۵۵۵ سگریٹ کے چند پیکٹ۔

لڑکے دس بجے آئے اور چھت والے کمرے میں دروازہ بند کر کے میٹنگ میں بیٹھ گئے۔ درمیان میں ایک مرتبہ رومی خود آ کر اپنے ہاتھوں سے چائے اور ناشتے کی ٹرے اٹھا کر اوپر لے گیا تھا۔

ڈیڑھ بج گیا مگر انہوں نے اترنے کا نام تک نہیں لیا۔ میز پر کھانا لگا کر خود چھت والے کمرے کے پاس گئی، دروازے پر دستک دی۔ کمرے کے اندر سے گفتگو کی آواز آ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوتے ہی سب اچانک خاموش ہو گئے۔ میں نے ذرا بلند آواز میں کہا "کھانا تیار ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد دروازہ تھوڑا سا کھول کر رومی نے کہا، "تم جاؤ ہم دو منٹ کے اندر آ رہے ہیں۔" دروازے سے اندر نظر آیا سارا کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا ہے۔ دل ہی دل میں ہنس کر نیچے اتر آئی۔ چھت کے کمرے کا دروازہ کھڑکیاں بند کر کے تمام پردے اچھی طرح ڈال کر وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں سب کھانے کے لئے نیچے آ گئے۔ ان میں سے قاضی، عالم اور بدیع کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ ابھی رومی نے سپن اور چلو کے ساتھ تعارف کرایا۔ ان میں سے عالم کے علاوہ باقی سارے عمر میں رومی سے دو چار سال بڑے ہیں۔ شروع سے ہی رومی کی دوستیاں ہوتی تھیں اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ اور اب تو جنگ کے اندر تیرہ سے لے کر تیس تک سب ہم جولی ہیں۔

لڑکے بالکل خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے کہا، "میلہ گھر کی کچھ باتیں کرو نا میں بھی سنوں۔"

۲۰ اگست ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

رات کے تقریباً دو بجے ہیں۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ اس بار کی برسات نے بالکل ساڑھ کر رکھ دیا ہے۔ بوڑھی گنگا میں پانی بڑھ گیا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں سیلاب آ چکا ہے، خاص طور پر پٹنہ، کشتیا، فرید پور اور راجشاہی ضلعوں کی حالت بہت خراب ہے۔ روزانہ اخبار میں خبریں شائع ہو رہی ہیں، کون کون سے دریاؤں میں پانی بڑھا ہے، کن کن ضلعوں میں سیلاب سے کتنے تھانے ڈوب گئے ہیں۔

کثرت سے بارش اور سیلاب کی وجہ سے فوجی جنتا بہت پریشان ہے۔ خشک علاقوں کے پاکستانی فوجیوں کا اس قدر بارش، سیلن اور کیچڑ میں برا حال ہو گیا ہے اور مکتی باہنی کے لئے آسانی ہو گئی ہے۔ ندی، نالوں، نہروں اور دریاؤں میں بے خطر تیرنے والے جیالے، پاک فوجیوں کو خوب منہ کی کھلا رہے ہیں۔ سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ اللہ مکتی فوجوں پر رحمت برسا رہا ہے اسی لئے حد سے زیادہ بارش ہو رہی ہے۔

رومی کل دوپہر کے وقت نکل گیا تھا۔ کہہ گیا ہے کہ دو روز کے بعد آئے گا۔ ڈھاکہ آنے کے بعد سے ہی غور کر رہی تھی کہ رومی کسی بے چینی میں مبتلا ہے۔ اتنے دنوں کے بعد تھوڑی سی وجہ بتائی ہے۔ سدھرگنج پاور سٹیشن تباہ کرنے کی ذمہ داری لے کر ان کا ٹولا ڈھاکہ آیا ہے مگر آ کر دیکھا کہ وہ پاور سٹیشن مضبوط قلعہ بنا ہوا ہے۔ پہلے جہاں سٹیشن کے اندر ایک پلیٹون فوجی پہرا دیتے تھے اب وہاں پر فوجیوں کی پوری کمپنی ڈیوٹی پر فائز ہے۔ ڈھاکہ نارائن گنج روڈ فوج کے جوان ''ری کویل لس'' رائفل اٹھا کر اس سرے سے اس سرے تک ڈیوٹی کر رہے ہیں حتیٰ کہ کشتی پر سوار ہو کر دریا کے اندر بھی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اولن، گل باغ اور دھان منڈی میں ایکشن کے بعد پاکستان آرمی انٹیلیجنس بہت چوکس ہو گئی ہے۔ فارم گیٹ اور انٹرکان کے ایکشن کے بعد فوجی جنتا بالکل پاگل کتے کی طرح بگڑ گئی ہے۔ حقیقتاً پورے ڈھاکہ شہر میں ہی اس وقت سیکورٹی بھیانک حد تک سخت ہے۔ سدھرگنج کے علاوہ دوسرے جن ایکشنوں کے لئے انہیں ہدایت ہے فی الحال وہ ان پر توجہ دے رہے ہیں۔

گوریلوں کے بہت سے گروہ اب ڈھاکہ میں موجود ہیں۔ وہ روزانہ مختلف جگہوں پر کچھ نہ کچھ ایکشن کر رہے ہیں۔ ان کو ہدایت دی گئی ہے کہ ہمہ وقت چھوٹے بڑے مختلف نوعیت کے ایکشن برپا کر کے فوجی جنتا کو مسلسل پریشانی، تشویش اور خوف میں مبتلا رکھیں۔ شہر کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایسے انداز میں ایکشن کرنا ہے کہ پاک آرمی کو یوں لگے جیسے شہر میں ہزارہا بچھو پھیلے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ کر بھی ایسا ہی رہے ہیں۔

اس وقت رومی لوگ کہاں پر کیا کر رہے ہیں کون جانتا ہے؟ کسی مکان کے اندر سوئے ہوئے ہیں؟ کسے معلوم ہے؟

یہ سب کچھ سوچ کر دل کی دھڑکن بڑھ رہی ہے۔ لیٹ نہیں پا رہی۔ اٹھ کر رومی لوگوں کے کمرے میں چلی گئی۔ جامی چارپائی پر نیند میں بیہوش ہے۔ رومی کے پلنگ پر خاموشی سے بیٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔

میلہ گھر میں بھی کیا اس وقت بارش ہو رہی ہوگی؟ باڑھ والے کمرے کے اندر سوراخوں کے نیچے سے اندر پانی گھس کر فرش گیلا کر رہا ہوگا۔ پرسوں قاضی اور عالم کی زبانی میلہ گھر کے بارے میں بہت سی باتیں سنیں۔ ان لوگوں نے پہلی مرتبہ اپریل کے وسط میں سرحد عبور کی۔ میلہ گھر میں سیکٹر ٹو کا ہیڈ کوارٹر بنا تھا، جون کے اوائل میں۔ اس سے پہلے وہ لوگ متی نگر میں تھے۔ شروع میں انہیں بہت زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی۔ تقریباً بالکل بے سرو سامان تھے۔ شروع شروع میں کھلے آسمان کے نیچے گھاس پر لیٹ کر کتنے دن ہی گزار دیئے۔ جسم کے اوپر سے کیچوئے، بچھو کتنا کچھ چلتے پھرتے رہے حساب نہیں۔ اس کے بعد خیموں کا انتظام ہو گیا۔ خیمے کے اندر زمین پر ٹاٹ ڈال کر گزارا کرتے رہے۔ کھانا کھایا مٹی کے برتن میں یا گرینیڈ کے بکسے کاٹ کر، ان کے اندر۔ بھارتی بریگیڈیر پانڈے جب ان کے کیمپ کا معائنہ کرنے کے لئے آئے تو مٹی کا برتن اور گرینیڈ کے بکسے دیکھ کر ان کو پلیٹیں اور برتن وغیرہ فراہم کرنے کا حکم دیا۔ لڑکوں نے کہا ''ہمیں برتن پلیٹ نہیں چاہئے، ان کے بدلے ہمیں بلٹ دینے کے لئے کہئے۔'' کس دھات کے بنے ہوئے ہیں یہ لڑکے، برتن کی بجائے بلٹ مانگتے ہیں! اور کھانا؟ زیادہ تر صرف دال اور چاول۔ کبھی کبھی تھوڑی بہت سبزیاں اور کبھی قسمت میں ہو تو مچھلی۔ ستم یہ کہ نمک نہیں ملا بہت عرصے تک۔ پہلے روز جب دال اور ترکاری میں نمک ڈالا گیا تو کھانا کم پڑ گیا تھا۔ عالم ہنس ہنس کر تذکرہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پینے کے پانی کی قلت تھی۔ چھوٹی سی ایک نہر کی طرح کا تالاب تھا، اسی پانی سے سارا کام مکمل کیا جاتا تھا۔ پیا بھی جاتا تھا!

متی نگر سے میلہ گھر تک کا سفر، کیپٹن حیدر کے حکم پر کیمپ توڑ کر سارا سامان کندھوں پر اٹھا کر راتوں رات روانہ ہوئے۔ ساری رات پیدل چلنے کے بعد سحر کے وقت جہاں پر رکے وہی جگہ میلہ گھر ہے۔ متی نگر سے ۱۲/۱۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پچھلی رات کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ملا تھا۔ سر اور کندھوں پر بھاری بوجھ اٹھا کر رات بھر چلنا، صبح درخت سے پھل اتار کر اس سے ناشتہ کرنا اور اس کے بعد ٹیلے کے اوپر کیمپ تیار کرنے کا کام، سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ہی کرنا پڑا۔ دو منزلوں جیسے اونچے ٹیلے کے نیچے سے مٹی کاٹ کر اوپر تک سیڑھیاں بنانا اور بعد میں پیڑوں کی شاخیں کاٹ کر مٹی میں دبا دینا تاکہ سیڑھیوں میں پھر نہ مٹی بھر جائے۔

رات کے وقت نیند نہ آئے تو سوچ و فکر بہت تیکھی ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میلہ گھر میری آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ تین چار روز پہلے دوپہر کے کھانے کے بعد رومی سنا رہا تھا میلہ گھر میں گزرے دنوں کی باتیں۔ رومی جب پہنچا تو انتظامات بہت بہتر ہو چکے تھے۔ بہت سے خیمے، باڑھ کی چہار دیواری والے لمبے

بیرک، بانس کی چوکیوں پر پرال کے گدے اوران کے اوپر چادریں اور تکیئے۔ٹریننگ اورایکشن کے لئے بہت سا اسلحہ، گولیاں، گرینیڈ۔

ایک رات کورومی نے سنتری کی ڈیوٹی کرنی تھی، چنداور ساتھیوں کے ساتھ۔ بہت رات کو ٹیلے کے اوپر رومی کھڑا تھا۔آس پاس چھوٹے بڑے چنداور ٹیلے تھے،ادھرادھر چھوٹے بڑے درخت۔

رومی کہہ رہا تھا،''جانتی ہوامی، وہاں پرتو شام کے سات ساڑھے سات بجے تک کھانا پینا مکمل ہوجاتا ہے۔ پورے دن کی محنت سے سب لوگ اتنا تھک جاتے ہیں کہ آٹھ نو بجے تک زیادہ تر لڑکے سو جاتے ہیں۔ کسی کسی خیمے میں شائد کچھ لوگ مزید تھوڑی دیر تک گانا وغیرہ گاتے ہیں یا گپ شپ کر لیتے ہیں۔

اس رات کو ٹیلے کے اوپر کھڑے ہوکر کیا دیکھا کہ ایک خیمے میں روشنی ہورہی ہے اور وہاں سے گانے کی آواز آرہی ہے۔

میں سمجھ گیا کہ اعظم خان گا رہا ہے۔اعظم خان کی خوبصورت آواز ہے۔دوسری طرف بہت دلیر گوریلا، زبردست لڑاکا۔اس روز رات کے وقت چاروں جانب گھپ اندھرا تھا، دوسری تمام بیرکیوں اور خیموں میں سب بتی بجھا کر سو گئے تھے۔اس ایک خیمے کے اندر لالٹین کی روشنی میں پورا سفید خیمہ فاسفورس کی طرح جل رہا تھا۔اوپر سے دیکھنے میں یوں لگ رہا تھا جیسے وسیع سیاہ سمندر کے اندر ایک روشن جہاز چل رہا ہو اور اعظم خان کے گانے کا سر، یوں لگتا تھا کہ چاروں سمت ایتھر میں تیر کر ہزاروں میل تک پھیلتا جارہا ہے۔اس وقت میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ابھی بارش سے بھیگی ہوئی اس اندھیری رات میں جیسے مجھے آنکھوں کے سامنے نظر آیا، خاموش ٹیلے کے اوپر مکتی فوج کے چند جیالے ۳۰۳ رائفل اٹھا کر سنتری ڈیوٹی پر اپنے پورے اعصاب کو چست کئے کھڑے ہیں اوران کے چاروں جانب ہوا میں تیرتا جارہا ہے ایک نغمہ، اعظم خان کی سریلی آواز میں۔

۲۱ اگست ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

صبح رومی کا فون ملا، دیبا لوگوں کے گھر سے۔ رومی وہاں پر ہے اسے لانا ہوگا۔

رومی کے ڈھاکہ آنے کے بعد سے گاڑی گھر پر ہی رہتی ہے کب ضرورت پڑ جائے اس لئے شریف بانکا یا منظور کی گاڑی پر دفتر جاتے آتے ہیں۔

جا کر دیکھا رومی کا رنگ اڑا ہوا ہے، دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی، خشک الجھے ہوئے بال، رت جگی سرخ آنکھیں، میلے کچیلے کپڑے۔ رومی نے کہا، ''یہ صورت لے کر ٹیکسی پر بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گلشن لیک سے منی ماموں لوگوں کا مکان بالکل قریب ہے چنانچہ اس طرف سے آیا ہوں۔''

سمجھ گئی کہ دریا کے اس پار ان کا جو ڈیرہ ہے وہاں سے آ رہا ہے۔

گھر کی طرف گاڑی موڑ کر کہا، ''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن حلیہ کیوں بگڑا ہوا ہے، بتانے کی گنجائش ہے۔؟''

''بتاتا ہوں۔'' رومی افسردہ ہنسی ہنسا۔ سر پیچھے ٹیک کر آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کہنے لگا، ''پرسوں رات دو کشتیاں لے کر ہم کچھ لڑکے سدھر گنج پاور سٹیشن کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لینے کے لئے نکلے تھے۔ سامنے کی کشتی پر قاضی بھائی، بدیع اور جویل تھے۔ اندھیری رات میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہم پیچھے کی کشتی پر ذرا فاصلے پر تھے۔ اصل میں قاضی بھائی لوگ کسی چیز کا بغور مشاہدہ کرنے کے لئے آگے نکل گئے تھے، ہمیں پیچھے رہنے کے لئے کہا تھا۔ اچانک بھیانک گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ بھی سمجھ نہیں پائے۔ اندھیرے میں چیخ سنائی دی، پانی میں چھلانگ لگانے کی آواز آئی۔ ہم گھبرا گئے۔ گھوڑی دیر میں قاضی بھائی لوگوں کی کشتی کے قریب پہنچ کر سب معلوم ہو گیا۔ قاضی بھائی لوگ ملٹری سے بھری ہوئی ایک کشتی کے سامنے آ گئے تھے۔ ملاح تھا رضا کار۔ اس نے بنگالی میں دریافت کیا ''کون جا رہا ہے؟'' ملٹری والے بالکل خاموش تھے۔ قاضی بھائی نے ذرا گھما کر جواب دیا ''سامنے۔'' کشتی بالکل قریب پہنچتے ہی انہوں نے غور کیا کہ کشتی میں فوجی بھرے ہوئے ہیں۔ قاضی اور جویل نے تو اپنی سٹین گنیں پھٹوں کے نیچے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں مگر بدیع نے ایسا نہیں کیا تھا، اس نے گن اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ شکر ہے کہ کسی کی نظر نہیں پڑی، اسی لئے ہم سب بچ گئے۔ بدیع نے فوراً سٹین گن اٹھا کر ان کی کشتی پر برسٹ فائر کیا۔ پورا میگزین بالکل خالی کر دیا۔ ملٹری نے بھی گولی چلائی لیکن بدیع کی فائرنگ کے آگے ٹک نہیں

سکے۔ملٹری والوں میں سے کچھ مارے گئے۔ باقیوں نے پانی میں چھلانگ لگادی۔ان کی کشتی بھی الٹ گئی تھی۔ بدیع بھی پانی میں گر گیا تھا۔اسے اٹھا کر ہم سب لوگ ''پیرولیا'' گاؤں میں واپس چلے گئے۔ جویل کی انگلی پر گولی لگی تھی جس کی وجہ سے ہمیں بڑی مشکل پیش آئی۔ وہ رات صرف فرسٹ ایڈ دے کر بڑی مشکل گزاری۔کل قاضی بھائی بدیع اور جویل کو ڈھاکہ لے آئے ہیں۔اس کی انگلی کا آپریشن کرنا پڑے گا۔''

میرے جسم میں کانٹے دوڑنے لگے۔ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ سب لوگ گولیاں کھا کر زخمی حالت میں دریا کی تہہ میں ڈوبے ہوتے۔ہم کبھی جان بھی نہ پاتے کہ ان لڑکوں کا کیا بنا!

رومی سے یہ بات کہی تو وہ ہنسنے لگا،''ہمارے سیکٹر کمانڈر کرنل خالد مشرف کیا کہتے ہیں جانتی ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی آزاد مملکت زندہ گوریلے نہیں چاہتی۔خون میں نہائے ہوئے شہید مانگتی ہے چنانچہ امی جان، ہم سب لوگ شہید ہو جائیں گے اس بات کے لئے ذہنی طور پر ہر وقت تیار رہیں۔''

میری آنکھوں میں یکا یک آنسو آ گئے۔گاڑی چلانے میں دشواری ہوگی یہ بات سوچ کر مزید کچھ کہے سنے بغیر سر اٹھا کر آنکھوں کے آنسو پینے کی کوشش میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔رومی نے بات سمجھ کر موضوع تبدیل کر دیا۔''جانتی ہو امی، جویل کے زخمی ہونے کی وجہ سے ہماری کارکردگی میں تھوڑی سستی آجائے گی۔ جویل کو احتیاط کے ساتھ چھپا کر رکھنا پڑے گا۔ہمیں بھی ذرا زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔اصل میں سدھر گنج پاور سٹیشن پر ابھی تک کارروائی کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، اس لئے دل میں ذرا بھی چین نہیں ہے حالانکہ اس پاور سٹیشن کو اڑانے کے لئے میلہ گھر میں حیدر بھائی نے ہم لوگوں کو سپیشل ٹریننگ دی ہے۔قاضی بھائی اس گروہ کے لیڈر ہیں۔ اس کارروائی کے لئے ہم اپنے ساتھ کافی اسلحہ لے کر آئے ہیں۔ایک "3.5 گنر راکٹ لانچر اور اس لانچر کو چلانے کے لئے آرٹلری سے ایک گنر کو بھی ہمارے ساتھ بھیجا گیا ہے۔آٹھ عدد راکٹ شیل، اس قدر بھاری ہیں کہ اٹھا کر لانے میں ہماری جان نکل گئی۔اس کے علاوہ دو ایس ایل آر لانچر، ہر آدمی کے لئے ایک ایک سٹین گن، چار چار میگزین، لاتعداد بلٹ اور دو دو ہینڈ گرینیڈ۔ یہاں پر آ کر دیکھا کہ ہیوی سیکورٹی ہے، صرف باہر سے راکٹ شیل مار کر کچھ بھی نہیں بگاڑا جا سکے گا۔مار کر فرار ہونا بھی ممکن نہیں ہوگا لہٰذا اندر سے سبوتاژ کرنے کے بارے میں بھی غور کیا گیا۔قاضی بھائی، عالم، شہادت بھائی اور چند اور لوگوں نے اکٹھے بیٹھ کر حکمت عملی طے کی۔اسی منصوبے کے مطابق عالم اور شہادت بھائی اب کام کر رہے ہیں۔ پاور سٹیشن کے اندر کے دو ملازموں کو''دھماکہ خیز مواد'' ہینڈل کرنے کی تھوڑی بہت تربیت دے کر ان کی مدد سے، یہ مواد تھوڑا تھوڑا کر کے اندر پہنچایا جا رہا ہے۔سب ملا کر ۸۰/۹۰ پاؤنڈ''پی کے'' کی ضرورت ہوگی۔ایک وقت میں ۸/۱۰ پاؤنڈ''پی کے'' روٹی کی طرح بیل کر گاڑی کے دروازے کے اندر کا ہارڈ بورڈ اتار کر اس کے اندر رکھ دیا جاتا ہے۔ہارڈ بورڈ کو دوبارہ لگا کر گاڑی کو سٹیشن کے اندر لے جایا جاتا ہے اور پھر یہ پی کے نکال کر چھپا دیا جاتا ہے۔اس کام پر وقت زیادہ لگ رہا ہے۔اس کے علاوہ اتنی مقدار میں پی کے ڈھاکہ میں موجود نہیں ہے۔ باہر سے منگوانا پڑ رہا ہے۔سارا پی کے سٹیشن کے اندر منتقل ہو جانے کے بعد کوئی تاریخ مقرر کی جائے گی، اندر سے بلاسٹ کرنے کے لئے اور اسی روز ایک ہی وقت میں ہم لوگ باہر

سے راکٹ شیل مار کر پاک فوجیوں کو مصروف رکھیں گے۔ یہ حکمت عملی جب تک کامیاب نہیں ہوتی تب تک ہم دوسرے ایکشن جاری رکھیں گے۔"

راکٹ لانچر، ایس ایل آر، لانچر.....کیا بلا ہیں سمجھ نہیں سکی لیکن پوچھنے میں بھی جھجک محسوس کی۔ میرے آنسو روکنے کے لئے رومی ٹرٹرا تنی باتیں کر گیا جو وہ کبھی نہیں کرتا، اوپر سے مزید سوال کر کے اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی۔ بعد میں کسی وقت معلوم کرلوں گی۔

گھر پر پہنچ کر رومی نے کہا، "امی ناشتہ ریڈی کرو۔ میں شیو اور غسل سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔"

دھلے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہو کر ناشتہ مکمل کر کے رومی نے کہا، "جا کر جویل کی خیریت معلوم کر آتا ہوں۔"

"جلدی لوٹ آنا۔ میں بھی جویل کی خیریت جاننے کے لئے بے چین رہوں گی۔"

کون جلدی لوٹتا ہے! واپس آیا شام کے بعد۔ ساتھ میں بدیع بھی تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی رومی نے کہا، "امی اس نا قابل یقین دلیر لڑکے کو ذرا اچھی طرح کھلا پلا دو۔ اس کی وجہ سے ہی ہم لوگ اس روز بچ گئے تھے۔"

بدیع نے شرمندہ ہو کر رومی کو ہلکا سا ڈانٹ دیا، "زیادہ بکا مت کرو۔"

میں نے پوچھا، "جویل کی حالت کیسی ہے؟"

"جویل خیریت سے ہے۔ کل شام کو قاضی اور بدیع جویل کو ڈاکٹر رشید الدین احمد کے چیمبر میں لے گئے تھے۔ قاضی کا ایک دوست ہے کٹو۔ اس کے والد شمس العالم، ڈاکٹر رشید کے دوست ہیں۔ عالم صاحب کی گاڑی پر ہی وہ لوگ گئے تھے۔ البتہ ڈاکٹر رشید کے چیمبر میں آپریشن کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے ڈاکٹر رشید جویل کو ڈاکٹر متین کے کلینک میں لے گئے۔ وہاں پر آپریشن تھیٹر ہے۔ وہیں رشید نے جویل کی انگلی کا آپریشن کر کے پٹی کر دی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دوبارہ دکھانا پڑے گا۔"

بدیع نے کہا، "ڈاکٹر متین کا کلینک کہاں پر ہے جانتی ہیں؟ راجر باغ پولیس سٹیشن کے عین سامنے لہٰذا ڈاکٹر رشید "ڈاکٹر" کی پلیٹ والی ووکس ویگن پر بٹھا کر جویل کو لے گئے تھے۔ ان کی ہمت کی تعریف کرنا چاہئے مگر جویل کو دکھانے کے لئے ہم دوبارہ وہاں نہیں جائیں گے۔"

رومی نے کہا، "قریب ہی ایلیفنٹ روڈ پر عزیز ماموں کا پولی کلینک ہے۔ وہاں پر لے جانے سے بھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

۲۴ اگست ۱۹۷۱ء بروز منگل

شب و روز نشے کے عالم میں گزرتے جا رہے ہیں۔ روٹین کچھ ایسی ہے کہ صبح اٹھ کر میں بہت سارا کھانا پکا کر فرج میں رکھ دیتی ہوں۔ رومی اکثر دوستوں کو ساتھ لے آتا ہے۔ کبھی کھاتے ہیں اور کبھی نہیں کھاتے، پھر بھی ہر وقت کھانے کا انتظام رکھتی ہوں، اگر آتے ہی کہہ بیٹھا ''بھوک لگی ہے، کھانا دو۔'' تو دیر نہ ہو۔ کبھی کبھی ایک آدھ رات گھر پر گزارتا ہے۔ تب ہماری خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہمارے بیڈ روم میں بڑے پلنگ پر سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ زیادہ تر وقت رومی ہی بات کرتا ہے ہم لوگ سنتے ہیں یا سوال کرتے ہیں۔

عالم، بدیع، سپن، قاضی، چلو، یہ لوگ بعد میں بھی ایک دو مرتبہ گھر پر آئے تھے، کبھی کھانا کھایا کبھی نہیں کھایا۔ وہ لوگ کھانا کھائیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کیونکہ کھانے کی میز پر تھوڑا سا وقت ان کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ جنگ آزادی، میلہ گھر، خالد مشرف، حیدر.... مختلف موضوعات پر دو چار باتیں سننے کو مل جاتی ہیں۔ خالد مشرف کو اتنے دن تک بانکا کے بھانجے ''مونی'' کے طور پر جانتی تھی، اب میلہ گھر کے ان گوریلوں کی زبانی اس کا تذکرہ سنتے سنتے اس کے بارے میں دل کے اندر ایک مختلف تاثر قائم ہونے لگا ہے۔ جس حیدر کو کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، اس کا بھی جیسے ایک چہرہ آنکھوں کے سامنے واضح ہونے لگا ہے۔ ایس ایس جی، یعنی پاکستانی فوج کا ''سپیشل سروسز گروپ'' یعنی کمانڈو گروپ کا کیپٹن جس نے پاکستان کے اٹک فورٹ سے ٹریننگ حاصل کی تھی اور جسے جرنیل مٹھا خان کے ہاتھوں تیار شدہ کمانڈو سمجھا جاتا تھا وہی جیالا حیدر ان لڑکوں کو تربیت دیتا ہے۔ ان کی زبان سے سن سن کر یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ بھی میرا جانا پہچانا کوئی قریبی آدمی ہے۔

اپنے سے لگنے لگے ہیں ڈاکٹر ظفر اللہ چودھری، ڈاکٹر ایم اے مبین۔ ان دونوں نے انگلینڈ سے ایف آر سی ایس مکمل کیا ہے۔ ڈھاکہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد ولایت جا کر چار سال تک جان توڑ محنت کر کے ایف آر سی ایس کی تیاری کر چکے تھے۔ امتحان شروع ہونے میں ابھی صرف ایک ہفتہ باقی تھا کہ بنگلہ دیش میں جنگ آزادی چھڑ گئی۔ دونوں لڑکوں نے بنگلہ دیش کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے امتحان چھوڑ دیا۔ پاکستان کی شہریت ترک کر کے بھارتی ٹریول پرمٹ حاصل کر کے دلی جانے والے ہوائی جہاز پر سوار ہو گئے۔ مقصد تھا وہاں سے کلکتہ ہوتے ہوئے محاذ پر پہنچنا۔ جہاز کے اندر سے گرفتار کرنے کا اختیار نہیں ہوتا

ہے کیونکہ جہاز انٹرنیشنل زون کی حیثیت رکھتا ہے۔ دمشق میں سیرئین ایئرپورٹ کے عہدیداروں نے انہیں بتایا تھا کہ ان کی وجہ سے ہی طیارہ پانچ گھنٹے لیٹ ہوا ہے۔ اس طرح مصائب سے پنجہ لڑاتے ہوئے بالآخر دونوں اپریل کے آخری دنوں میں سیکٹر ٹو کے محاذ تک جا پہنچے۔

واقفیت سی ہوگئی ہے ڈاکٹر ناظم سے بھی۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ایم بی بی ایس پاس کر کے میمن سنگھ میڈیکل کالج میں ان سروس ٹریننگ پر تھا۔ ۲۱ اپریل تک میمن سنگھ آزاد تھا۔ اس کے بعد پاکستانیوں نے جب شہر پر قبضہ کر لیا، ڈاکٹر ناظم فرار ہو کر بڑی مشکل سے کبھی پیدل، کبھی کشتی پر سوار ہو کر، کبھی ٹرک پر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے مئی کے اوائل میں بارڈر کے اس پار جا پہنچا۔ پوچھ پاچھ کر اگرتلہ ہوتے ہوئے متی نگر چلا گیا۔ وہاں پر بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس نے اسے گرفتار کر لیا۔ ان دنوں کوئی صحیح طور سے ریفرنس نہ دے سکے تو بارڈر سیکورٹی فورس والے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ شہادت کا چھوٹا بھائی فاتح بھی پہلے متی نگر جا کر بی ایس ایف والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے محلے کے واقف کار ڈاکٹر اختر احمد کا نام بتایا تھا جس کے بعد کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ناظم نے بھی اگرتلہ کے ایک واقف کار کا حوالہ دے کر چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے بعد سونا موڑا کے ہسپتال میں ذمہ داری سنبھال لی۔ سب سے ڈرامائی واقعہ یہ ہے کہ پانچ مئی کو ناظم متی نگر گیا اور چند روز کے اندر گیارہ مئی کو پاکستانی فوجیوں نے بی بی بازار پر حملہ کر کے قبضہ حاصل کر لیا۔ مشرقی بنگال کی سرحدی حدود کے اندر یہ بی او پی اتنے عرصے تک مکتی باہنی کے قبضے میں تھا۔ بی بی بازار کی لڑائی میں مکتی باہنی کے بہت سے جوان زخمی ہوئے تھے۔ سری منت پور بی او پی بھارتی سرحد کے اندر تقریباً بی بی بازار کے روبرو ہے۔ پاکستانیوں کے چھوڑے ہوئے شیل سری منت پور میں بھی گرتے تھے۔ ڈاکٹر اختر احمد اپنا ایک بیڈ کا کیمپ، ہسپتال میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ وہاں پر مریضوں کو رکھنا بالکل بھی محفوظ نہیں تھا لہٰذا لڑائی میں زخمی، مکتی فوجیوں کو پہلے سونا موڑا کے بھارتی ہسپتال میں بھیجا جاتا رہا۔ انہی دنوں خالد مشرف نے ڈاکٹر ناظم کو سونا موڑا میں بھیجا۔ وہاں پر فارسٹ ڈاک بنگلہ مکتی فوجوں کے علاج کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر ناظم وہاں پر زخمیوں کے علاج میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں اختر بھی سری منت پور سے آ پہنچے۔

ڈالیا صلاح الدین ڈھاکہ میں ایم بی بی ایس کی طالبہ تھی۔ بافا کے ڈانس سکول میں ناچ سیکھتی تھی۔ اچھا ناچتی تھی لہٰذا پسند بھی بہت کی جاتی تھی۔ وہی ڈالیا اور اس کا ہونے والا میاں شمس الدین فی الحال سیکٹر ٹو کے ہسپتال میں ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ شمس الدین بھی ڈھاکہ میڈیکل کالج میں آخری سال کا طالب علم تھا۔

آنکھوں کے سامنے کھل اٹھتا ہے طیب علی کا چہرہ۔ اس کو کبھی نہیں دیکھا مگر رومی کی زبانی تذکرہ سن کر یوں لگتا ہے کہ طیب علی سامنے آ کھڑا ہو تو فوراً پہچان لوں گی۔ ڈھاکہ کی آخری حدود مدر ٹیک کا رہنے والا ہے۔ چھٹی ساتویں جماعت تک پڑھائی کی ہے۔ کریک ڈاؤن سے پہلے آم، کیلے، لیچیاں بیچ کر پیٹ پالتا تھا مگر سینے کے اندر تھی ملک سے بے انتہا محبت۔ مارچ کو تحریک میں کود پڑا تھا۔ کریک ڈاؤن کے بعد سیکٹر ٹو جا پہنچا۔ طیب میں حیران کن جرأت اور ہوشیاری موجود ہے۔ اس کی صاف گوئی کی وجہ سے میلہ گھر میں اسے زیادہ پسند نہیں کیا جاتا مگر اسی

خاصیت کی وجہ سے رومی اسے خاص نظروں سے دیکھتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی رومی کو بہت پسند کرنے لگا۔ کیمپ میں دوسرے لڑکوں کی بات کی طیب علی اتنی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس سے کوئی کام کروانا ہو تو لڑکے آ کر رومی کو پکڑتے تھے۔ رومی کہے تو طیب علی احتجاج کئے بغیر کوئی بھی کام کر دیا کرتا تھا۔ طیب اپنی جرأت اور خلوص کی وجہ سے بہت جلد سیکٹر ٹو میں شہرت حاصل کر گیا تھا۔

طیب علی اس وقت پیر ولیا کے کیمپ میں رومی لوگوں کے گروہ کے ساتھ ہی موجود ہے۔ وہاں پر وہ صبح کا ناشتہ تیار کر کے رومی لوگوں کو کھلاتا ہے۔ دوپہر کے وقت رات کے لئے پکا کر رکھتا ہے۔ پورے دن کے بعد رومی لوگ جب تھک ہار کر لوٹتے ہیں تو انہیں کھانا کھلا کر انکے لیٹنے کا انتظام کر دیتا ہے۔

رومی کے دوست کھانے پر آئیں تو عام طور پر ان سے میلہ گھر کے بارے میں سوال کرتی ہوں۔ آج ہمت کر کے ڈھاکہ کے بارے میں پوچھ لیا تاہم بات گھما پھرا کر کی۔ چند روز پہلے گرین روڈ پر ایک جرأت مندانہ کارروائی کی گئی۔ کچھ بچھوؤں نے ملٹری کے ٹرک پر موجود پاکستانی فوجیوں پر حملہ کر دیا۔ فوج نے جوابی گولی چلانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ بھاگ گئی۔ اسی بات کا سرا پکڑ کر میں نے کہا، واقعی ہمت ہے ان بچھوؤں میں اور آوازیں جو آئی تھیں.... پورا محلہ ہل گیا تھا۔ میری امی دھان منڈی چھ نمبر میں رہتی ہیں انہوں نے بھی آواز سنی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ آج کل ہم دن رات اتنی آوازیں سنتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگ اتنی آوازیں کیسے پیدا کر لیتے ہو۔ ویسے مزے کی بات بتاؤں آج کل وہ آوازیں سنائی نہ دیں تو ہمیں نیند ہی نہیں آتی۔"

عالم بے چارہ بولتا کم ہے (شائد میرے سامنے) اس نے کافی توقف کے بعد گمبھیر لہجے میں آہستہ سے کہا، "آپ لوگ اپنی نیند کے لئے ان آوازوں کو ضروری سمجھ رہی ہیں لیکن ڈھاکہ کے لوگوں کو سلانے کی خواہش یا مقصد ہمارا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد ہے پاک فوجیوں کے دن کا آرام، رات کی نیند حرام کرنا۔ ان کو ہر وقت بھوت دکھانا۔ خالد مشرف اسی لائحہ عمل کو نفسیاتی جنگ کہتے ہیں۔

میں نے ٹیڑھی نظروں سے رومی کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ گھما کر چلو کے ساتھ کوئی بات کر رہا تھا۔ میں آواز مدہم کر کے سوال کر بیٹھی، "بتاؤ نا تم لوگ کس طرح سے یہ سب کچھ کرتے ہو؟"

عالم نے کہا، "یہ چھوٹے موٹے ایکشن ہیں۔ ان میں کوئی تسلسل یا پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ جسے موقع ملے چلتے پھرتے کارروائی کر دیتا ہے۔ مختلف ہتھیاروں سے یہ کارروائیاں کی جاتی ہیں مگر سب سے موزوں ہتھیار ہے "اینٹی پرسنل مائن۔" یہ بہت چھوٹے سائز کا ایکسپلوسیو ہے، پتلون کی جیب میں یا گاڑی کے "گلاوز کمپارٹمنٹ" میں آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے۔"

بات کرتے کرتے عالم نے دیوار کے ساتھ کپ پلیٹ وغیرہ رکھنے کی چھوٹی سی الماری کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کہا، "وہ کس چیز کی ڈبیہ ہے؟"

اس طرف نظر ڈال کر دیکھا الماری کے اوپر گلاس، دوائی کی شیشی وغیرہ کے پاس ایک ننھی سی ڈبیہ پڑی تھی۔ میں نے کہا، "وہ اورینٹیل بام" کے نام سے ایک مرہم کی ڈبیہ ہے۔ ماتھے پر لگانے سے سر کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

عالم نے ہنس کر کہا، ''ٹن کی اس ڈبیہ سے ذرا سا بڑا ہوتا ہے یہ منی مائن۔ کہہ سکتی ہیں ڈبل اور ٹینیل بام، موقعے کے مطابق بچھواس مائن کو گاڑی کے پہیئے کے نیچے لگا دیتے ہیں۔ جس راستے پر سے ملٹری کی کسی ٹولی کے جانے کا معلوم ہو جائے تو پہلے سے جا کر سڑک پر لگا آتے ہیں۔ جیپ یا ٹرک کا پہیہ مائن کے اوپر سے گزر جائے تو خوفناک آواز کے ساتھ پہیہ پھٹ جاتا ہے۔ عام طور پر گاڑی بھی الٹ جاتی ہے۔''

جامی نے ہنس کر کہا، ''اس اور ٹینیل بام سے پاک فوجیوں کے سر کا درد کم نہیں ہوتا، بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔''

۲۵ اگست ۱۹۷۱ء بروز بدھ

رومی نے کہا، ''امی مجھے ذرا ۲۸ نمبر روڈ پر اتار آئیں گی؟''

ساڑھے چھ بجنے والے ہیں۔ مغرب کی طرف سورج سرخی مائل ہو چکا ہے۔ جاتے جاتے میں نے سوال کیا، ''کب لوٹو گے؟ لینے کے لئے آؤں؟ رومی نے بے دھیانی میں جواب دیا، ''کب لوٹوں گا؟ پتا نہیں، ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا۔ خیر، آدھے گھنٹے کے بعد بے شک ایک مرتبہ چکر لگا لینا۔''

رومی ذرا پریشان نظر آ رہا ہے۔ کل دوپہر کے کھانے کے بعد نکلا تھا، آج سہ پہر کے پانچ بجے کے قریب لوٹا ہے۔ کسی دبے ہوئے اضطراب میں بے چین ہو رہا ہے۔ چہرہ، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اندر ہی اندر کچھ بیت رہی ہے، اس کو چھپانے میں اسے تکلیف ہو رہی ہے مگر اس بارے میں کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دھان منڈی ۲۸ نمبر روڈ کے جس مکان میں ان کا ڈیرا ہے اس کی مالک دلآرا ہاشم ہے۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کراچی میں رہتی ہے۔ مکان ''رائکر لیبارٹریز'' کو کرائے پر دیا ہوا ہے، چلو، یعنی مسعود صادق اس کمپنی کا فیلڈ مینجر ہے۔ وہ مکان رائکر لیبارٹریز کا دفتر ہے چنانچہ دفتر بند ہونے کے بعد چوکیدار اور نائٹ گارڈ کے علاوہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔

رومی کو اتار کر فوراً گھر چلی آئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے لے کر جانے کے لئے کہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شائد رات کو وہ گھر پر ہی رہے گا لہٰذا آج کچھ سپیشل کھانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ رومی کھانوں کا شوقین ہے۔ ڈھاکہ کلب میں چلی گئی۔ سموکٹ ہلسا اور چکن کریمب چوپ کی چند پلیٹیں پیک کروالیں۔ اتنے میں آدھا گھنٹہ گزر گیا لہٰذا دوبارہ چلی گئی ۲۸ نمبر روڈ پر۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر دیکھا ایک فیصٹ ۶۰۰ نکل رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ گاڑی میرے برابر آ کر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر رومی کا دوست حارث بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھی رکی مگر انجن بند کئے بغیر ہی سوال کیا، ''رومی اندر ہے؟'' حارث نے گاڑی کے اندر سے جواب دیا ''نہیں چچی، رومی تو پانچ منٹ ہوئے ہیں نکل گیا۔'' میں ایک لمحہ خاموش رہی، پھر کہا، ''اوہ اچھا بیسٹ آف لک۔''

گھر لوٹ آئی۔ اب سارا مسئلہ ہی غیر یقینی ہو گیا۔ رومی گھر پر لوٹے گا یا نہیں، کھانا کھائے گا یا نہیں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا پھر بھی کھانا ترتیب سے رکھ کر سوچا فرج میں قیمہ پکا ہوا رکھا ہے۔ چند ایک مغلئی پراٹھے بنا لیتی ہوں۔ رومی کو بہت پسند ہیں۔ آج نہ بھی آیا تو کل کھا لے گا۔

آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا ہوگا دروازے پر بار بار گھنٹی بجنے لگی۔ بٹن دبا کر انگلی ہٹاتا ہی نہیں تھا۔ شریف اور جامی اوپر بابا کے پاس بیٹھے تھے۔ میں باورچی خانے سے دوڑ کر گئی، دروازہ کھولنے کے لئے۔ دروازہ کھولتے ہی تیزی سے اندر داخل ہوئے رومی، قاضی اور ایک نیا کمسن لڑکا۔ میں حیران رہ گئی، چہرے کی طرف دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔ تینوں کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ ہونٹ دبا کر پرسکون ہوئے لیکن میں سمجھ گئی کہ اندر سے خوشی اور ہنسی کے مارے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ رومی نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر کے چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا، ''امی اوپر چلو، بات کرنی ہے۔''

دوسری منزل پر رومی کے کمرے میں سب لوگ داخل ہوئے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے شریف اور جامی۔ میرے ہاتھ کے اشارے پر وہ بھی اٹھ آئے۔ رومی نے خوشی اور ولولہ دبا کر سرگوشی میں کہا، ''امی، ابو، ہم لوگ ایک ایکشن کر کے آئے ہیں ابھی ابھی۔ سات آٹھ خان سپاہی مار آئے ہیں۔''

میرا منہ کھلا رہ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

پرمسرت لہجے میں قاضی نے کہا، ''ہاں چچی، ۱۸ نمبر روڈ پر۔ وہاں پر ایک مکان کے سامنے ہم سب گاڑی پر سے گولی چلا کر خان سپاہی مار کر پانچ نمبر روڈ سے آ رہے تھے۔ ملٹری جیپ نے پیچھا کرنا شروع کیا۔ رومی نے صورتحال دیکھ کر گاڑی کا پچھلا شیشہ توڑ کر گولی چلانا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ بدیع اور سپن بھی گولیاں چلا رہے تھے جیپ الٹ گئی اور تمام کے تمام ہلاک ہو گئے ہیں۔''

رومی نے کہا ''امی دیکھو میرے کندھے پر شین گن کی چنگاریاں لگنے سے کس قدر چھالے پڑ گئے ہیں۔ راستے میں ملٹری پکڑ لیتی تو ان چھالوں کی وجہ سے پھنس جاتا۔''

رومی کی قمیض کا کالر ہٹا کر دیکھا، گردن اور کندھے پر بہت سے چھوٹے چھوٹے سیاہ چھالے پڑ گئے تھے۔ قمیض میں بھی سوراخ ہو گئے تھے۔ سوال کیا، ''یہ کیسے ہوا؟'' رومی نے کہا، شین گن فائر کرتے وقت آگ کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ میرے دونوں طرف سے بدیع بھائی اور سپن بھائی فائرنگ کر رہے تھے لہٰذا چنگاریاں میرے جسم پر لگتی رہیں۔'' اس کے بعد ہنس کر کہنے لگا، ''اف کان کے پردے پھٹ گئے ہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا۔''

روئی پر ڈیٹول لگا کر چھالوں والی جگہ صاف کرتے ہوئے میں نے کہا، اتنی سی دیر میں معرکہ مار دیا۔ کیسے ممکن ہوا؟''

''بتاؤں گا بعد میں۔ ساتھ کی گلی میں ایک مکان کے اندر اسلحہ چھوڑ آئے ہیں۔ فوراً لانا پڑے گا۔ تمہیں جانا ہوگا گاڑی لے کر۔ امید ہے کہ خاتون ڈرائیور دیکھ کر وہ لوگ گاڑی نہیں روکیں گے۔ میں جاؤں گا تمہارے ساتھ قاضی بھائی، سلیم تم لوگ چھت کے کمرے میں جا کر لیٹو۔ ہم لوگ اسلحہ لے کر آتے ہیں۔ امی دو عدد بوریاں لے لو۔ ابو ہمارے جانے کے بعد پورچ کی بتی بجھا کر رکھنا۔ اگر مہمان آئیں تو جلا دینا۔ پورچ میں بتی جلتی ہوئی دیکھ کر ہم لوگ اندر نہیں آئیں گے۔''

نیچے اتر کر باورچی خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا، ''بارق چاول اور دال چڑھا دو۔'' سٹور روم سے دو بوریاں نکال لائی۔

گاڑی بیک کر کے سڑک پر اتر آئی۔ رومی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا۔ ساتھ والی گلی قریب ہی ہے، مین روڈ پر آ کر دو مکانوں کے بعد ہی۔ گلی میں داخل ہوتے وقت رومی نے سرگوشی میں کہا ''گلی کے آخری سرے تک چلی جاؤ۔ یہ گلی بھی ہماری گلی کی طرح ایک طرف سے بند ہے۔''

میں نے بھی سرگوشی میں کہا، ''آخری سرے پر توحیٰ صاحب کا مکان ہے۔ اس مکان میں.....؟''

''نہیں۔ گلی میں داخل ہو کر دو مکانوں کے بعد والا مکان لیکن پہلے گاڑی آخری سرے تک لے جا کر دیکھوں گا کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔''

گلی کا آخری مکان انجینئر حیٰ صاحب کا ہے۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ گاڑی اندر لے گئی۔ حیٰ صاحب دوسری منزل پر رہتے ہیں۔ نچلی منزل کرائے پر دی ہوئی ہے۔ پورچ زیادہ کشادہ نہیں ہے۔ گاڑی نکالنا ہو تو بیک کر کے سڑک پر اترنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ گاڑی سے جتنا ممکن تھا آواز کئے بغیر اتر گئے۔ نچلی منزل کے سامنے والے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کمرہ اندر سے روشن تھا۔ پلنگ پر بیٹھے چار افراد تاش کھیل رہے تھے۔ قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ کر تین چار عورتیں اور مرد بات چیت کر رہے تھے۔ تمام لوگ کھیلنے اور گپ شپ میں اس قدر مصروف تھے کہ صرف چار فٹ کے فاصلے پر آ کر رکنے والی گاڑی پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہم لوگ گاڑی سے اتر کر گیٹ پر کھڑے ہو گئے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ رومی نے کہا تم یہیں پر رکو میں جا کر دیکھ آتا ہوں اس مکان کے باہر کوئی ہے یا نہیں۔''

میں بارش سے بچنے کے لئے نچلی منزل کی کھڑکی کے چھجے کے نیچے دیوار کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ دوبارہ بے چین ہو کر گیٹ کے پاس آئی۔ ہوا سے پردہ اڑ رہا تھا۔ اندر بلب کی روشنی میں سات آٹھ مرد اور عورتیں تاش کھیل رہے تھے، بات چیت کر رہے تھے، کبھی کوئی زور سے قہقہہ لگا دیتا.... میں ڈر رہی تھی کہ کوئی کھڑکی سے باہر جھانک کر کون! کون! کہہ کر نہ چیخ اٹھے مگر کسی نے ایک مرتبہ بھولے سے بھی کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ مجھے تسکین بھی ہو رہی ہے اور حیرت بھی۔ جیسے حالات ہیں ان میں کوئی اس قدر مطمئن کیسے ہے، نچلی منزل کی کھڑکی کے باہر گاڑی آ کر رک رہی ہے، لوگ اتر رہے ہیں، خفیہ انداز میں چل پھر رہے ہیں مگر وہ لوگ بالکل بھی خیال نہیں کر رہے۔ حیرت ہی کی بات ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں صدیوں سے یہاں پر کھڑی ہوں اور کمرے کے اندر وہ چند افراد اسی طرح صدیوں سے قہقہوں، گپ شپ اور کھیل میں مصروف ہیں۔

رومی نے واپس آ کر سرگوشی کی، ''چلو۔ آہستہ چلانا۔''

گاڑی بیک کر کے دوبارہ گلی میں اتر آئی۔ مخصوص مکان کے سامنے آ کر رومی نے رکنے کے لئے کہا۔ میں گیٹ کے قریب گاڑی روک کر اندر ہی بیٹھی رہی۔ رومی دونوں بوریاں لے کر اندر چلا گیا۔ اس کے واپس آتے ہی میں نے اتر کر پیچھے کی ڈگی کھول دی۔ اس گلی سے ساتھ والی گلی تک کتنا فاصلہ ہو گا؟ ایک میل کا پاؤ حصہ؟ اتنا بھی

نہ ہوشائد۔ مگر دل میں ایسی دھڑکن، ہاتھ پیر اتنے بھاری ہو گئے کہ یوں لگ رہا ہے جیسے پچاس میل کا راستہ طے کر کے آئی ہوں۔

پورچ کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ شریف اور جامی شائد دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔ گاڑی رکتے ہی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ رومی نے ڈگی کھولی۔ ساتھ ہی گیٹ سے کوئی اندر داخل ہوا ہم لوگ چونک گئے لیکن نہیں، باہر کا کوئی نہیں ہے، معصوم آیا ہے۔ شریف اور جامی فوراً دونوں بوریاں اٹھا کر اندر چلے گئے۔

سیڑھیاں چڑھ کر سیدھے چھت والے کمرے میں۔ اب جا کر میرے ہاتھ اور پیروں میں زور واپس آیا۔ سینے میں اب گھبراہٹ کی بجائے بے تاب جذبوں کی لہر ابلنے لگی۔ میں نے کہا ذرا نکالو تو دیکھیں کیسا اسلحہ ہے۔" رومی اور قاضی نے بوری کھول کر احتیاط کے ساتھ اسلحہ نکال کر گدے پر رکھا۔ پانچ عدد سٹین گنیں، ایک پستول، دو ہینڈ گرینیڈ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ یہ چیزیں دیکھیں۔ شریف، جامی، معصوم اور میں، چاروں بھوکوں کی طرح اسلحہ ہاتھ میں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے، ان کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا، دونوں ہینڈ گرینیڈ بھی چھو کر دیکھے۔ رومی لوگ ان کو پائن ایپل کہتے ہیں... انناس... جتنا بھی انناس کہتے رہیں، یہ پھٹ جائے تو ایک لمحہ گزرنے سے پہلے ہی ستیاناس ہو سکتا ہے۔

میں سوال کرنے جا رہی تھی، "بتاؤ تو سہی کس طرح سے کیا کیا؟" لیکن شریف نے روک دیا، "وہ سب بعد میں سنا جائے گا پہلے بتاؤ اس اسلحہ کو کہاں پر چھپایا جائے؟"

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد طے کیا گیا کہ صحن میں جو بڑا سا حوض ہے اس کے اندر ایک سٹول رکھ کر اس پر اسلحہ رکھا جائے۔ حوض چوڑائی میں آٹھ فٹ ہے۔ دس فٹ لمبا اور تین فٹ اونچا ہے۔ اس کے سرے کے ایک کونے میں ایک گول مین ہول ہے جس کے اوپر لوہے کا ڈھکن لگا ہوا ہے۔ مین ہول سے حوض کے اندر اترا جا سکتا ہے۔ حوض اس وقت پانی سے لبریز ہے۔ ہماری پینٹری میں دو تین سٹول پڑے تھے جن کی اونچائی دو فٹ تھی۔ حوض کے نیچے کا نلکا کھول دیا گیا تا کہ تھوڑا سا پانی نکل جائے۔ اندر سٹول رکھنے سے اس کا اوپر والا حصہ پانی سے اوپر رہے۔ بارق کو سودا خریدنے کے لئے رشید کی دکان پر بھیج دیا۔ جامی نے حوض کے اندر اتر کر سٹول کو حوض کے آخری کونے میں رکھ دیا۔ اسلحہ بوریوں میں ڈال کر ان کا منہ رسی سے اچھی طرح باندھا گیا اور پھر ان بوریوں کو سٹول کے اوپر رکھا گیا۔ رات کو اگر بلٹری آ بھی جائے اور پانی سے بھرے حوض کا ڈھکنا کھول کر اندر جھانکے تو بھی شفاف پانی کے علاوہ کچھ نہیں نظر آئے گا کیونکہ یہاں سے جھانکنے پر دور کے کونے میں رکھا ہوا سٹول نظر نہیں آتا۔ سٹول دیکھنے کیلئے حوض کے اندر اترنا ہوگا۔

تھوڑی دیر کے بعد قاضی اور سلیم چلے گئے۔ سلیم کو پہلی بار دیکھا۔ سنا کہ وہ شاہین سکول کا طالب علم ہے۔ اس سال میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اپریل میں میلہ گھر چلا گیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم چاروں رومی کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ان کے سنسنی خیز ایکشن کے بارے میں سننے کے لئے ہم بے تاب تھے۔ رومی نے جو کچھ بتایا وہ یوں ہے۔

دھان منڈی بیس نمبر روڈ پر ایک مکان میں چینی سفارت خانے کے ایک بڑے افسر رہتے ہیں۔اس مکان کے سامنے کئی پاکستانی ملٹری پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔اٹھارہ نمبر روڈ کے ایک مکان کے سامنے بھی سات آٹھ ملٹری پولیس مین کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔اندازہ ہے کہ اس مکان میں کوئی بریگیڈیئر صاحب رہتے ہیں۔کئی روز سے بدیع اور عالم کے ذہن میں یہ سوچ گھوم رہی تھی۔کل اچانک بدیع، عالم، شہادت نے حکمت عملی طے کرلی۔۲۵ اگست رات کے پہلے پہر میں چند ایک ایکشن ہوں گے، بدیع، عالم، قاضی، رومی لوگ ایک گاڑی پر اور حارث، مختار، ضیاء لوگ ایک دوسری گاڑی پر۔پانچ ماہ قبل اس پچیس تاریخ کی رات کو ہی بے ضمیر حملہ آور فوج اچانک بنگالی قوم پر ٹوٹ پڑی تھی۔بچھوؤں نے فیصلہ کیا کہ اس تاریخ کو کوئی ایسا ایکشن کرنا چاہئے کہ فوجی جنتا کو اچھی طرح خبر ہو جائے۔

رومی لوگ پیر ولیا میں اپنے کیمپ سے حسب ضرورت اسلحہ آج ہی دوپہر کو لے کر آئے تھے۔حارث اور ظہیر دو مختلف گاڑیوں پر گلشن لیگ کی گھاٹ سے انہیں اٹھا کر ۲۸ نمبر روڈ کے مکان میں لے گئے۔اس کے بعد بدیع، عالم ایک طرف، حارث، مختار دوسری طرف، دونوں گروہ دو مختلف اطراف میں نکل گئے، دو گاڑیاں ہائی جیک کرنے کے لئے۔بدیع اور عالم نے دھان منڈی چار نمبر روڈ سے ایک مزدا گاڑی ہائی جیک کی۔گاڑی تھی ابوالمعصور صاحب کے بڑے صاحبزادے محبوب انم کی۔حارث لوگوں نے ایک فلیٹ ۶۰۰ ہائی جیک کی، دھان منڈی ۲۲ نمبر روڈ کے چوک سے۔طے پایا کہ عالم، بدیع، قاضی، رومی، سپن اور سلیم پہلے دھان منڈی میں ایکشن کریں گے۔

رومی لوگ جس وقت نکلے شہادت نے سوال کیا، ''واٹ از یور ٹارگیٹ؟ کس طرف کو نکل رہے ہو؟''

عالم نے جواب دیا، ڈسٹی نیشن....ان نون، ٹارگٹ....موبائل۔''

رومی لوگ شام کے سات بج کر پچیس منٹ پر ۲۸ نمبر روڈ سے نکل کر ۳۲ نمبر سے پل پار کر کے دائیں طرف مڑتے ہوئے ۲۰ نمبر روڈ پر اتر آئے۔عالم گاڑی چلا رہا تھا۔اس کے بائیں طرف پہلے سلیم اور پھر قاضی بیٹھا ہوا تھا۔پچھلی سیٹ پر درمیان میں رومی اس کے دائیں طرف (یعنی عالم کے پیچھے) سپن اور بائیں طرف بدیع بیٹھے ہوئے تھے۔چینی سفارت کار کے مکان کے سامنے جا کر دیکھا کہ پولیس والے موجود نہیں ہیں۔وہ لوگ مایوس ہوئے۔عالم نے کہا اب پھر ۱۸ نمبر پر چلتے ہیں۔۱۸ نمبر روڈ پر مخصوص مکان کے سامنے پہنچ کر دیکھا سات آٹھ ملٹری پولیس کے آدمی مزے سے گپ شپ میں مصروف، سگریٹیں پھونک رہے ہیں۔

عالم نے کہا، ''بریگیڈیئر صاحب یقیناً گھر پر موجود نہیں ہیں اسی لئے بہت مزے میں گپ شپ ہو رہی ہے۔آل رائٹ بوائز یو ہیو تھری منٹس۔میں سامنے کی سات مسجد روڈ پر سے گاڑی گھما کر لاتا ہوں۔

ابھی مکان ان کے دائیں طرف کو تھا، گاڑی گھما کر لانے سے مکان ان کے بائیں طرف آجاتا پھر گاڑی کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے قاضی اور بدیع سامنے اور پیچھے کی دونوں کھڑکیوں سے فائر کر سکیں گے۔گاڑی گھما کر لاتے ہوئے عالم نے ہدایت دی ''قاضی، سلیم اور بدیع گولی چلائیں گے۔رومی اور سپن نظر رکھیں گے کہ اس طرف سے کوئی اسلحہ اٹھا رہا ہے کہ نہیں۔اگر کوئی اسلحہ اٹھائے تو اسے ختم کرنے کی ذمہ داری رومی اور سپن کی ہوگی۔''

گاڑی کم رفتار سے مکان کے سامنے سے گزری تو عالم نے سرگوشی میں کمانڈ کیا، ''فائر۔'' ساتھ ہی گاڑی کی دونوں کھڑکیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ دونوں سٹین گنوں سے دو سطحوں پر گولیاں نکلیں، بدیع کی سٹین سے ان کے پیٹ پر اور قاضی کی سٹین سے ان کے سینے پر۔ سلیم اور قاضی نے سامنے کی کھڑکی سے بائیں طرف جھک کر فائر کیا۔ پولیس والے تفریح میں تھے۔ کچھ سمجھنے سے پہلے ہی دھپا دھپ سات آٹھ تگڑے جسم زمیں بوس ہو گئے۔ سارا واقعہ پیش آنے میں وقت لگا صرف چھ سیکنڈ۔ یکا یک گاڑی نے گویا جیٹ کی رفتار پکڑ لی۔ گاڑی جلد ہی ۲۰ نمبر روڈ پر ان کے پہلے ٹارگٹ پر جا پہنچی لیکن ان کی قسمت خراب تھی۔ چینی سفارت کار کے مکان کے سامنے اب بھی کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ لیکن انتظار کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ایکشن خواہش کے مطابق نہیں ہوا۔ لیکن چارہ کیا ہے؟

اس کے بعد عالم دھان منڈی کے اندر مختلف سڑکوں پر سے گاڑی چلاتا ہوا سات نمبر روڈ سے ہوتے ہوئے میر پور روڈ پر آ نکلا۔ دائیں طرف مڑ کر نیو مارکیٹ کی سمت میں چلنے لگا۔ پانچ نمبر پر روڈ کے برابر آتے ہی انہوں نے غور کیا کہ سامنے قطار میں گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہاں پر چیک پوسٹ قائم ہو گئی ہے اور گاڑیوں کو چیک کیا جا رہا ہے، یعنی ۱۸ نمبر روڈ پر ایم پی مارنے کی خبر انہیں اتنی دیر میں مل گئی ہے۔

لمحہ بھر میں عالم نے فیصلہ کر لیا۔ سامنے کی سڑک پر رکاوٹ تھی، دو عدد ٹرک میر پور روڈ کا راستہ بند کئے کھڑے تھے۔ سڑک کے دائیں طرف ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ کا منہ بھی اسی سمت میں تھا جس سمت میں ان ٹرکوں کا منہ تھا۔ ایک اور جیپ سڑک کے بائیں طرف پٹرول پمپ کے عین سامنے نیو مارکیٹ کی طرف منہ کئے کھڑی تھی اور سڑک پر دو سپاہی ایل ایم جی اٹھائے ہوئے پوزیشن سنبھال کر لیٹے ہوئے تھے۔

عالم نے جیسا سوچ رکھا تھا، دو ایم پی والوں نے ہاتھ اٹھا کر چیخ کر گاڑی کو رکنے کے لئے کہا ہی تھا کہ اس نے ہیڈ لائیٹس آف کر کے دائیں طرف مڑنے کا اشارہ دے دیا۔ دائیں طرف ذرا سا مڑتے ہی دونوں ایم پی نے چیخ کر گالی نکالی۔ ایک نے غصے میں کہا، ''کدھر جاتے ہو؟'' عالم نے تیزی سے بائیں طرف کو گاڑی موڑ لی۔ بدیع اور رومی ایک ساتھ چیخ اٹھے، ''وہ..... ایل ایم جی لے کر زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔'' ''فائر!'' عالم بھی چیخ اٹھا۔ ''فائر!'' ٹھا ٹھا ٹھا ٹھا سین اور بدیع کی آٹومیٹک گن سے گولیاں نکلنے لگیں۔ رومی سٹین ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے سیٹ پر گھٹنے ٹیک کر پیچھے کی طرف والے شیشے سے ادھر ادھر نظر گھما کر بغور جائزہ لیتا رہا لیکن اس طرف سے کسی نے ایک بھی گولی نہیں چلائی۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین پر لیٹے ہوئے دونوں آدمیوں کا کام تمام ہو گیا ہے۔ تیزی سے پیش آنے والے واقعہ نے دوسروں کو بھی ہکا بکا کر دیا تھا۔ انہی چند سیکنڈ کے اندر عالم گاڑی پانچ نمبر روڈ پر لے آیا۔ یہ روڈ تھوڑی دور جا کر ہی گرین روڈ سے مل گئی ہے۔ تقریباً گرین روڈ تک گاڑی پہنچ گئی اتنے میں رومی نے غور کیا کہ ملٹری کی ایک جیپ ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ اتنی دیر تک پیچھے کی سیٹ پر گھٹنوں کے بل الٹا بیٹھ کر شیشے سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چیخ اٹھا، ''دیکھو! دیکھو! ایک جیپ ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔'' ساتھ ہی وہ اپنی سٹین گن کے بٹ سے گاڑی کا شیشہ توڑ کر جیپ پر گولیاں برسانے لگا۔ رومی کی دونوں طرف سے بدیع

اور سپن نے بھی فائر کرنا شروع کر دیا۔ کتنے افراد مرے اس کا اندازہ اگر چہ نہیں لگایا جا سکا تاہم یہ بات واضح تھی کہ جیپ کا ڈرائیور پہلی ہی گولی سے ختم ہو چکا تھا کیونکہ برسٹ فائر شروع ہوتے ہی جیپ قابو سے باہر نکل کر چوک پر ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی۔ اسی لمحے عالم نے ایک اور فیصلہ کیا۔ بائیں طرف کا اشارہ جلا کر گرین روڈ کی طرف گاڑی تھوڑی سی گھما کر تیزی سے دوبارہ دائیں طرف مڑ کر دوبارہ نیو مارکیٹ کی سمت میں گھوم گیا اور طوفان کی رفتار سے اسی پٹرول پمپ کے دوسری طرف سے نیو ایلیفنٹ روڈ کی طرف گاڑی بھگائی۔ عالم کے علاوہ باقی سب نے پیچھے کی طرف مڑ کر غور کیا کہ عالم نے جیسا سوچا تھا ٹھیک ویسا ہی ہوا ہے، دونوں ٹرک اور دوسری جیپیں تیزی سے گرین روڈ کی طرف جا رہی تھیں، بچھو گاڑی کو پکڑنے کے لئے!

اتنی دیر کے بعد اب جا کر گاڑی کے اندر سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور زوردار قہقہہ لگایا۔ نیو ایلیفنٹ روڈ پر داخل ہونے کے بعد ہی عالم نے دوبارہ ہیڈ لائیٹ جلائی۔

اب وہ لوگ سوچنے لگے کہ اسلحہ کہاں پر چھپایا جائے۔ گاڑی بھی جلد از جلد ڈمپ کر دینا ضروری تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ ہماری گلی کے بعد والی گلی میں عالم کے جاننے والے ہیں۔ ان صاحب کے گھر پر اسلحہ رکھ کر رومی، قاضی اور سلیم کو مین روڈ پر اتار کر عالم، بدیع اور سپن گاڑی لے کر چلے گئے .... کسی موزوں جگہ پر گاڑی کو پھینک کر گھر جانے کے لئے۔

۲۷ اگست ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

کھانے کی میز کے گرد سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے، بدیع، عالم، قاضی، سپن، چلو، رومی، جامی اور معصوم۔ صرف شریف موجود نہیں تھے۔ ان کی آج ڈی سی جی آر میں لنچ کی دعوت تھی۔ میز پر پلاؤ، کباب، چوپ، روسٹ، قورمہ، بھجیا اور سلاد سجی ہوئی تھی۔ رومی کے اصرار پر آج اس کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تمام لوگ کھانا کھاتے ہوئے پرسوں کے ایکشن کا ہی تذکرہ کر رہے تھے۔ عالم لوگ اس گاڑی کو بھوتر گلی کے ایک مکان کے سامنے کھلے لان میں کھڑا کر آئے تھے۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر لوگ نہیں تھے لہٰذا انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ رکشے بھی نہیں تھے۔ خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے ہاتر پل بازار تک آنے کے بعد رکشہ ملا۔

عالم رومی سے کہہ رہا تھا۔ ''واہ! عین وقت پر تو نے شیشہ توڑ کر فائر کیا تھا ورنہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔''

رومی نے بھی فوراً جواب دیا، ''اور تو اگر عقل استعمال کر کے گرین روڈ کا اشارہ دے کر ایلیفنٹ روڈ کی طرف نہ نکل جاتا تو ہم ضرور پکڑے جاتے۔ تھینکس فار ٹیکنگ دا رائٹ ڈسیون آن دا رائٹ مومنٹ۔

(Thanks for taking the right decision on the right moment)

بدیع نے کہا، ''آنٹی ان دونوں بہادر لڑکوں کو اچھی طرح کھانا کھلایئے، ان ہی کی وجہ سے ہم جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔''

میں نے کہا، ''بہادر تم سب ہو۔ تمہارے رفلیکس پرفیکٹ ہیں۔ تمہارٹیم ورک بھی قابل تعریف ہے۔ تم سب لوگ زبردست ہو۔''

قاضی نے افسوس کر کے کہا، ''جویل بے چارہ بہت اداس ہے۔ وہ ہمارے اس ایکشن میں حصہ نہیں لے سکا۔ پہلے ایکشن میں ساتھ تھا، چلو آج اسے ملنے چلتے ہیں۔''

جویل عالم کے گھر پر اپنی بہنوں کی نگرانی میں ہے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد بھی بات چیت ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کی کوئل نے اپنی چھوٹی سی کٹیا کا دروازہ کھول کر چونچ نکالی اور چار مرتبہ کوکی۔

باہر یورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی تین چار لوگوں

کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ لوگ چونک کر اور گفتگو ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور پیر کی انگلیوں پر وزن ڈال کر خاموشی سے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر چلے گئے۔

جامی نے جا کر دروازہ کھولا۔ میں بھی اس کے پیچھے بیٹھک کی طرف گئی۔ شریف کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے دادا بھائی، مرتضٰی، فقیر۔ اندر آتے ہی مرتضٰی نے آنکھیں پھیلا کر کے کہا، ''سنا ہے بھابی کیا واقعہ پیش آیا؟ پرسوں رات ۱۸ نمبر روڈ پر بچھوؤں نے زبردست ایکشن کیا ہے۔ ایک بریگیڈئر کے مکان کے سامنے سے آٹھ دس ایم پی والوں کو مار کر چلے گئے۔ اس کے بعد پانچ نمبر روڈ کے چوک پر ایک اور خطرناک واقعہ پیش آیا۔ اسی رات بچھوؤں کے ایک اور گروہ نے جیپ پر گولیاں برسا کر اسے الٹ دیا، جیپ پر جتنے لوگ سوار تھے سب مارے گئے۔''

مجھے بھی حیرت کے اظہار کے لئے آنکھیں پھاڑنی پڑیں، ''واقعی؟ اتنے خوفناک واقعات ہو چکے ہیں؟ ان کا دل گردہ واقعی مضبوط ہے۔ پتہ نہیں کیسے اتنی خطرناک کارروائی کر لیتے ہیں۔ کون لوگ ہیں؟ کہاں پر رہتے ہیں یہ بچھو؟ کوئی پکڑا تو نہیں گیا؟''

''نہیں بھابی۔ کسی کو بھی پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ انسان ہیں یا جن کچھ سمجھ نہیں آتا؟ سنا ہے آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئے تھے، پورے شہر میں شور سا مچ گیا ہے۔''

شریف نے بہت مطمئن لہجے میں کہا، ''پورے شہر میں مسلسل ایسے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ وقت بے وقت محمد پور، گلستان، نواب پور.... سب جگہوں پر گاڑیاں ٹائر پھٹنے سے الٹ رہی ہیں۔ آج صبح دیکھا کرزن ہال کے کونے والے چوک پر جو بنگلہ اکیڈمی کی طرف ہے، آئلینڈ کے قریب ایک ڈبل ڈیکر الٹا پڑا ہے۔ بارہ چودہ بہاری، رضا کار، ملیشیا اس کو سیدھا کرنے میں پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔''

جامی نے آہستہ سے کہا، ''ڈبل اور ٹنکل بام۔''

فقیر حیران ہو کر بولے، ''کیا کہا بیٹے؟''

جامی نے کہا، کچھ نہیں انکل۔ سر میں درد ہوا تھا، اور ٹنکل بام لگایا تھا، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا درد بڑھ گیا ہے۔''

۲۸ اگست ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

۲۵ اگست کی رات کے ایکشن کی بات ختم ہی نہیں ہو رہی ہے۔ دراصل میں خود ہی ختم نہیں ہونے دے رہی۔ اس سے پہلے ڈھاکہ میں جتنے آپریشن اور ایکشن ہوئے ہیں ان سب کے بارے میں لوگوں کی زبانی تذکرہ سنا ہے۔ پہلی بار مجھے چشم دید گواہ، بلکہ خود کارروائی کرنے والوں سے براہ راست ان کے تجربے کے بارے میں سننے کا موقع ملا ہے۔

دوسری طرف ایک مشکل بھی پیش ہے۔ پہلے کی طرح عزیز رشتہ دار اور دوستوں کے ساتھ اس بارے میں گفتگو نہیں کر پا رہی ہوں یعنی صرف سنتی ہی جا رہی ہوں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر رہی، کیا معلوم کوئی شک کر بیٹھے! چنانچہ مرتضیٰ بھائی، بانکا، فقیر لوگ جب اس رات کے ایکشن کے بارے میں بہت سی اضافی بات شامل کر کے گفتگو کر رہے تھے تو اس وقت شریف، جامی اور میں بظاہر حیرت زدہ ہو کر خاموشی سے سنتے رہے تھے۔

آج حارث آیا ہے دوپہر کے کھانے کے وقت۔ رومی کا پرانا دوست ہے۔ ایک مشغلہ دونوں کا مشترک ہے، طبلہ بجانا۔ حارث کے والد حسیب صاحب بھی انجینئر ہیں، شریف سے چند سال سینئر ہیں۔

۲۵ تاریخ کی رات کو حارث لوگوں کا ایکشن کیسا رہا آج اس کی زبان سے تذکرہ سنا۔ اس رات کو حارث لوگ ہائی جیک کی ہوئی فلیٹ ۶۰۰ میں پانچ چھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ٹھس کے بیٹھے تھے۔ فلیٹ نے راجر باغ پولیس لائین کے چاروں طرف کئی مرتبہ چکر لگایا مگر عالم لوگوں کی گاڑی کا نام ونشان تک نہیں ملا۔ انہیں تو معلوم نہیں تھا کہ عالم لوگ کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی کا انجن گرم ہو گیا۔ پانی ڈالنا چاہئے تھا مگر پانی کہاں سے ملے؟ یہی سوچتے، شاہ جہان پور بازار کے قریب مختار کے ایک جاننے والے کی پان کی دکان پر جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے پانی مانگا۔ لڑکے بہت ٹھس کر بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ یہ لوگ بھی باہر نکلے ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے۔ سٹین گن اٹھائے گاڑی سے نکلتا دیکھ کر لمحہ بھر میں بازار سے لوگ غائب ہونے لگے۔ گاڑی میں پانی ڈال کر ان لوگوں نے دوبارہ راجر باغ پولیس لائین کے چاروں طرف کی سڑکوں پر دو تین چکر لگائے۔ بالآخر عالم لوگوں کا پتا نہ چلنے پر وہ لوگ کاکرائل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ عالم لوگ خود ہی کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ کاکرائل چوک پر چند بنگالی پولیس والوں نے انہیں "ہالٹ" کہہ کر روکا لیکن حارث لوگوں نے بنگالی پولیس والوں کو نہ مارنے کا فیصلہ پہلے ہی سے کیا ہوا تھا اسی لئے انہوں نے گولی نہیں چلائی۔ مزے کی بات یہ

ہے کہ بنگالی پولیس کے سپاہیوں نے بھی ''ارے باپ رے مکتی باہنی!'' کہہ کران کی طرف سے آنکھیں موڑلیں اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ حارث تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا ائیر پورٹ روڈ پر دارالکباب کی طرف چلا گیا۔ دارالکباب پر اکثر پاکستانی فوج کے افسر، تکے، کباب، تندوری روٹیاں وغیرہ کھانے کے لئے آتے ہیں۔ وہاں پہنچ کرانہوں نے دیکھا کہ آرمی کی ایک جیپ کھڑی ہے۔ ضیاء نے کہا کہ گاڑی سامنے والے یوٹرن سے گھما کرلاؤ، پھراس جیپ پرحملہ کر کے گ بازار کی طرف بھاگ لینا۔ حارث لوگوں کی قسمت خراب تھی ان کے یوٹرن لے کر واپس آنے تک جیپ چلی گئی تھی۔

رومی نے ہنس کر کہا، ''صرف عقل چلانے سے کام نہیں بنتا، لک بھی چاہئے ہوتی ہے، اگر خوش قسمتی ساتھ نہ دے تو لاکھ تربیت لی ہو بے کار ہے۔''

حارث نے کہا، ''درست ہے، ہم کسی کو مار تو نہیں سکے لیکن لک اتنی خراب بھی نہیں، دو نمبر روڈ پر واپس آتے ہوئے ملٹری چیک پوسٹ پر پکڑے نہیں گئے۔''

حارث لوگ دارالکباب سے پی جی ہسپتال چوک سے ہوتے ہوئے ایلیفنٹ روڈ کی طرف سے دو نمبر روڈ پر داخل ہونے سے پہلے ٹریفک پوسٹ کے قریب رکے۔ انہیں بائیں طرف دو نمبر روڈ کے سرے پر ایک جیپ نظر آئی۔ حارث نے بتایا کہ اس جیپ کو دیکھ کر ضیاء چلایا، ''رکو، لگتا ہے کہ جیپ کے پیچھے بتی بجھائے کئی ٹرک بھی کھڑے ہیں۔'' تب انہوں نے غور کیا کہ جیپ کے پیچھے بتی بجھا کر کئی ٹرک کھڑے ہیں۔ اردگرد کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ سامنے میر پور روڈ پر بھی بہت سی گاڑیاں اور لوگ موجود ہیں۔ ان لوگوں کو اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف پندرہ بیس منٹ پہلے عالم لوگ وہاں پر کارروائی کر گئے ہیں۔ وہ لوگ بائیں جانب مڑ کر سات مسجد روڈ پر سے ہوتے ہوئے ۲۸ نمبر روڈ پر چلے گئے تھے۔

عالم لوگ راجر باغ پولیس لائین نہیں گئے اس لئے حارث لوگ خفا ہوئے تھے مگر اگلے روز دوپہر کو جب انہیں معلوم ہو کہ کس طرح موت کے منہ سے وہ لوگ بچ کر آئے تھے تب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس طرح کا جرأت مندانہ ایکشن کرنے کے لئے سب نے عالم لوگوں کو داد دی۔

حارث نے کہا، ''آنٹی رومی تو ہیرو ہو گیا ہے۔ جس طرح سے گاڑی کا پچھلا شیشہ توڑ کر اس نے گولی چلائی، اس طرح کا ایکشن ہم نے اب تک صرف کتابوں میں پڑھا ہے یا غیر ملکی فلموں میں دیکھا ہے۔ میرے ہی دوست نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ سوچ کر مجھے بھی بہت ناز ہوتا ہے۔''

نظر ڈال کر دیکھا، رومی کا چہرہ فخریہ خوشی سے سرخ ہو گیا تھا۔ کئی دنوں سے دوستوں کی زبانی وہ یہ باتیں سن رہا تھا۔ میں نے کہا، ''اس طرح کے کسی ایکشن میں کسی ایک فرد کو ہیرو نہیں کہا جا سکتا، اصل ہیرو ہے پوری ٹیم۔ ہر ایک میں چستی اور پرفیکٹ نیس آف ٹائمنگ موجود ہو تو کامیاب ٹیم ورک ممکن ہوتا ہے اور تب ہی ایکشن میں بھی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔''

حارث نے کہا، ''آنٹی کل میں ترجہ لوگوں کے گھر پر گیا تھا۔ رومی لوگوں نے جس مکان کے سامنے

خان سپاہیوں کو مارا ہے اس کے سامنے والے مکان میں ترجہ کے والدین رہتے ہیں۔ ترجہ تو بھارت چلا گیا ہے۔ آزاد بنگلہ فٹ بال ٹیم میں ہے۔ ترجہ کو جانتی ہیں؟ وہ جو بہت اچھا فٹ بال کھیلتا ہے۔ اصل نام صلاح الدین ہے۔ میرا دوست ہے۔

رومی لوگ اصل میں کتنوں کو مار سکے تھے، اصل تعداد جاننے کے لئے وہاں گیا تھا لیکن بظاہر کہا، ''کیا حال ہے خالہ؟ آپ لوگ کیسے ہیں معلوم کرنے کے لئے آیا ہوں۔'' ترجہ کی امی نے کہا، ''کچھ مت پوچھو بیٹا، دو روز پہلے شام کے بعد ایک گاڑی پر مکتی باہنی والے آ کر تمام گارڈوں کو مار گئے ہیں۔'' ترجہ کی امی اس وقت اپنے مکان کے سامنے برآمدے میں کھڑی تھیں۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی وہ جلدی سے اندر جا کر دوسری منزل پر چلی گئیں اور وہاں پر ایک کھڑکی سے چھپ کر سارا منظر دیکھتی رہیں۔ مکان کے سامنے جتنے گارڈ موجود تھے سب ہلاک ہو گئے۔''

سہ پہر ہوتے ہی حارث چلا گیا۔ رومی ریکارڈ پلیئر پر جم ریوس کا ایک ریکارڈ لگا کر چوکی پر میرے قریب آ کر بیٹھا۔ میں نے کہا، ''غور کر رہی ہوں کہ تم آج کل جم ریوس کو زیادہ سن رہے ہو۔''

رومی کی عادت ہی ایسی ہے۔ جن دنوں جس فنکار کے گانے اچھے لگتے ہیں اس کے تقریباً تمام ریکارڈ خرید لیتا ہے۔ مختلف وقتوں میں ایسے مختلف فنکار اس کے ہر وقت کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ چند سالوں میں ہمارے گھر پر ایس ڈی برمن، فیروزہ بیگم، ٹام جونس، جم ریوس کے جتنے ریکارڈ ڈھاکہ میں دستیاب تھے سب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ کتابوں کے سلسلے میں بھی یہی عادت ہے۔

رومی نے کہا، ''یہ ریکارڈ آج چلو بھائی لوگوں کے گھر سے لایا ہوں۔ کل ہی واپس کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا، ''آج چلو، عالم، ''ن میں سے کوئی نہیں آیا؟''

''عالم ڈھاکہ میں نہیں ہے۔ آج سویرے شہاد : بھائی کے ساتھ میلہ گھر گیا ہے۔''

''اچانک ہی؟''

''ڈھاکہ میں کچھ بھاری اسلحہ لانا ممکن ہے کہ نہیں اس سلسلے میں بات چیت کرنے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر اب زیادہ تعداد میں ٹائم۔ پنسل اور پی کے چاہئے۔ یہ چیزیں بھی وہ لوگ لے کر آئیں گے۔''

''کون سا بھاری اسلحہ؟''

''ایل ایم جی۔ ڈھاکہ کے گوریلوں کو اب تک ہلکا اسلحہ دیا جا رہا ہے۔ جیسے سٹین گن، ایس ایم جی، گرینیڈ، ایکسپلوسو وغیرہ۔ ایل ایم جی بھاری تو ہے مگر مہنگی بھی اتنی ہی ہے۔ ایک بھی پکڑی جائے تو خاصا نقصان ہوگا البتہ ڈھاکہ میں حال میں جس طرح کے ایکشن ہو رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ بھاری اسلحہ آ جائے تو اور بھی بڑے بڑے ٹارگٹ ہٹ ہو سکیں گے چنانچہ ڈھاکے کے گوریلوں کی خواہش ہے کہ یہاں پر چند ایل ایم جی مہیا کی جائیں۔ عالم اور شہادت بھائی خالد مشرف اور حیدر بھائی سے اس بارے میں گفتگو کرنے گئے ہیں۔ جانتی ہو امی اگر ڈھاکہ میں ایل ایم جی آ جائے تو منصوبہ ہے کہ چھ ستمبر کو اس صوبائی دارالحکومت میں بڑے پیمانے پر ایکشن کیا

جائے گا۔"

"چھ ستمبر کو کیوں؟"

"پاکستان کی حکومت اس روز یوم دفاع منانے کی تیاری کر رہی ہے۔ اگر سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تو اس روز ڈھاکے کے تمام گوریلے چند گروپوں میں تقسیم ہو کر ایک ہی وقت میں شہر کے مختلف مقامات پر حملہ کریں گے جن میں راجر باغ پولیس لائین کا پریڈ گراؤنڈ اور یونیورسٹی کا میدان شامل ہیں۔"

"یونیورسٹی کے میدان پر کیوں؟"

"وہاں پر یوم دفاع کے لئے خوب پی ٹی اور پریڈ پریکٹس کرائی جا رہی ہے۔ جانتی ہو امی، ڈھاکہ میں اس وقت گوریلوں کے نو گروہ موجود ہیں۔ اگر چھ تاریخ کا منصوبہ بر سر کار لایا گیا تو اور بہت سے گوریلے ڈھاکے میں آ جائیں گے۔"

"اور تم لوگوں کا سدھر گنج پاور سٹیشن کا منصوبہ؟"

"وہ بھی برقرار ہے۔ اس کے لئے بھی پی کے لے آئیں گے وہ لوگ۔"

جم ریوس کی آواز رک گئی۔ رومی اٹھ کر ریکارڈ کی سائڈ پلٹ کر دوبارہ آ بیٹھا۔ "اچھا امی تم لوگ ڈھاکہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پر نہیں جا سکتے؟"

میں چونک اٹھی۔ "کیوں، کیوں!"

"تم لوگ ڈھاکہ میں نہ رہو تو میرے لئے ایکشن کرنے میں اور بھی آسانی ہو گی۔"

"کہاں پر جائیں گے؟ اور اگر جانے کی جگہ مل بھی گئی، ڈھونڈنے سے شائد مل ہی جائے گی، اس صورت میں بھی تیرے دادا کو لے کر جائیں گے بھی کیسے؟"

"دادا کو کچھ دنوں کے لئے پھپھو کے گھر پر چھوڑنا کیسا رہے گا؟"

"پھر تو اور بھی مصیبت ہو جائے گی۔ تیرے دادا کو اصل قصے کا پتہ لگ جائے گا۔ اس سے وہ اپ سیٹ ہوں گے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ جائے گا۔ سٹروک ہونا بھی ناممکن نہیں ہے۔ نہیں بیٹے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔"

رومی ایک گہرا سانس چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ جم ریوس بھی گاتے گاتے ایک دم خاموش ہوا۔ رومی نے اٹھ کر ایک اور ریکارڈ لگا دیا۔ "امی یہ گانا سنو غور سے۔"

ٹام جانس کا گانا "گرین گرین گراس" بج اٹھا۔ بہت مرتبہ سنا ہے یہ گانا۔ رومی اکثر لگاتا رہتا ہے۔ سنتے سنتے پوری دھن مجھے بھی تقریباً ذہن نشین ہو چکی ہے۔ اگرچہ انگریزی کا تلفظ زیادہ سمجھ نہیں پاتی ہوں۔ تین منٹ کا گانا ختم ہونے کے بعد رومی نے کہا، "امی گانے کی باتیں سنو گی؟ ایک پھانسی کا ملزم اپنے سیل کے اندر سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے گاؤں لوٹ گیا ہے۔ اس نے ٹرین سے اتر کر دیکھا کہ اس کے والد والدہ اور محبوبہ میری اسے لینے آئے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پیدائش سے پہلے کا وہ پرانا گھر اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس کے چاروں طرف سبز گھاس کی لہریں سی بہہ رہی ہیں۔ اسے گاؤں کے سبز گھاس پر ہاتھ پھیرنا اچھا لگا۔

اس کے بعد اچانک اس نے چونک کر دیکھا کہ وہ زرد پتھروں کی بنی چہار دیواری کے اندر لیٹا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اتنی دیر سے وہ خواب دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا، "خاموش ہو جا بیٹے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھ بڑھا کر رومی کا سر سینے سے بھینچ لیا۔"

"رومی، رومی! اتنی کم عمر ہے تمہاری۔ دنیا کا کچھ بھی تو نہیں دیکھا تم نے۔ زندگی کا کوئی تجربہ بھی تو حاصل نہیں کیا تم نے۔"

رومی سر اٹھا کر ایک عجیب سی ہنسی ہنسا۔ یوں لگا جیسے بہت درد ہو اس ہنسی میں۔ ایک لمحہ خاموش رہ کر بولا، "قطرے میں سمندر دیکھنا، ایک محاورہ نہیں ہے امی؟ ہو سکتا ہے کہ میں پوری زندگی کو تم لوگوں کی طرح نہ جان سکوں۔ اتنا تجربہ بھی حاصل نہیں کیا ہے لیکن زندگی کے جتنے رنگ، شیرینی، تلخیاں ہیں ان سب کا ذائقہ میں چکھ چکا ہوں امی۔ اگر چلا بھی گیا تو دل میں کوئی خلش لے کر نہیں جاؤں گا۔"

۲۹ اگست ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج حفیظ اپنے گاؤں سے ڈھاکہ آیا ہے۔ مارچ کے وسط میں وہ اپنی امی کو لے کر گاؤں چلا گیا تھا۔ ڈھاکہ کے مکان پر صرف اس کا بڑا بھائی وحید تھا۔ وہ بھی اپریل کے پہلے ہفتے میں چنکو کے ساتھ جنگ میں شامل ہونے کے لئے جا کر لاپتہ ہو چکا ہے۔

سہ پہر کے وقت ہمارے گھر پر رومی سے ان چند مہینوں میں گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں جاننے کے لئے آیا۔ مگر کہاں ہے رومی؟ وہ صبح کا ناشتہ کر کے جم ریوس کا ریکارڈ ہاتھ میں اٹھا کر نکل گیا تھا۔ کہہ گیا تھا کہ دوپہر کو ان کی میٹنگ ہے، اس کے بعد وہ چلو کے گھر پر جائے گا۔

میں نے حفیظ سے کہا، ''خدا معلوم کہاں گیا ہے؟ وہ کچھ بتاتا بھی تو نہیں ہے مجھے۔ کیا کچھ کرتا پھرتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سب کے سب ایک جیسے ہیں۔'' حفیظ نے منہ بسور کر کہا کہ من مانی کرنے والا لڑکا نہیں ہے رومی۔

رومی لوٹا شام کے بعد۔ حفیظ کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے سینے سے لگا کر ملا اور پھر اسے چھت پر اپنے کمرے میں لے گیا، اکیلے میں بات چیت کرنے کے لئے۔

رات کے نو بجے انہیں کھانے کے لئے بلایا۔ نیچے آ کر رومی نے کہا، ''امی رات کو حفیظ ہمارے ہاں رہے گا، ہماری بات چیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔''

رومی نے جامی کے کمرے میں ایک طرف ایک کیمپ بیڈ ڈال دیا۔ حفیظ کے لئے رومی اور جامی نے مل کر بستر لگایا۔ اس کے بعد رومی نے کہا، ''امی سر میں نہ جانے کیوں بہت درد ہو رہا ہے، ذرا اچھی طرح دبا دینا۔''

میں رومی کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ جامی اور حفیظ اپنے اپنے بستر میں لیٹ کر بہت دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ معصوم ساتھ والے کمرے میں سوتا ہے۔ وہ اٹھ کر جامی کے بستر پر آ بیٹھا۔ دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ آواز کئے بغیر بند کر دیا تا کہ گفتگو کی آواز بابا کے کانوں میں نہ جائے۔

سائیڈ ٹیبل پر ریڈیو بج رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے بنگلہ نغمے نشر ہو رہے تھے۔ اچانک خودی رام کی پھانسی کا وہ مشہور نغمہ کانوں میں پڑا

ایک بار جانے دے ماں ہو آؤں

ہنستے ہنستے پھانسی کا پھندا پہنوں گا
دیکھے گی جگت ساری.....

رومی نے کہا، ''کیسی عجیب بات ہے امی، آج ہی دوپہر کے وقت یہ نغمہ سنا تھا۔ نہیں معلوم کس سنٹر سے، اب دوبارہ ریڈیو پر وہی نغمہ، ایک ہی دن میں دوسری مرتبہ یہی نغمہ سنا۔ نجانے تقدیر میں کیا ہے۔''

سو چکی تھی، اچانک نیچے گیٹ پر دھم دھم کی آواز آئی ساتھ ہی کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں چونک کر اٹھی۔ مشرقی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا..... خدا خیر کرے! سامنے کی سڑک ملٹری پولیس، سڑک کی بتی کی روشنی میں سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ بھاگ کر رومی لوگوں کے کمرے میں پہنچی، وہ چاروں پتھر کے بت بنے کمرے کے بیچ میں کھڑے تھے۔ ان کے کمرے کی مغربی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پچھلی طرف بزل الرحمٰن، سنار اور قاسم صاحب کے گھروں کے سامنے والی سڑک پر بھی بہت سی ملٹری پولیس موجود تھی۔ واپس جنوبی کھڑکی کی طرف بھاگی، دیکھا کہ ڈاکٹر اے کے خان اور ہیشام صاحب کے گھروں کے سامنے بھی ملٹری پولیس کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا مکان چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔

دوبارہ رومی لوگوں کے کمرے میں گئی۔ رومی نے بے چینی سے کہا، ''کسی طرف سے بھی بھاگنے کا موقع نہیں ہے۔ لگتا ہے ہزار کے قریب پولیس آئی ہے۔ سڑک کی بتیاں بھی اتنی تیز ہیں بالکل دن کی طرح روشنی کی ہوئی ہے۔''

میں پاگلوں کی طرح کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگی اور رومی کو بھگانے کیلئے کوئی راستہ تلاش کرنے لگی۔ نہیں! کسی طرف سے بھی کوئی راستہ نظر نہیں آیا، پورے مکان میں جتنی کھڑکیاں ہیں سب پر گرل لگی ہوئی ہے۔ پورا برآمدہ بھی مضبوط گرل سے گھرا ہوا ہے۔ سیڑھیوں سے اتر کر پچھلی طرف کے صحن میں جانے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ پیچھے کی طرف کی دیوار بہت نیچی ہے لیکن اس طرف سڑک کی بتیاں اور سینکڑوں پولیس والوں کی نظروں سے چھپ کر فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔''

ادھر سامنے کے گیٹ پر ظالمانہ ہاتھوں کی دھم دھم کی آواز اور غصیلی چیخ و پکار متواتر تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اور شریف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس لمحے اپنے اندر کسی جذبے کا وجود میں محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ڈر، خوف، بے چینی کی شدت سے میں بے حس سی ہو کر گویا کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ کوئی جیسے مجھے دھاگوں سے باندھ کر گھما پھرا رہا ہے، چلا رہا ہے۔ شریف سے میں نے کہا، ''چلو سامنے کے برآمدے میں جا کر دریافت کریں وہ کیا چاہتے ہیں۔''

دونوں مشرق کی طرف والے چھوٹے سے برآمدے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ شریف نے کہا، ''کون ہے؟ کیا چاہتے ہیں؟''

نیچے سے کڑکڑاتی ہوئی آواز آئی، ''نیچے آ کر دروازہ کھولئے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں؟''

شریف نے دوبارہ کہا، ''آنکھ کھلنے میں دیر ہوئی ہے۔ اتنی رات کو کیا چاہئے؟''

اس بار کسی دوسرے نے ملائم آواز میں کہا، ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دروازہ کھولئے۔''
شریف اور میں سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈال کر دیکھا بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

نیچے کا دروازہ سامنے پورچ میں کھلتا ہے۔ رات کے وقت آگے اور پیچھے کی طرف کلپس ایبل گیٹ کھینچ کر بند کر دینے سے وہی گیراج بن جاتا ہے۔ شریف نے دروازہ کھولا، کلپس ایبل گیٹ کا تالہ کھول کر گیٹ کشادہ کیا۔ ایک خاصا کم سن آرمی آفیسر کھڑا تھا۔ اس کے دونوں طرف اور پیچھے ہٹے کٹے چہرے والے بہت سے دوسرے۔ میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا، واٹ کین وی ڈو فار یو؟''

افسر نے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر انگریزی میں کہا، ''میرا نام کیپٹن قیوم ہے۔ آپ لوگوں کا مکان ذرا سرچ کریں گے۔''

''میں نے پوچھا، ''کیوں کیا چاہئے؟''

کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جسٹ روٹین سرچ۔ آپ لوگوں کے گھر پر کتنے افراد رہتے ہیں۔ کون کون رہتا ہے؟

میں نے کہا، ''میں، میرا شوہر، میرے سسر، دو لڑکے، بھتیجے.....''

''لڑکوں کا نام کیا ہے؟''

''رومی، جامی۔''

وہ لوگ آگے بڑھے۔ میں نے ایک طرف ہو کر کہا، ''دیکھئے میرے سسر اندھے آدمی ہیں، ہائی بلڈ پریشر کے مریض۔ آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ شور کئے بغیر سرچ کیجئے۔ وہ کہیں جاگ نہ جائیں۔''

کیپٹن قیوم دیکھنے میں کالج کا طالب علم لگتا تھا۔ گورا رنگ، دبلا جسم، دھیما لہجہ، آہستہ آواز میں بات کرتا تھا۔ اس کے ساتھ آیا صوبے دار بھاری جسم اور درمیانی عمر کا تھا۔ اس کی اردو کا تلفظ سن کر لگا تھا کہ بہاری ہے۔

کیپٹن قیوم کے ساتھ ہی صوبے دار اور ایم پی کے مسلح سپاہی مکان کے اندر داخل ہو گئے اور لمحوں میں نچلی اور اوپر کی منزل میں پھیل گئے۔ تربیت یافتہ مہارت اور باریکی کے ساتھ انہوں نے تمام کمروں کی الماریاں اور درازیں چیک کیں۔ پیچھے کی طرف کا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا، بابا کے کمرے میں بھی کوئی آواز پیدا کئے بغیر جھانکا۔ رومی لوگوں سے سب کا نام پوچھا اور انہیں نیچے اترنے کے لئے کہا! میں اس دوران تقریباً سارا وقت ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ میں نے سوال کیا، ''کیوں؟ ان لوگوں کو نیچے اترنے کے لئے کیوں کہہ رہے ہیں؟''

کیپٹن قیوم نے کہا، کوئی خاص بات نہیں ہے تھوڑی سی روٹین انٹروگیشن کروں گا۔'' میں نے شریف کی طرف دیکھ کر کہا، ''آپ بھی نیچے آیئے۔'' ان کے ساتھ میں بھی نیچے آ گئی۔ دیکھا کہ رومی، جامی، حفیظ اور معصوم پورچ میں کھڑے ہیں۔ کیپٹن قیوم نے پورچ میں آ کر شریف سے دریافت کیا، ''یہ آپ کی گاڑی ہے؟ چلا لیتے ہیں؟ شریف کے گردن ہلانے پر اس نے کہا، ''آپ گاڑی چلا کر ہمارے ساتھ آیئے۔''

میں نے خوفزدہ ہوکر پوچھا، ''کہاں پر لے کر جارہے ہیں؟''

کیپٹن قیوم نے مطمئن اور دھیمے لہجے میں جواب دیا، ''بس ذرا رمنا تھانے تک، وہی روٹین انٹروگیشن۔ آدھے پونے گھنٹے تک یہ لوگ لوٹ آئیں گے۔''

کیپٹن کے اشارے پر پولیس کے چند سپاہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سوار ہوگئے۔ میں نے لاچار ہوکر کہا، ''میں بھی جاؤں گی آپ لوگوں کے ساتھ۔''

بہاری صوبے دار نے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں کہا، ''مائی جی آپ یہیں پر رہئے۔ یہ لوگ ایک گھنٹے کے اندر لوٹ آئیں گے۔'' شریف گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے شائد خاموشی کی زبان میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے اچانک جیسے ہوش میں آکر اپنے آپ کو سنبھالا۔ نظر اٹھا کر دیکھا پولیس کے چند سپاہی رومی، جامی، معصوم لوگوں کو لے کر روانہ ہورہے تھے۔ کیپٹن قیوم، شریف کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا۔ شریف گاڑی بیک کر کے گیٹ سے باہر نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

میں کچھ دیر تک ویران پورچ میں بت بن کر کھڑی رہی۔ اس کے بعد مکان کے اندر داخل ہوکر سارے کمروں کی تمام بتیاں ایک ایک کر کے جلانے لگی۔ نیچے کا دروازہ چوپٹ کھلا رہا، میں دوسری منزل پر چلی گئی۔ بابا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ جو بتیاں بجھی ہوئی تھی میں نے وہ بھی جلا دیں۔ اس کے بعد چھت پر چلی گئی۔ چھت کے کمرے کے اندر اور باہر کی دونوں بتیاں بھی جلا دیں۔ اس کے بعد دوبارہ نیچے آکر پورچ میں کھڑی ہوگئی۔ عجیب سی بے چینی تھی، کبھی بھاگ کر گلی کے درمیان میں کھڑی ہوجاتی تو کبھی پھر پورچ میں واپس آجاتی تھی۔ کبھی برآمدے میں آکر بیٹھ جاتی تو کبھی پھر چھت پر چلی جاتی۔ آدھا گھنٹہ گزرا، ایک گھنٹہ گزرا، ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ لوگ لوٹ کر نہیں آئے۔

میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی، کبھی اندر آتی، کبھی باہر جاتی۔ ہماری گلی کا بہاری نائٹ گارڈ بھی پریشان ہوگیا تھا، ہر چکر پر آکر کہتا، ''مائی جی آپ اندر چلی جایئے۔'' میں نے اس کی نصیحت پر کان نہیں دھرا۔ نیچے کا دروازہ کھلا رکھ کر دوبارہ اوپر گئی، چھت پر چڑھی، پھر نیچے اتر آئی۔ اس مرتبہ نائٹ گارڈ نے کہا ''مائی جی آپ دروازہ کھلا رکھ کر اوپر مت جایئے گا۔ دروزہ بند کر دیجئے۔'' میں نے اس مرتبہ بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ گلی سے ہوتی ہوئی مین روڈ تک پہنچ گئی۔ پھر واپس آگئی۔ نائٹ گارڈ نے اس مرتبہ ذرا جھنجھلا کر کہا، ''مائی جی آپ سوئیں گی نہیں؟''

''سوؤں گی؟ یہ کیسا مذاق ہے؟ جب تک بچے واپس نہ آجائیں مجھے نیند آسکتی ہے؟''

۳۰ اگست ۱۹۷۱ء بروز پیر

سحر ہونے والی ہے، وہ لوگ ابھی تک نہیں لوٹے۔ کیپٹن قیوم نے کہا تھا آدھے، پونے گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ میں نے بھی یقین کر لیا اور پانچ گھنٹے گزار دیئے۔ وہ لوگ تو سیدھا پکڑ کے لے جا سکتے تھے پھر کیپٹن قیوم نے جھوٹ کیوں بولا؟

کیپٹن قیوم سے گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے اس کا فون نمبر پوچھا تھا۔ کیوں پوچھا تھا؟ کیا لاشعوری طور پر میں جانتی تھی کہ وہ لوگ اتنی جلدی نہیں لوٹیں گے؟

گھڑی پر دیکھا، چھ بج گئے تھے۔ جوبلی کے گھر پر فون کیا۔ جوبلی کے بھائی کا لڑکا حفیظ ہمارے گھر سے گرفتار ہوا تھا اسے سب سے پہلے خبر پہنچانا ضروری تھا۔ ایک امید نظر آتی ہے کہ جوبلی کے بڑے بھائی فرید اس وقت ڈھاکہ کے ڈی سی ہیں، شائد وہ اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکیں۔

اس کے بعد منظور اور مکی کو فون کیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر جوبلی اور معصومہ ہمارے گھر پر پہنچ گئے۔ ان کو دیکھ کر اتنی دیر کے بعد پہلی مرتبہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ لوگ مجھے ہمدردی کے گہرے جذبات کے ساتھ باری باری سینے سے لگا کر خود بھی آنسو بہاتے رہے۔ کسی کی زبان پر بھی اطمینان کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ بھی تو اسی غم میں مبتلا تھے۔ ایک کا شوہر اور دوسرے کا بھائی جابر پاک فوج کی حراست میں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو سنبھالا اور بابا کے کمرے میں گئی۔ انہیں اٹھا کر منہ ہاتھ دھلوایا اور ایزی چیئر پر بٹھا کر ہال میں لے آئی۔ جوبلی اور معصومہ باورچی خانے میں چلے گئے، بارق کے ساتھ مل کر چائے، ناشتہ وغیرہ کا کچھ انتظام کرنے کے لئے۔

بابا نے اٹھتے ہی حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا، ''ماں، تم کیوں؟ معصوم کہاں پر ہے؟''

میں نے حتی الامکان لہجہ نارمل رکھ کر کہا، ''وہ چاروں سحر کے وقت اٹھ کر سابھار گئے ہیں۔ آج وہاں پر ہفتہ وار ہاٹ کا دن ہے۔ سستے میں کچھ سودا لے کر آئیں گے۔''

بابا نے پھر کچھ نہیں کہا۔

انہیں ناشتہ کروا کر نیچے چلی آئی اور کھانے کی میز پر آ بیٹھی۔ معصومہ اور جوبلی کے اصرار کے باوجود

صرف ایک کپ چائے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھا پی سکی۔

اچانک گیٹ سے گاڑی کی آواز آئی۔ بھاگ کر پورچ تک گئی۔ ایک سفید گاڑی کی جھلک نظر آئی، کیا شریف لوگ واپس آ گئے ہیں؟ مجھے دوڑتا دیکھ کر یا شاید خود ہی گاڑی اچانک گلی میں ہی رک گئی۔ گاڑی میں دیکھا تو مایوسی سے دل بیٹھ گیا۔ گاڑی میں ایک ہی شخص بیٹھا تھا۔ وہی گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی بھی ٹیوٹا تھی ہماری ہلمین منکس نہیں۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تو میں نے پہچان لیا کہ سپن ہے۔ اس کے تن پر شوخ سرخ قمیض، الجھے ہوئے بال، آنکھیں سرخ، چہرے پر دیوانگی کا تاثر۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے دوڑ کر اس کے قریب گئی اور سرگوشی میں کہا، ''جلدی سے نکل جاؤ سپن، رومی پکڑا گیا ہے۔ کل رات کے وقت آرمی آ کر گھر کے تمام مردوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ جلدی سے یہاں سے چلے جاؤ اور اس طرح گاڑی پر اکیلے مت گھومو، کہیں پر چھپ جاؤ۔''

سپن کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی، وہ کچھ نہیں بولا اور واپس جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں ایک طرف کو ہٹ گئی۔ اس نے گیٹ کے اندر گاڑی داخل کر کے بیک گیئر پر گھمائی اور نکل گیا۔ میں بے حس سی ہو کر کمرے میں آ بیٹھی۔ دس منٹ گزرنے سے پہلے ہی دروازے پر بہت آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے اچھل کر بھاگی اور جا کر دروازہ کھولا۔ باہر دولڑکے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خوف کا تاثر تھا۔ وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے کہا، ''تم شہادت چودھری کے چھوٹے بھائی فاتح نہیں ہو؟ اور تم ضیاء۔ تم لوگ کس لئے آئے ہو؟ جلدی سے بھاگو۔ کل رات کو رومی پکڑا گیا ہے ساتھ ہی گھر کے تمام افراد بھی۔''

فاتح نے دھیمے لہجے میں کہا ''ہمارے گھر پر بھی ریڈ ہوا ہے۔ آرمی میرے بہنوئی کو پکڑ کر لے گئی ہے۔''

''اور کسی کو لے کر گئے ہیں؟''

''نہیں۔ مجھے کل سہ پہر کو ہی خبر مل گئی تھی کہ صمد پکڑا گیا ہے۔ میں دونوں بہنوں کو لے کر ہاٹ کھولا کے مکان سے نکل گیا تھا۔ دولہا بھائی چند روز پہلے ہی گاؤں سے ڈھاکہ آئے تھے اس لئے وہ امی ابو کے ساتھ گھر پر ہی تھے۔''

''تم لوگ مزید دیر مت کرو۔ جلدی چلے جاؤ۔''

فاتح نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''میں آپ کا گھر نہیں پہچانتا تھا۔ کل رات کے وقت اندازے سے مختلف گلیوں میں بہت ڈھونڈا تا کہ رومی کو خبر پہنچا سکوں، آج صبح ضیاء ملا تو، وہ آپ کا گھر پہچانتا ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

بات مکمل کئے بغیر ہی فاتح اور اس کے پیچھے پیچھے ضیاء سر جھکا کر نکل گئے۔

پڑوسی بھی ایک ایک کر کے آنا شروع ہو گئے۔ وہ تمام لوگ گزشتہ رات جاگ کر اپنے اپنے گھروں کے اندر کٹھ پتلے بن کر بیٹھے رہے تھے لیکن کسی نے دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کی۔ مجھے سانو، منجو، بھکو کی حفاظت میں دے کر معصومہ اور جو بلی ''پھر سے آئیں گے'' کہہ کر رخصت ہوئے۔

آٹھ بجے سے آرمی ایکسچینج پر فون کرتی رہی، کیپٹن قیوم سے رابطہ کرنے کے لئے۔ مگر کسی طرح بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ کہتے وہ ابھی تک نہیں آئے۔ ایک مرتبہ کہا یہ ایکسٹینشن ان کا نہیں ہے، دوسرا ایک نمبر دیا۔ اس نئے نمبر سے کسی نے ایک اور نمبر دے دیا۔

نو بجے منظور اور مکی گھر پر آئے۔ بانکا ڈھاکہ میں موجود نہیں ہیں، چٹاگانگ گئے ہیں۔ منظور اور مکی نے سارا واقعہ سننے کے بعد کہا، ''آفس جا کر پتا کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

ساڑھے نو بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دوڑ کر جا کے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ حفیظ آیا ہے، اکیلا۔

ہاتھ پکڑ کر کمرے کے اندر لے گے، اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ''تو آیا ہے بیٹا! اکیلا کیوں آیا ہے؟ تیرے خالو کہاں ہیں؟ رومی، جامی، معصوم؟''

حفیظ کے جسم پر لنگی اور سفید کرتا تھا، شکنوں سے بھرپور، گرد آلودہ۔ چہرے پر گہرے درد کے سائے۔ ویسے بھی وہ بہت آہستہ بات کرتا ہے لیکن اب تو اس کی آواز بمشکل سنائی دی، ''میں نہیں جانتا!''

اس کا گم سم چہرہ دیکھ کر پہلے اسے تسلی دی پھر کرسی پر بٹھایا۔ اس نے دو گلاس پانی پیا۔ اس کے بعد اسے ایک پیالی چائے لا کر دی۔ تھوڑا سا سنبھل کر اس نے بتایا کہ پہلے انہیں مین روڈ پر لے جا کر قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک جیپ کی ہیڈ لائٹ جلا کر سب کی شناخت کی۔ اس کے بعد رومی کو علیحدہ کر دیا اور اپنی جیپ پر بٹھا لیا۔ حفیظ، معصوم اور جامی کو شریف کی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ شریف سے کہا کہ ان کی جیپ کے پیچھے پیچھے چلتے آئیں۔ پولیس کے چند سپاہی بھی رائفل سمیت شریف کی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ مین روڈ پر اس ایک جیپ کے علاوہ بھی بہت سی جیپیں اور لاریاں موجود تھیں۔ وہ لوگ جیپ کے پیچھے ائیر پورٹ کے الٹی طرف ایم پی اے ہوسٹل لے گئے۔ وہاں پر ان سب کو ایک کمرے میں رکھا گیا۔ رات بھر ان سب پر بہت تشدد کیا گیا۔

بتاتے ہوئے حفیظ کے ہونٹ کانپنے لگے۔ میں نے کہا، ''کوئی بات نہیں، ابھی مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، تم منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے آرام کرو۔ میں تمہارے چچا کو فون کرتی ہوں۔''

حفیظ کی اتنی خواہش نہیں تھی کہ اس کے چچا یہاں آئیں۔ چچا کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس نے کہا، ''صرف اطلاع دینا ہی کافی ہے۔''

جوبلی کو فون کر کے بتایا کہ حفیظ کو چھوڑ دیا ہے۔ حفیظ کی مرضی کے خلاف اس کے چچا فرید کو فون کر کے سارا واقعہ بتایا۔ ایسی مصیبت کے وقت رشتہ داروں سے شکوہ نہیں رکھنا چاہئے۔

مکی اور منظور کو فون کر کے حفیظ سے حاصل شدہ معلومات سے آگاہ کیا۔

حفیظ اوپر کمرے میں تھوڑی دیر تک آرام کرنے کے بعد اٹھ کر جوبلی لوگوں کے گھر چلا گیا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرمی ایکسچینج پر فون ملاتی رہی۔ اس بہاری صوبے دار نے اپنا نام سفین گل بتایا تھا۔ ''قیوم نہیں ہے'' کہنے پر گل کو ملانے کے لئے گزارش کی۔ وہ بھی نہیں ملا۔

اوپر بابا بہت بے چین ہو رہے تھے کہ شریف لوگ اب تک کیوں نہیں لوٹے؟ عطاء بھائی کو فون کر دیا

کہ بادشاہ لوگ اور دوسرے رشتہ داروں کو اطلاع دے دی جائے۔ سوچ رہی تھی کہ عطاء بھائی یا بادشاہ اور ایلا لوگوں کے آنے کے بعد بابا کو اصل بات بتاؤں گی۔

شام کا آخری پہر بھی گزر گیا، شریف لوگوں کی کوئی خبر نہیں آئی۔ منظور اور کمی لوگوں نے اس سلسلے میں سارا دن بھاگ دوڑ کی لیکن ابھی تک کوئی کھوج نہیں لگا سکے ہیں۔

میں پورا دن مسلسل کوشش کے باوجود کیپٹن قیوم یا صوبیدار سفین گل میں سے کسی سے رابطہ نہیں کر پائی۔ سوچتی رہی کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ لوگ کہیں فرضی نام تو نہیں بتا گئے؟

دن بھر گھر پر لوگ آتے رہے۔ عطاء بھائی لوگ، ایلا اور بادشاہ لوگ، کلیم، ہدیٰ، نزلو، امی، لالو، عتیق، بولو، پچھلی گلی کے بزل الرحمٰن صاحب کی بیگم، قاسم صاحب، ستار صاحب، اس گلی کے تمام پڑوسی۔ معصومہ اور جوبلی سہ پہر کے وقت دوبارہ آئے۔ منی بھائی، دیبا، لولو، چمو، مجھے اچانک خیال آیا کہ کیا ان کے دل میں کوئی خوف نہیں ہے؟ اتنے جو لوگ آ رہے ہیں۔ مین روڈ پر سادہ لباس میں آئی بی کے لوگ یقیناً نظر رکھ رہے ہوں گے۔ ان لوگوں کے لئے بھی تو مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

شام کے ساڑھے سات بجے اچانک تقدیر کو رحم آ ہی گیا، صوبیدار سفین گل فون پر مل گیا۔ سفین گل نے انتہائی انکساری کے ساتھ بتایا کہ انٹروگیشن میں ذرا دیر ہو رہی ہے، آپ کوئی فکر مت کیجئے گا۔ انٹروگیشن ختم ہوتے ہی وہ لوگ گھر واپس آ جائیں گے۔"

میں نے سوال کیا، "وہ لوگ کس حال میں ہیں؟ ایسی کیا انٹروگیشن ہو رہی ہے؟ کیا میں اپنے شوہر یا بیٹے کے ساتھ بات کر سکتی ہوں؟"

سفین گل نے تھوڑا سا جھجک کر کہا۔ "ٹھیک ہے بلاتا ہوں بات کیجئے۔"

تھوڑی دیر کے بعد جامی کی آواز آئی۔ "ہیلو امی، میں جامی بول رہا ہوں"

میں خوشی سے بے تاب ہو گئی۔ "جامی۔ کیا مسئلہ ہے؟ تم لوگوں کو ابھی تک چھوڑ کیوں نہیں رہے ہیں؟ کیسے ہو تم لوگ؟"

جامی نے رک رک کر جواب دیا۔ "چھوڑ دیں گے۔ خیریت سے ہیں۔"

رومی کیسا ہے؟ تمہارے ابو؟ معصوم؟

جامی نے اسی طرح رک رک کر جواب دیا،

"خیریت سے ہیں، اب رکھتا ہوں۔"

"جامی..... جامی..... تم لوگوں نے کچھ کھایا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ ابھی تک کھانا نہیں دیا؟ صوبیدار صاحب کو ذرا فون دینا۔"

فون پر صوبیدار صاحب کی آواز آئی تو میں نے کہا، "ابھی تک انہیں کھانا نہیں دیا ہے؟ کل رات کے بارہ

بجے لے گئے تھے اب شام کے ساڑھے سات بج گئے ہیں، اتنی دیر تک وہ فاقے سے ہیں؟ آپ کی منت کرتی ہوں صوبیدار صاحب انہیں کچھ کھانے کے لئے دیجئے اور کچھ نہیں تو ان سے پیسے لے کر ان کے لئے کچھ خرید کر لا دیجئے۔

صوبیدار نے ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ابھی لا دیتا ہوں۔'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں تھوڑی دیر تک سن بیٹھی رہی پھر اچانک فرش پر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

۳۱ اگست ۱۹۷۱ء بروز منگل

ایک اور رات جاگ کر گزار دی۔ کل سے لالو اور امی آ کر یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ساڑھے دس بجے منظور اور مکی نے آنا ہے مجھے ایم پی اے ہوسٹل لے جانے کے لئے۔ صبح آٹھ بجے اٹھ کر امی اور لالو کے ساتھ سینڈوچ بنانے بیٹھی تھی۔ کافی سارے سینڈوچ بنائے۔ سب کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا ساتھ لے لوں گی۔ پرسوں رات سے بے چارے ان ہی کپڑوں میں ہیں۔ کچھ سوچ کر شریف کا شیونگ سیٹ بھی کپڑوں کے پیکٹ میں رکھ لیا، اگر مزید کچھ دن نہ چھوڑا تو.....؟

گیارہ بجے کے قریب ایم پی اے ہاسٹل پہنچے۔ منظور گاڑی چلا رہے تھے۔ سامنے کی سیٹ پر مکی بیٹھی تھی۔ میں دونوں پیکٹ ہاتھ میں پکڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ڈرم فیکٹری کے راستے سے گاڑی داہنی طرف مڑی۔ ایم پی اے ہاسٹل کے گیٹ پر رائفل ہاتھ میں اٹھائے پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک دو سوال پوچھ کر ہمیں جانے دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے وسیع لان تھا اور بائیں طرف ایم پی اے ہاسٹل کی بلڈنگ۔ قطار در قطار برآمدے، سامنے چوڑا برآمدہ۔ مختلف کمروں میں وردی میں ملبوس لوگ آ جا رہے تھے۔ سب لوگ مصروف نظر آتے تھے۔ مختلف طرز کی یونیفارمز ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ عام سپاہی سے لے کر مختلف رینکوں کے افسر تک موجود ہیں۔

مکی نے کہا تم گاڑی میں بیٹھو۔ پہلے ہم پتہ کر آتے ہیں۔ مکی اور منظور سیڑھی سے برآمدے کے اوپر چڑھ گئے۔ لوگوں سے پوچھ پوچھ کر مختلف کمروں میں داخل ہوتے اور نکلتے رہے۔ میں بیٹھی چاروں جانب نظر گھماتی رہی۔ یہیں پر انہیں لایا گیا ہے۔ ان کمروں میں سے کسی ایک میں رکھا ہے شائد۔ یا اللہ کسی طرح ایک لمحے کے لئے کسی ایک کی شکل نظر آ جاتی تو فوراً بھاگ کر ان کے پاس چلی جاتی۔

مکی، منظور واپس آ کر کہنے لگے۔ ''یہاں پر نہیں ہیں۔ پچھلی طرف دیکھنے کو کہہ رہے ہیں۔''

منظور پھر سے گاڑی گھما کر سڑک پر نکل آئے۔ ایم پی اے ہاسٹل چھوڑ کر تھوڑا سا آگے بڑھ کر دوبارہ داہنی طرف کی ایک گلی کے اندر مڑے۔ تھوڑی دور جا کر ایک دو منزلہ مکان کے سامنے رکے۔ اس بار گلی میں گاڑی کھڑی کر کے ہم تینوں اتر گئے۔ گیٹ سے اندر داخل ہو کر مختلف کمروں میں جھانکنے لگے۔ اچانک ہم سے تھوڑا آگے برآمدے پر چلتے ہوئے سفین گل نظر آئے۔ میں نے ''صوبیدار صاحب، صوبیدار صاحب'' کہتے ہوئے تیز قدم اٹھا کر انہیں روکا۔ گل مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ میں نے ایک سانس میں کہہ ڈالا، ''صوبیدار صاحب میں ان کا

پتا کرنے آئی ہوں۔ان سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ان کے لئے کچھ کھانے کی چیزیں اور کپڑے لائی ہوں۔ صوبیدار صاحب مجھے ان سے ملوا دیجئے۔"

صوبیدار گل کا چہرہ دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔سنجیدہ چہرہ بنا کر بولے،"یہاں پر نہیں ہیں۔دوسری جگہ پر گئے ہیں۔اچھا آپ میرے ساتھ آیئے۔" کمی اور منظور کی طرف دیکھ کر کہنے لگے، "آپ لوگ یہیں پر انتظار کیجئے۔"

میں صوبیدار سفین گل کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔کمرے کے اندر ٹیبل کے پیچھے کرسی پر ایک افسر بیٹھے ہوئے تھے۔دروازے کے قریب تین چار مسلح ملٹری پولیس والے کھڑے تھے۔صوبیدار گل نے اردو میں افسر سے کچھ کہا۔میں پوری بات سمجھ نہیں سکی۔سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔میری نگاہیں بار بار کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔اگر اچانک شریف نظر آ جائے۔تھوڑی دیر بعد گل نے مجھ سے کہا، "مائی جی وہ لوگ تو اس وقت یہاں پر نہیں ہیں۔کینٹونمنٹ گئے ہیں۔ابھی تو ملاقات نہیں ہوگی۔آپ گھر واپس چلی جائیں۔"

میں نے بے چینی سے کہا،"میں یہاں پر انتظار کر لیتی ہوں۔وہ یہاں پر واپس تو آئیں گے؟"

صوبیدار سفین گل نے سنجیدگی سے کہا،"مائی جی آپ گھر واپس چلی جائیں۔یہاں پر انتظار کرنے کی سہولت نہیں ہے۔آپ بعد میں پتا کیجئے گا۔خود مت آیئے۔کسی کو بھیج کر پتا کروایئے گا۔"

میں نے لاچار ہو کر کہا،"تو پھر یہ دونوں پیکٹ رکھ لیجئے۔ان کے کپڑے اور کچھ کھانے کی چیزیں ہیں۔"

صوبیدار گل نے بھی جیسے لاچار ہو کر دونوں پیکٹ رکھ لئے۔بولے،"آپ دوبارہ مت آیئے۔وہ لوگ گھر پر پہنچ جائیں گے۔فکر مت کیجئے۔زرد چہرہ لے کر کمی اور منظور کے پاس واپس آئی۔گھر پر جب پہنچے دن کے پونے دو بجے تھے۔امی اور لالو نیچے کے کمرے میں بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔لالو نے کہا،"خالو جان بہت بے چین ہو رہے ہیں۔"

ڈائننگ روم کی چوکی پر لمبی لیٹ کر میں نے کہا،"امی آپ جا کر بابا کو سنبھالئے۔ابھی میں ان کے سامنے نہیں جا سکتی۔"

امی دوسری منزل پر چلی گئیں۔لالو میرے قریب آ کر مجھ سے لپٹ کر خاموش آنسو بہانے لگی۔

کتنی دیر اس طرح سے گزری کچھ معلوم نہیں۔اچانک پورچ میں گاڑی کی آواز آئی۔میں اچھل کر بھاگی اور دروازہ کھولا۔دیکھا تو ہماری سفید گاڑی ہلمین منکس تھی۔گاڑی سے شریف، جامی اور معصوم اتر رہے تھے۔صرف رومی نہیں تھا۔

میرے گلے کو پھاڑ کر ایک بیمار چیخ نکلی،"رومی کو نہیں چھوڑا؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ایک ایک کر کے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔میں اتنے میں ہوش میں آ کر تینوں سے لپٹ گئی۔یکا یک شعور کو دھچکہ لگا۔ان کے تن پر لنگی، کرتا تھا اور وہ بھی پھٹا ہوا اور گرد آلود۔ان

کے چہرے پر مردنی اور آنکھوں میں گہرا صدمہ تھا جس سے کرب اور بے حرمتی کی چھاپ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ان کے جسم تھکاوٹ سے چور تھے لگ رہا تھا جیسے ٹھیک طرح سے کھڑے رہنا بھی ان کیلئے مشکل ہو رہا ہے۔ جلدی سے انہیں بٹھا کر پانی کی بوتل اور گلاس لے آئی۔ لالو سے کہا چائے بناؤ اور امی سے کہا کہ بابا کو خبر کر دیں۔

ان میں سے ہر ایک نے دو دو تین تین گلاس پانی پیا۔ جیسے پیاس ہی نہ بجھ رہی ہو۔ میں نے کہا "دوپہر کے ڈیڑھ بجے تک کمی، منظور اور میں ایم پی اے ہاسٹل میں گھومتے رہے۔ صوبیدار گل نے بتایا کہ تم لوگوں کو کینٹونمنٹ لے جایا گیا ہے۔"

شریف نے کہا، نہیں تو! ہمیں کینٹونمنٹ تو نہیں لے کر گئے تھے۔ ہم اسی ایم پی اے ہاسٹل میں تھے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے صوبیدار نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ کس وقت چھوڑا تم لوگوں کو؟"

"ہمیں ڈیڑھ بجے کے قریب ہی چھوڑ دیا تھا۔ گاڑی کی چابی انہوں نے رکھ لی تھی چابی ڈھونڈنے میں ذرا دیر لگ گئی۔"

گھڑی پر نظر ڈال کر دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔

میں نے تعجب سے کہا، "کیسی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہیں وہ لوگ۔ میں تم سب لوگوں کے لئے سینڈوچ اور ایک ایک جوڑا کپڑوں کا لے کر گئی تھی۔ گل کے پاس رکھوا آئی ہوں۔ اس نے رکھ بھی لیا۔ اسی وقت بتا سکتے تھے کہ تم لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اکٹھے واپس آ جاتے۔"

وہ تینوں عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ میں نے گھٹن محسوس کرتے ہوئے ان سے پوچھا، "کیا ہوا؟ تم سب لوگ ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟"

جامی نے کہا، "امی تم ابھی تک دقیانوسی خیالوں میں پھنسی ہوئی ہو۔ سودیسی تحریک کے دوران انگریز حکام سیاسی قیدیوں کے ساتھ جیسا سلوک کرتے تھے یاد نہیں، رشتہ داروں سے ملاقات کرنے دیتے تھے کیا؟ کھانا اور کپڑے پہنچانے کی اجازت دیتے تھے؟ بعد میں پھانسی پر لٹکا کر لاش رشتہ داروں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ سمجھ رہی ہو کہ نہیں؟ اب تک وہی نظام چل رہا ہے۔ جان لو امی کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سے ان پانچ مہینوں میں پاکستانی ملٹری جنتا اس سلسلے میں پانچ سو برس آگے نکل چکی ہے۔ ان کی کارروائیاں دیکھ کر ہٹلر کی گستاپو فورس بھی سر جھکا لے۔ اس کا ثبوت ہم دو دن اور دو راتوں میں دیکھ آئے ہیں۔ دراصل ہم جسمانی اور شعوری طور پر دوزخ سے ہو آئے ہیں۔ تمہیں سب کچھ بتائیں گے۔ سارا کچھ سننے میں تمہیں دو دن لگ جائیں گے۔"

اوپر سے بابا بلا رہے تھے، شری، رومی، جامی، معصوم۔

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا، "بابا کے پاس جاؤ۔ وہ بالکل دیوانے ہو رہے ہیں۔ میں فون کر کے سب کو اطلاع کر دیتی ہوں۔"

یکم ستمبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

گزشتہ روز شریف، جامی اور معصوم کی زبانی بربریت اور شقاوت کی نا قابل یقین اور غیر انسانی داستان سنی۔ شریف ہمیشہ سے کم گو ہیں۔ انہوں نے قید میں گزاری ہوئی دوراتوں اور دو دنوں کی مختصری سرگزشت سنائی، اپنے انداز میں۔ سوال کر کر کے تفصیلی حقائق معلوم کئے جامی اور معصوم سے۔

اس رات گھر کے مین گیٹ سے رومی، جامی لوگوں کو پاک آرمی والے مین روڈ تک لے جا کر رک گئے۔ شریف لوگوں نے دیکھا کہ مین روڈ پر کافی جیپیں اور لاریاں کھڑی ہیں۔ جتنی ملٹری پولیس مکان کا گھیراؤ کر کے کھڑی تھی، وہ تمام کی تمام ہماری اور قاسم صاحب کی گلی سے نکل کر مین روڈ پر اکٹھی ہوئی۔ کیپٹن قیوم نے شریف سمیت پانچوں افراد کو سڑک کے ایک طرف قطار میں کھڑا کروایا۔ اس کے بعد مخالف سمت پر کمپالا ہوٹل بلڈنگ کے سامنے سے ایک جیپ آ کر ان کے سامنے رکی۔ اس کی ہیڈ لائیٹ جلا دی گئی۔ کیپٹن قیوم نے جیپ کے قریب جا کر جیپ میں بیٹھے ہوئے کسی شخص سے ہلکی آواز میں کوئی بات کی۔ اس کے بعد شریف لوگوں کے قریب آ کر رومی کا بازو مضبوطی سے تھام کر کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔" رومی کو اس جیپ پر سوار کیا۔ جامی، معصوم اور حفیظ کو شریف کی گاڑی ہی میں ٹھونس دیا۔ سامنے رومی اور کیپٹن جس جیپ پر سوار ہوئے تھے وہ بھی چل دی۔ اس کے پیچھے شریف لوگوں کی گاڑی اور ان کے پیچھے باقی تمام جیپیں اور لاریاں۔ بالاخر وہ ایم پی اے ہاسٹل جا کر رکے۔ وہاں پر اترنے کے بعد دوبارہ پانچوں کو قطار میں کھڑا کروایا گیا۔ دوبارہ ان کے چہرے پر ہیڈ لائٹ کی روشنی ڈالی گئی۔ برآمدے میں ایک آرمی آفیسر آ کر کھڑا ہوا اور سوال کیا، "ہو از رومی؟" رومی کو شناخت کرنے کے بعد انہیں برآمدے میں ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ صرف چند منٹ تک اکٹھے اسی طرح کھڑے رہے۔ اسی چند منٹ کے وقفے میں رومی نے سرگوشی میں کہا، "تم لوگ کسی بات کا اقرار مت کرنا۔ تم میں سے کسی کو کچھ معلوم نہیں، میں نے تم لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔"

تھوڑی دیر کے بعد چند سپاہی رومی کو الگ سے اندر لے گئے۔ اس کے بعد چند دوسرے سپاہی شریف لوگوں کو ایک درمیانے سائز کے کمرے میں لے گئے۔ وہاں پر صوفہ سیٹ موجود تھا تاہم انہیں فرش پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔

اس کے بعد شروع ہو گئی خوفناک کارروائی۔ تھوڑی دیر کے وقفے سے چند فوجی داخل ہوئے اور

شریف، جامی، معصوم اور حفیظ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی، ''اسلحہ کہاں پر چھپایا ہے؟ کہاں سے تربیت حاصل کی ہے؟ کتنے آدمی ہلاک کئے ہیں؟'' وغیرہ وغیرہ۔

جوابات ظاہری بات ہے کہ منفی میں تھے۔ تشدد کا سلسلہ فوراً ہی شروع ہو گیا۔ انہوں نے ظلم کی انتہا کر دی، سینے پر مکے، پیٹ پر لاتیں، اچانک پیچھے سے گردن پر ایسی چوٹ کہ یوں محسوس ہوا جیسے آنکھیں باہر کو نکل آئیں گی۔ رائفل کے بٹ سے سینے اور پیٹھ پر ضربیں۔ بیت، لاٹھی، بیلٹ کے ساتھ، منہ، سر، کمر اور جسم کے باقی حصوں پر مسلسل اور اندھا دھند ضربیں۔ منہ کے بل الٹا لٹا کر بوٹوں سمیت اوپر چڑھ کر پورے جسم کو کچلنا، خاص طور پر کہنیاں، کلائیاں اور گھٹنوں کے جوڑوں کو بری طرح سے نشانہ بنانا۔ آس پاس کے کمروں میں بھی یہی سلسلہ جاری تھا۔ تشدد کے شکار بنگالیوں کی چیخ و پکار، وحشی فوجیوں کی مستی، طنز اور دبدبہ سنائی دے رہا تھا۔ وہ قیدی جیسے ان کے کھلونے ہوں۔ اتنے سارے کھلونے ایک ساتھ ملنے سے ان کے لئے جشن کا سماں بندھ گیا۔ ایک ٹولہ آتا، مار پیٹ، طنز و تمسخر کر کے چلا جاتا۔ چند منٹ کے وقفے سے ایک اور ٹولہ آ جاتا اور نئے سرے سے تشدد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس دوران کوئی بے ہوش ہو جاتا تو اس پر پانی ڈال دیتے۔

سارے تشدد کے دوران بس ایک بات کا خیال رکھا جاتا کہ کسی کو اس طرح سے نہ مارا جائے کہ کوئی قیدی جان سے گزر جائے۔ اس ایک پہلو سے سارے فوجی بہت ہوشیار تھے۔ وہ اس طریقے سے مارتے کہ تکلیف نا قابل برداشت ہو۔ ان کے تشدد سے ناک اور منہ سے خون بہنے لگتا، ہاتھ، پیر اور انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں لیکن وہ جان سے نہیں جاتے۔ کوئی بے ہوش ہو جاتا تو اس پر پانی ڈال کر ہوش میں لے آتے، تھوڑی دیر ستانے کا موقع دیتے تا کہ دوبارہ سے تشدد برداشت کرنے کے قابل ہو جائے۔

اس کارروائی کے بعد ہر ایک کو باری باری ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں پر ایک کرنل بیٹھا تھا، کرنل حجاجی۔ اس نے ان لوگوں سے مختلف سوالات پوچھے۔ شریف کو اس کے سامنے لے جایا گیا۔ انہیں کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے بعد ''وہ کیا کرتے ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟ گھر پر کون کون رہتا ہے؟ رومی کی عمر کتنی ہے؟ کس جماعت میں پڑھتا ہے؟....'' اس طرح کے سوالات پوچھے۔ شریف نے تمام سوالات کا جواب دیا۔ حفیظ کے بارے میں بتایا کہ وہ آج ہی چٹاگانگ سے ڈھاکہ پہنچا ہے۔ وہ بے چارہ ڈھاکہ کی صورتحال کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ نیز یہ کہ اس کے چچا ڈھاکہ کے ڈی سی ہیں۔

اس کے بعد کرنل حجاجی نے سوال کیا کہ رومی کب سے مکتی باہنی میں شامل ہوا ہے؟ کہاں پر ٹریننگ حاصل کی ہے؟ شریف نے بتایا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اتنی دیر تک خاصی مہذب طریقے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ اس بار کرنل حجاجی تھوڑے سے گرم ہو گئے۔ ''آپ نہیں جانتے کہ آپ کا لڑکا کس طرح کے فضول لڑکوں کے ساتھ گھومتا ہے۔ کیسے فضول کام کرتا پھرتا ہے؟'' شریف نے کہا، میرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے، یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، وہ کن لڑکوں کے ساتھ گھومتا ہے، کیا کچھ کرتا ہے اس بارے میں معلومات رکھنا میرے لئے ممکن ہے کیا؟'' حجاجی نے طنز کیا، ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ایک ان فٹ فادر ہیں۔ اپنے بیٹے کو راہ راست پر رکھنے کی

ذمہ داری نہیں نبھا پاتے۔'' شریف نے خفا ہو کر کہا، ''کیا آپ ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ آپ کا لڑکا کن لوگوں سے ملتا جلتا ہے، کن جگہوں پر جاتا ہے؟'' کرنل نے شریف کو گھور کر دیکھا لیکن خاموش رہا۔

شریف کو واپس بھیجنے کے بعد حفیظ کو پیش کیا گیا۔ اس کے کرتے کی جیب میں چٹاگانگ سے ڈھاکہ تک کی فلائٹ کا ٹکٹ رہ گیا تھا۔ کاغذ کا وہ ٹکڑا دکھا کر وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ حقیقتاً اسی روز ڈھاکہ پہنچا ہے۔ اس کے بعد باری باری جامی اور معصوم کو لے جایا گیا۔ وہ لوگ باری باری کرنل کے سامنے پیش ہوتے رہے۔ پیچھے باقی لوگوں کی پٹائی ہوتی رہی۔ جو لوگ کرنل کے سامنے پیشی بھگت کر آ رہے تھے واپسی پر دوبارہ ان کی پٹائی ہونے لگتی۔ اسی میں سحر ہو گئی۔

اس کے بعد چند سپاہی آئے اور شریف لوگوں کو ایک اور کمرے میں لے گئے۔ یہاں پر ایک اور حیران کن منظر ان کا منتظر تھا! چھ فٹ بائی آٹھ فٹ کا ایک چھوٹا سا کمرہ ہو گا۔ کمرے کے اندر چاروں طرف دیواروں کے ساتھ اور پورے فرش پر لوگ بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کے اس ہجوم میں بدیع اور چلو کو دیکھ کر شریف لوگ چونک گئے۔ شریف لوگ اگرچہ باقی لوگوں کو نہیں پہچانتے تھے تاہم تھوڑی دیر میں سب سے تعارف ہو گیا۔ خان سپاہی چند لمحوں کے بعد کمرے سے باہر نکل گئے اور باہر سے کمرہ بند کر کے زنجیر لگا دی۔ ان کے جاتے ہی تمام لوگ کانا پھوسی میں ایک دوسرے متعارف ہونے لگے۔ وہاں پر الطاف محمود اس کے چار سالے نوجیل، کھنو، دینو، اور لینو باللہ، آرٹسٹ علوی، شریف کے انجینئر دوست منان کے دو سالے رسول اور ناصر، آزاد، جویل، ڈھاکہ ٹی وی کے میوزیشن حفیظ، مارننگ نیوز کے رپورٹر بشر، نیون سائن کے مالک صمد اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ موجود تھے۔ الطاف محمود کی بنیان سینے کے قریب خون سے بھیگی ہوئی تھی اور ناک اور منہ پر اس وقت بھی خون لگا ہوا تھا، آنکھیں ہونٹ سب سوج گئے تھے۔ بشر کے بائیں بازو کی کلائی اور کہنی کے درمیان کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں، کسی نہ کسی طرح ایک رومال سے انہیں باندھا ہوا تھا اور اسی حالت میں دونوں بازو کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ حفیظ کی یک آنکھ باہر نکل کر رخسار کے پاس لٹک رہی تھی۔ جویل کی جس انگلی پر ایک ماہ پہلے چوٹ لگی تھی اسے فوجیوں نے تنکے کی طرح مروڑ کر توڑ دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں باہر سے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ کمرے کے اندر تمام لوگ فوراً خاموش ہو گئے، کیونکہ بات چیت کرنا ممنوع تھا۔ بات کرتے سن لیا تو فوجی ماریں گے۔ دروازہ کھول کر خان سپاہیوں نے رومی اور چند دوسرے لڑکوں کو اندر دھکیل دیا۔ کسی نے کہا، ''سپاہی جی بہت پیاس لگی ہے۔'' جواب میں بیلٹ کی ضربیں کھائیں۔ انہوں دوبارہ باہر نکل کر دروزہ بند کر دیا۔ کسی نے احتجاجی لہجے میں کہا ''جلاد ہیں جلاد! پانی تک نہیں دیں گے؟ پانی مانگنے پر بھی ماریں گے؟''

تھوڑی دیر کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا ایک شخص کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ اچانک کسی کی نظر پڑی تو اس نے چونک کہا، ''ارے! وہاں پر پانی کا ایک نلکا نظر آ رہا ہے۔'' سب نے جھٹ اس طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ پانی کا ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ اتنے سارے لوگ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے تھے جس کی وجہ سے نلکا چھپ گیا

تھا۔سب نے باری باری نلکے کے پاس جا کر پانی پیا۔بشر کو ایک اور لڑکے نے اپنے چلو میں پانی بھر کر پلایا۔

دوبارہ سرگوشی میں بات چیت شروع ہوگئی۔معلوم ہوا کون کس وقت، کس طرح سے پکڑا گیا ہے۔ بدیع ۲۹ اگست دوپہر کے بارہ بجے پکڑا گیا تھا۔اسی روز صبح وہ ۲۸ نمبر روڈ پر رومی لوگوں کے ساتھ میٹنگ میں شامل ہوا تھا۔اس کے بعد رومی چلو کے ساتھ اس کے گھر پر گانا سننے کے لئے چلا گیا۔بدیع گیا تھا اپنے عزیز دوست فرید کے گھر پر اس سے گپ شپ کرنے کے لئے۔اسی مکان سے ملٹری نے اسے گرفتار کیا۔صمد کو پکڑا دوپہر کے چار بجے۔آزاد کے گھر پر فوجی رات کے بارہ بجے گئے تھے۔اس گھر پر اس رات کو جویل، بشر، قاضی، آزاد کا خالہ زاد بھائی اور بہنوئی کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے۔جویل، بشر، آزاد اور اس کی خالہ زاد بہن کا شوہر اور دیگر دو مہمانوں کو فوجی پکڑ کر لے آئے تھے۔صرف قاضی نے اچانک کیپٹن پر چڑھائی کر کے اس کے ہاتھوں سے سٹین گن چھیننے کی کوشش کی تھی۔واقعہ اتنا اچانک پیش آیا اور اس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ فوجیوں نے گھبرا کر کمرے کے اندر ہی اندھا دھند گولی چلا دی۔اسی افراتفری کے دوران قاضی فرار ہو گیا۔

بڑے گ بازار میں آزاد لوگوں کے گھر سے عالم لوگوں کا گھر نزدیک ہی ہے۔دلور وڈ پر عالم لوگوں کے گھر پر فوجی رات کے دو بجے آئے۔اس مکان سے عالم کے چچا عبدالرزاق اور ان کے بیٹے میزان الرحمٰن کو پکڑا۔رات کے ڈیڑھ بجے قاضی عالم لوگوں کے گھر پہنچا تھا، الف ننگی حالت میں۔اس نے کہا، ''تھوڑی دیر پہلے آزاد لوگوں کے گھر پر آرمی نے ریڈ کیا تھا۔میں اسی افراتفری میں بڑی مشکل سے بھاگ کر آیا ہوں۔مجھے ایک لنگی اور ایک سٹین گن دے دیجئے۔آرمی یقیناً یہاں پر بھی آئے گی۔میں انہیں روکوں گا۔'' عالم کی امی نے کہا، ''بیٹے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔اپنا انتظام ہم خود کر لیں گے۔'' قاضی کے نکلتے ہی عالم کی امی اور چار بہنوں نے مل کر اس کے والد کو پچھلی طرف کی باؤنڈری وال پر چڑھایا جو کود کر دوسری طرف نکل گئے۔عین اسی وقت فوج پہنچ گئی۔عالم لوگوں کے باورچی خانے میں فرش پر حوض کی طرح کا خانہ بنا ہوا تھا۔اس کے اندر اسلحہ چھپا دیا گیا۔آرمی نے آتے ہی سوال کیا کہ باورچی خانہ کدھر ہے؟ گھر کے تمام لوگ فوراً سمجھ گئے کہ آرمس ایمونیشنز ڈمپ کے بارے میں انہیں پہلے سے معلوم ہو گیا تھا۔خان سپاہیوں نے باورچی خانے میں جا کر چولہے میں جلانے والی لکڑیوں کا ڈھیر ہٹایا، بیلچے سے کنکریٹ کا سلیب اٹھایا اور تمام اسلحہ، گولا بارود وغیرہ اٹھا کر لے گئے۔گھر پر مرد افراد میں سے چونکہ صرف عالم کے چچا اور چچازاد بھائی موجود تھے لہٰذا انہی کو پکڑ کر لے گئے۔بے چارے صرف دو چار دن پہلے ہی کھلنا سے ڈھاکہ آئے تھے۔کچھ جانے اور کئے بغیر ہی دونوں باپ بیٹے تشدد کی چکی میں پس رہے ہیں۔وہ ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ پائے کہ انہیں اس طرح سے اندھا دھند تشدد کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے۔

ہاٹ کھولا میں شہادت لوگوں کے گھر پر رات کے تین بجے ملٹری آئی۔انہیں وہاں مکتی باہنی کی موجودگی کی کوئی شہادت نہیں ملی تو اس کے بہنوئی ولایت چودھری کو پکڑ کر لے گئے۔وہ بے چارہ پی آئی اے میں نوکری کرتا ہے، دو مہینوں کی چھٹی پر کراچی سے گھومنے کے لئے آیا تھا اور ابھی تک لوٹ کر نہیں جا سکا تھا۔اس سے پہلے وہ گاؤں میں ہی تھا مگر قسمت خراب تھی کہ صرف دس بارہ روز پہلے ہی ڈھاکہ آیا تھا۔بے چارہ تین میں تھانہ تیرہ

میں۔مکتی باہنی میں شامل اپنے سالوں کی وجہ سے فوج کی پٹائی سہ رہا تھا۔

چلو کے گھر پر فوج رات کے ڈیڑھ دو بجے کے قریب گئی۔ چلو کے بڑے بھائی ایم صادق، اونچے عہدے کے سی ایس پی افسر ہیں۔ ایلیفنٹ روڈ پر ان کی رہائش گاہ سے چلو کو پکڑا ہے۔

سپن کے گھر پر بھی فوج رات کے ڈیڑھ دو بجے گئی۔ ایلیفنٹ روڈ سے چلو کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر جیپ میں بٹھایا گیا تھا۔ اسی جیپ پر آرمی والے سپن لوگوں کے گھر گئے۔ آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے چلو کو پہلے تو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں لیکن ایک خان سپاہی کی بات کانوں میں آئی کہ سپن بھاگ گیا ہے تو اسے سمجھ آیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ پھر چلو نے سپن کے والد کی آواز سنی۔ بعد میں لڑکیوں کے رونے کی آواز بھی آئی۔ چلو نے اندازہ لگایا کہ سپن کی بہنیں مہوا، کیا اور سنگیتا رو رہی ہیں۔ سپن کے والد شمس الحق صاحب کو بھی آرمی والے پکڑ کر لے گئے۔

الطاف محمود کے گھر پر فوج گئی سحر کے پانچ بجے کے قریب۔ ان کا مکان راجر باغ پولیس لائن کی مخالف سمت میں آؤٹر سرکلر روڈ پر ہے۔ شریف کے دوست، منان صاحب کے ساتھ والے مکان میں، کرائے پر رہتے ہیں۔ وہ منان صاحب کے بڑے بھائی بقی صاحب کا مکان ہے۔ چند روز پہلے نیون سائن کے مالک صمد، گولیوں اور گندھک سے بھرا ہوا ایک بڑا سا ٹرنک الطاف محمود کے پاس رکھوانے کے لئے آئے تھے۔ منان صاحب کے مکان کی پچھلی طرف، صحن میں وہ ٹرنک دبا کر رکھا گیا تھا۔ فوج نے آتے ہی الطاف محمود کے سینے پر رائفل کے بٹ سے وار کیا۔ ان کی ناک اور منہ سے فوراً خون نکل آیا۔ اس کے بعد انہیں اور صمد کو صحن کھودنے کے لئے کہا۔ ٹرنک نکلوا کر ان ہی سے اٹھوایا۔ آرمی والے صمد کو ساتھ لے کر ہی ان کے گھر پر گئے تھے۔ اس کے بعد فوجیوں نے الطاف کے سالوں سے ٹرنک گاڑی پر رکھوایا۔ علوی اس وقت ان کے گھر پر موجود تھا۔ خان سپاہی ''علوی کون ہے؟'' کہہ کر اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن علوی کی قسمت اچھی تھی۔ الطاف کو موقع مل گیا اور اس نے علوی سے کہا کہ تمہارا نام ابوالبرک ہے اور تم میرے بھانجے ہو، گاؤں سے آئے ہو۔ چنانچہ ابوالبرک نام بتا کر علوی بچ گیا البتہ دوسروں کے ساتھ فوج اسے بھی پکڑ کر لے گئی۔''

منان کے دو سالے رسول اور ناصر اپنی امی کے ساتھ بہن کے مکان کی دوسری منزل، کرائے پر لے کر رہتے تھے۔ چونکہ دونوں مکان ساتھ ساتھ ہی ہیں اور ٹرنک بھی منان لوگوں کے صحن سے نکلا تھا چنانچہ فوجی، رسول اور ناصر کو بھی پکڑ کر لے گئے۔ الطاف لوگوں کے اوپر والی منزل پر ایک انکم ٹیکس افسر کرائے پر رہتے تھے، انہیں، ان کے لڑکے اور ایک بھانجے کو بھی فوج پکڑ کر لے گئی۔

رومی نے شریف سے کہا، ''ابو یہ لوگ مجھے پکڑنے سے پہلے ہی جان گئے تھے کہ ۲۵ تاریخ کو ۱۸ اور ۵ نمبر روڈ پر ہم نے کیا کارروائی کی ہے۔ گاڑی پر کون کون موجود تھا، کس نے کہاں پر کس وقت گولی چلائی، کتنے افراد کو مارا ہے، سب کچھ پہلے سے ہی جان چکے تھے لہٰذا میرے اقرار کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم چاروں میں سے کوئی کسی بھی حالت میں کچھ اقرار نہ کرے۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں معلوم، ہر سوال کے جواب میں یہی کہنا۔ تم لوگوں کو شائد الگ الگ لے جا کر پوچھ گچھ کریں لیکن سب لوگ ہر وقت ایک ہی بات کہنا۔ میں کیا کچھ کرتا

پھرتا ہوں تم لوگوں کو کبھی گمان تک نہیں ہوا ہے۔ خیال رکھنا کسی بات میں ذرا بھی ہیر پھیر نہ ہو۔"

الطاف محمود بھی اپنے سالوں علوی، ناصر اور رسول کو یہی بات کہتے رہے کہ "تم سب لوگ ایک ہی بات کہنا۔ تم میں سے کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ جو کچھ بھی کیا ہے میں نے ہی کیا ہے۔ جو کچھ اقرار کرنا ہوگا میں خود ہی کروں گا۔"

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ کبھی کبھی خان سپاہی اندر آتے، اندھا دھند مار پیٹ کرتے، گالیاں نکالتے اور دوبارہ نکل جاتے۔ پھر یہ لوگ سرگوشی میں گفتگو شروع کر دیتے۔ چند خان سپاہی آ کر رومی، بدیع اور چلو کو نکال کر لے گئے۔ بعد میں ایک مرتبہ آ کر الطاف محمود اور اس کے ساتھ کے تمام لوگوں کو لے گئے۔ ایک اور مرتبہ آ کر شریف اور جامی لوگوں کو نکال کر لے گئے۔ اسی دوران صبح کے نو بجے کے قریب حفیظ کو چھوڑ دیا گیا مگر ان لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہوا۔ وقت اور مقام کا کسی کو احساس نہیں رہا تھا۔ کس کو کہاں پر لے جایا گیا، کس وقت لے جایا گیا، اس بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں بتا سکا۔ ان کے ذہن پر صرف یہی نقش تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ان پر کس طرح کا ستم ڈھایا جا رہا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ سپن کے والد شمس الحق صاحب کے دونوں ہاتھ باندھ کر پنکھے کے ہک کے ساتھ لٹکا دیا گیا ہے اور انہیں موٹے ڈنڈے اور تاروں کے رسے سے پیٹا جا رہا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئے تو انہیں فرش پر لٹا کر ان پر پانی ڈال کر ہوش میں لایا گیا۔ ان پر فوجیوں کو زیادہ غصہ تھا کیونکہ ان کا ایک بیٹا سپن ان کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا اور ان کا دوسرا بیٹا ڈالم پہلے سے ہی جنگ آزادی میں ملوث تھا۔

فوجی میلہ گھر کے ایک اور گوریلے الفت کی تلاش میں اس کے گھر گئے۔ جب وہ نہیں ملا تو اس کے والد عزیز الصمد کو پکڑ کر لے گئے۔ ان کو میں نام سے پہچانتی ہوں۔ ان کی بیگم صادقہ صمد، آنند مٹی گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس ہیں۔ صادقہ آپا کے ساتھ بہت عرصے سے میری ملاقات ہے۔ ڈھاکہ کے کئی جرأت مندانہ ایکشنوں میں الفت پیش پیش رہا ہے۔ الفت کو تو پکڑ نہیں پائے اس غصے میں اس کے باپ پر غیر انسانی تشدد کر رہے ہیں۔

اس روز شام کے وقت میں نے فون پر صوبیدار گل اور جامی سے بات کی تھی۔ جامی نے بتایا کہ امی تمہارا فون ملنے کے بعد گل نے رقم لے کر ہمیں کچھ روٹیاں اور کباب لا دیئے تھے۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب ان سب کو یعنی ۲۹ تاریخ کی رات سے لے کر ۳۰ تاریخ کی صبح تک جن لوگوں کو پکڑا تھا، رومی کے علاوہ، سب کو جیپ میں ڈال کر رمنا تھانہ لے جایا گیا۔ وہاں پر سب کا نام درج کر کے ایک کمرے کے اندر داخل کیا گیا۔ وہ لوگ جب رمنا تھانے میں پہنچے تو ہر طرف خاموشی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ کمرے کے اندر بہت سے قیدی سو رہے تھے۔ ان کو کمرے کے اندر دھکیلنے کے بعد دروازے پر تالہ لگا کر خان سپاہی، جیپ پر سوار ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز تماشا شروع ہو گیا۔ فرش پر لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تمام لوگ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شور مچا کر نئے قیدیوں کا تعارف، خیر و عافیت معلوم کرنے لگے، خدمتیں کرنی شروع کر دی۔ کس کی کون سی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، کہاں سے خون بہہ رہا ہے، کہاں پر درد ہے معلوم کر کے کسی کی چوٹ پر بینڈج باندھنے لگے، کسی کی مالش کرنے میں مصروف ہو گئے، کسی کو

نوالین کھلانے لگے۔ پہلے ایک مرتبہ سب کو پانی پلایا۔ جولوگ سگریٹ کے عادی ہیں انہیں سگریٹ دیا گیا۔ اس کے بعد چاول اور سالن آیا، دو دو چمچ چاول اور تھوڑا تھوڑا سبزیوں کا سالن۔ جولوگ پان کھانے کے عادی ہیں ان کے لئے پان کا انتظام بھی ہوگیا۔ یہ تمام قیدی بھی بنگالی تھے۔ یہ لوگ بھی چند روز پہلے ملٹری کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ان کو بھی ایم پی اے ہاسٹل کا مرحلہ بھگتنا پڑا ہے۔ ان لوگوں نے نئے آئے والے قیدیوں کو بتایا کہ کل صبح آپ کو دوبارہ ایم پی اے ہاسٹل لے جایا جائے گا جہاں مزید ٹارچر ہوگا۔ ان لوگوں نے بچاؤ کی ایک ترکیب بتائی کہ پہلی ہی ایک دو چوٹوں پر بے ہوش ہو جانے کا ڈھونگ کیا جائے۔ آنکھیں الٹا کر سانس روک لیجئے گا۔ پھر وہ لوگ پانی ڈال کر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ جائیں گے۔ اس سے پٹائی ذرا کم ہوگی۔"

دوسرے روز صبح کے سات بجے دوبارہ گاڑی آئی۔ اس بار ایک بڑی سی بس تھی۔ سب کو بس پر سوار کر کے تمام کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ دوبارہ ایم پی اے ہاسٹل لے جایا گیا۔ ہاسٹل میں تھوڑی دیر تک رکھنے کے بعد انہیں پچھلی طرف ایک اور مکان کے اندر لے جایا گیا۔ ہاسٹل کے گیٹ سے نکل کر گلی کے راستے تھوڑی دور جانے کے بعد ایم پی اے ہاسٹل کے پیچھے یہ مکان واقع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر سب کا بیان لیا جائے گا۔ اس مکان کے اندر ایک اور دہشت ناک ڈرامے کا آغاز ہوا۔

بیان سے مراد یہ تھی کہ ایک افسر الگ الگ سب لوگوں کا موقف سنے گا اور کاغذ پر درج کرے گا۔ بیان کے دوران قیدیوں پر جو تشدد کیا جاتا ہے وہ گزشتہ دو روز کے تشدد سے زیادہ دردناک ہے۔ افسر قیدی سے سوال کرتا ہے، جواب اگر نفی میں ہو تو فوراً ڈنڈوں کی چوٹیں، بوٹوں کی لاتیں، رائفل کے بٹ کی ضربیں برسنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر یکے بعد دیگرے منفی جوابات آئیں تو بیان لینے والے افسر کو غصہ آ جاتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کا وقفہ دیتا ہے اور اس دوران خان سپاہی قیدی کو چھت کے ہک سے لٹکا کر تاروں کے رسے سے پٹائی کرتے ہیں۔ کسی کو الٹا لٹا کر دونوں بازو پیچھے کی طرف کھینچ کر دونوں ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں۔ پورا جسم کشتی کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس شخص کی سانس رکنے لگتی ہے اور چیخ بھی نہیں نکلتی۔ کوئی قیدی زیادہ ٹیڑھا ہو تو اس کے دونوں پیر باندھ کر چھت کے پنکھے کے ساتھ لٹکا کر پنکھا چلا دیا جاتا ہے۔ وہ شخص پنکھے کی رفتار کے ساتھ جب پوری رفتار پر گھومتا ہے تو کچھ دیر بعد اس کی ناک، منہ اور آنکھوں سے خون جاری ہو جاتا ہے اور وہ لمحوں میں بے ہوش ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے مراحل سے گزرتے گزرتے تقریباً ایک بج گیا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجے کے قریب شریف، جامی اور معصوم کو دوبارہ ایم پی اے ہاسٹل میں لا کر کرنل کے کمرے میں پیش کیا گیا۔ کرنل نے کہا کہ "تم لوگ اب گھر جا سکتے ہو۔" شریف نے رومی کے بارے میں دریافت کیا۔ کرنل نے بتایا کہ رومی کو اگلے روز چھوڑا جائے گا۔ اس کا بیان ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔

۲ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

شریف سے کرنل نے کہا تھا کہ رومی ایک روز کے بعد واپس آئے گا۔ یہ بات قابل یقین ہے کیا؟ کیا میں نے اس بات کا اعتبار کیا تھا؟ شریف کے لوٹنے کی خبر سن کر پرسوں سہ پہر سے گھر پر رشتہ داروں اور دوستوں کی آمدورفت جاری ہے۔ سب لوگ رومی کے لئے افسوس کر رہے ہیں۔ افسوس کیوں کر رہے ہیں؟ کیا رومی کے آزاد ہونے کی کوئی امید نہیں؟ کل گیارہ بجے منظور کے ساتھ میں دوبارہ ایم پی اے ہاسٹل گئی تھی۔ رومی کے کچھ کپڑے وغیرہ ایک پیکٹ میں ڈال کر اسے دینے کے لئے اور اس سے ملاقات کرنے کی التجا، ایک عرضی میں لکھ کر لے گئی تھی۔ کہیں سے کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔ کوئی بھی رومی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے سکا۔ کرنل حجاجی سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ کہتے تھے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ کیپٹن قیوم، صوبیدار گل، وہ لوگ بھی جیسے ہوا ہو گئے تھے۔ ایم پی اے ہاسٹل کو دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ اسی بلڈنگ کے اندر شب و روز اندھیر مچایا جاتا ہے۔ یہاں پر کیا ساؤنڈ پروف کمرے ہیں؟ ورنہ ۳۱ تاریخ کو گیارہ سے ایک بجے کے درمیان یہاں کی دونوں عمارتوں میں آتی جاتی رہی مگر کسی کی چیخ و پکار کی کوئی آواز نہیں سنائی دی؟ حالانکہ شریف، جامی اور معصوم کی زبانی معلوم ہوا کہ اس دوران پچھلی طرف کی دو منزلہ عمارت میں ان قیدیوں سے بیان لیا جا رہا تھا۔ یقیناً ساؤنڈ پروف کمرے ہیں جو چیخوں کی ذرا بھی آواز نہیں سنائی دی؟

گھر پر واپس آ کر یہی سوال جامی اور معصوم سے کیا۔ جامی نے کہا ساؤنڈ پروف کمرے نہیں ہیں البتہ ایم پی اے ہاسٹل میں اور اس کی پچھلی طرف کی اس عمارت میں پیچھے کی طرف بہت سے کمرے ہیں۔ تشدد کا عمل ان پچھلے کمروں میں کیا جاتا ہے۔ سامنے کی طرف کچھ آفس ہیں تاہم رات کے اندھیرے میں ان کمروں میں بھی مار پیٹ کی جاتی ہے۔

سہ پہر کے وقت منان اور نور جہان آئے۔ منان چٹاگانگ سے کل لوٹا ہے۔ نور جہان کے دونوں بھائی رسل اور ناصر منگل کے روز ہی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ شدید مار پیٹ کی وجہ سے ان کا برا حال تھا۔ رسول کے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی کمر میں شدید درد تھا۔ ناصر کی حالت بھی خستہ تھی۔

الطاف محمود کے چار سالے اور ''بھانجہ ابوالبرک'' گزشتہ روز آزاد ہو گئے تھے۔ سب کو بہت مارا پیٹا گیا ہے۔ ان کے بڑے بھائی نوجیل کی گردن، پشت اور کمر پر زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ منجھلے بھائی دینو کے چاروں

ہاتھ پیر کی انگلیاں اور کلائی کا جوڑ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک کان کا پردہ بھی پھٹ گیا تھا۔ علوی کا بچ کر نکل آنا ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ گھر پر ریڈ کے دوران الطاف نے ایک مرتبہ بتا دیا تھا کہ اس کا نام علوی نہیں ابوالبرک ہے اور وہ الطاف کی بہن کا لڑکا ہے۔ ایم پی اے ہاسٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں خان سپاہیوں نے دوبارہ سے سوال کیا تھا ''علوی کون ہے۔'' علوی بے دھیانی میں ایک مرتبہ ''میں ہوں'' کہہ کر کھڑا ہونے ہی والا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے لینو نے پیچھے سے قمیض کھینچ کر اسے روک دیا۔ خان سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد لینو، دینو لوگوں نے اسے رٹوایا تھا، میرا نام ابوالبرک ہے۔ والد کا نام فلاں ہے، والدہ کا نام فلاں ہے۔ یعنی الطاف کی بہن اور بہنوئی کا نام۔

وہ پانچوں بچ کر لوٹ آئے ہیں۔ الطاف واپس نہیں آسکا۔

نور جہان اور منان کی موجودگی ہی میں دادا بھائی اور مرتضٰی بھائی آئے۔ رومی کے لئے افسوس کی انتہا نہیں ہے۔ مرتضٰی بھائی بار بار غمزدہ لہجے میں کہتے رہے کہ کیا واقعی رومی نے ۲۵ تاریخ کا ایکشن کیا تھا؟ مجھے اگر ذرا بھی معلوم ہوتا بھابی تو رومی کو کسی حال میں بھی ڈھاکہ میں رہنے نہ دیتا۔ ہم نے جب بھی ۱۸ نمبر ۵ نمبر روڈ کے ایکشن کا تذکرہ کیا ہے آپ لوگوں نے بس خاموشی سے سنا ہے۔ ایسی اداد کھائی ہے جیسے آپ لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ ہماری زبانی ہی پہلی مرتبہ سن رہے ہوں۔ دادا بھائی نے بھی اسی طرح شکایت کرتے ہوئے کہا کہ رومی جنگ آزادی میں شمولیت اختیار کر چکا ہے ہم لوگوں کو ذرا سا بتا تو سکتے تھے۔ نہ بھی بتاتے کم از کم رات کے وقت سونے کے لئے ہمارے طرف تو بھیج سکتے تھے۔

کیا جواب دوں ان باتوں کا؟ دادا بھائی، مرتضٰی بھائی اپنے اپنے گھر کے لڑکوں کو سنبھالتے ہوئے ہی گھبرا رہے تھے، اس پر رومی کو ان کے کندھوں پر سوار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بانکا چٹاگانگ سے لوٹا ہے۔ بانکا، منظور، مکی، مرتضٰی، دادا بھائی، فقیر، منی بھائی، سب لوگ مل کر غور وفکر کر رہے ہیں کہ رومی کو چھڑانے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ سب کی ہی کسی نہ کسی فوجی افسر کے ساتھ واقفیت یا بے تکلفی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے طور پر ان لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

لالو اور امی ۳۰ تاریخ کو ہمارے گھر آئے تھے۔ تب سے انہیں جانے نہیں دیا۔ امی بھی اپنے طور پر جاءنماز پر بیٹھ کر خدا کے دربار میں رومی کے لئے دعا درود پڑھ رہی ہیں۔

اس افراتفری کے بیچ میں جامی کی سالگرہ کب آ کر گزر گئی ہے کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ جامی کو خود ہی شائد یاد نہیں تھا۔ مجھے اچانک سرشام یاد آ گیا۔ برہان الدین خان جہانگیر آئے تھے۔ کافی دیر تک خاموشی سے بیٹھے رہے۔ پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ویسے بھی کم بولتے ہیں اور اب تو کہنے کے لئے ہے بھی کچھ نہیں۔ انہیں رخصت کرنے کے لئے باہر کے گیٹ تک گئی۔ باغیچے میں گلاب کے پودوں پر چار پانچ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ اس طرف نظر ڈال کر برہان نے کہا، ''بہت خوبصورت پھول ہیں۔ پورے باغیچے کو روشن کیا ہوا ہے۔''

میں نے کہا، ''ان پھولوں میں ذرا بھی غیرت یا جذبہ نہیں ہے۔ پورا سال ان پر اتنی محنت کرتی ہوں۔

میرے ان مصائب سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیسے بے شرموں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔"

شکائت بھری نظروں سے بونی پرنس، اینا ہارکنس، سیمون کے اجلے سکھی چہروں کو دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہی یاد آیا رومی نے بونی پرنس کی ایک ادھ کھلی کلی کا تحفہ دیا تھا میری سالگرہ پر۔ ہائے میرا اپنا بونی پرنس آج کہاں ہے؟ کس ظالم کے ہاتھوں مرجھا رہا ہے؟

یہی بات سوچتے سوچتے اچانک بجلی کی طرح یاد آ گیا آج جامی کی سالگرہ ہے۔ میرا ایک اور بونی پرنس تو موجود ہے۔ رومی کے دکھ میں جامی کو بھول بیٹھی ہوں!

میں بونی پرنس نوچ کر جامی کی تلاش میں گھر کے اندر چلی آئی۔ نیچے کی منزل پر نہیں تھا۔ دوسری منزل پر بھی نہیں تھا۔ چھت پر جا کر دیکھا، کھلے آسمان کے نیچے چھت پر بیٹھ کر سر نیچا کر کے ستار بجا رہا ہے۔ قریب جا کر کھڑی ہوئی۔ جامی نے محسوس نہیں کیا۔ تھوڑا سا نیچے جھک کر دیکھا، جامی آنکھیں موند کر ستار بجا رہا تھا، اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سینے پہ دھکا سا لگا۔ جامی کے ریاض کے وقت رومی طبلہ بجاتا تھا۔ اس بات کو یاد کر کے جامی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں گے یا اپنی سالگرہ کے موقعہ پر بھیا کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئی ہوں گی یا پھر گھر کے تمام لوگ اس کی سالگرہ بھول گئے ہیں، اس رنجش میں وہ رو دیا ہے؟

میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس گلاب کو آہستہ سے جامی کے رخسار سے لگا کر دھیمی آواز میں کہا، "مینی مورر یٹرنز۔"

۳ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

میں کیا دیوانی ہوتی جارہی ہوں؟ چند روز سے سیلاب کی طرح عزیز رشتہ دار آرہے ہیں۔ رومی کے لئے ماتم کررہے ہیں، یہ دیکھ کر میرے دل کو تو سکون ملنا چاہئے۔ کتنوں کے بارے میں تو سنتی ہوں کہ اگر ملٹری آکر شوہر یا لڑکے کو پکڑ کر لے جائے تو خوف کے مارے عزیز رشتہ دار اس گھر کی طرف پیر نہیں بڑھاتے۔ میرے سلسلے میں الٹا نظام چل رہا ہے۔ اس کے باوجود آج سہ پہر کے وقت میں طیش میں کیوں آگئی؟ اس وقت کھانے کے کمرے میں بانکا، منظور، فقیر، مستحد، منی بھائی، منیر الزمان، دادا بھائی مرتضیٰ بھائی اور ان کی بیگمات میرے آس پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضرات اس طرف بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

دوپہر کے وقت طبیعت عجیب سی ہوگئی تھی۔ بہت رونا آیا تھا۔ روتے روتے کیسی دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ جذبات بے قابو ہورہے ہیں لیکن اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا۔ بالآخر ہچکیاں لیتے لیتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ غش کھا کر فرش پر گر گئی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے حلق میں دم اٹک رہا ہو۔ شریف دفتر گئے ہوئے تھے۔ امی خوف کے مارے چیخ اٹھیں۔ سانو بھکو، منجو اور ایک اور پڑوسن اکبر کی ماں نے آ کر مجھے سنبھالا۔ اکبر کی ماں نے سر پر تیل پانی مالش کرتے ہوئے بہت خلوص کے ساتھ کہا تھا، "مگ بازار کا پگلا پیر بہت کامل ولی ہے۔ ان کے قدموں میں جا کر گڑگڑانے سے رومی کا مسئلہ حل ہو ہی جائے گا۔ پیر فقیروں پر زندگی میں کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن طے کیا کہ رومی کے لئے پگلا پیر کے پاس ضرور جاؤں گی۔ اگلے روز اکبر کی ماں مجھے ان کے پاس لے جائے گی۔

میری بیماری کا سن کر اور بھی عزیز رشتہ دار دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر اے کے خان نے آتے ہی میرا بلڈ پریشر چیک کیا۔ اب دوسری طرف بیٹھ کر شریف لوگوں سے بات چیت کررہے ہیں۔ اس لمحے گھر میں داخل ہوئے ہیں، عتیق، بلو، چمو، حفیظ، جوبلی۔ میں اچانک کہہ اٹھی، "اچھا، تم لوگ اس گھر میں اتنا کیوں آتے جاتے ہو؟ جانتے نہیں ہو مین روڈ پر بھیس بدل کر آئی بی کے لوگوں نے چوبیس گھنٹے اس مکان کو نظر میں رکھا ہوا ہے۔ تم سب پر مصیبت آئے گی، دیکھ لینا۔"

میرے جذبات مجروح ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ کل رات کے وقت معصوم نے مجھے اکیلا پا کر چپکے چپکے سے کہا، "چچی، چچا نے آپ کو بتانے سے منع کیا ہے لیکن بتائے بغیر رہ نہیں پارہا ہوں۔ چچا کو بھی بید سے

بہت مارا ہے۔ پیٹھ پر نشان پڑ گئے ہیں۔ آپ کسی وقت اچانک پیٹھ دیکھ لیجئے گا پھر ان سے پوچھنا۔ انہیں مت بتایئے گا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔"

مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ شریف کو بید سے مارا ہے اور انہوں نے یہ بات مجھ سے چھپائی ہے۔ اف! کیسے شخص ہیں! کاش سب باتیں مجھے کھول کر بتاتے، میں زخموں پر مرہم لگاتی، مالش کرتی مگر نہیں۔ غور کیا کہ وہاں سے آنے کے بعد سے بالکل بھی قمیض نہیں اتارتے۔ نہانے کے لئے جاتے وقت قمیض پہن کر ہی غسل خانے میں داخل ہوتے ہیں۔

آج صبح سے موقعہ تلاش کر رہی تھی۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ڈریسنگ روم ہے۔ ڈریسنگ روم میں گھس کر قمیض اتار کر باتھ روم جانے والے تھے ایسے وقت میں میں دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ "یہ کیا تمہاری پیٹھ پر نشان کس چیز کے ہیں؟ ذرا دکھانا۔" کہہ کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ اب شریف کے لئے اقرار کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ خان سپاہیوں نے بوٹ سے اس کے سر پر بھی وار کیا تھا جس کی وجہ سے اب تک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سر پر ایک لوہے کی ٹوپی کس دی گئی ہو۔

یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے شریف مجھے اچانک سینے سے لگا کر رو دیئے۔ مجھے تھام کر ہی وہ آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر "رومی، رومی" کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ میں نے زندگی میں کبھی شریف کو روتے نہیں دیکھا تھا آج پہلی مرتبہ وہ رومی کا نام لے کر روئے۔

شریف نے شیو کیا اور غسل سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا۔ پھر دفتر چلے گئے۔ میں ان کے جانے کے بعد بھی سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ شریف کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے مستقل مزاج، پر اعتماد اور ذمہ دار آدمی ہیں۔ ان میں عزت اور ذلت کا احساس بہت شدید ہے۔ خان سپاہیوں کے حیوانی تشدد نے انہیں جسمانی طور پر جتنی تکلیف پہنچائی ہے اس سے زیادہ ان کے ذہن پر اثر ہوا ہے۔ ان چند دنوں تک مجھے صرف احساس غم ہی تھا اب شریف کا احساس ذلت اور جذبہ نفرت بھی میرے دل میں پھیلنے لگا ہے۔

بہت بے چین میں کبھی ایک کمرے میں جاتی کبھی دوسرے میں۔ جامی نے بلا کر کہا، "امی دیکھ جاؤ۔" اس کے کمرے میں جا کر دیکھا۔ جامی گزشتہ کئی روز کے اخبارات دیکھ رہا تھا۔ ایک اخبار اُٹھا کر اس نے کہا، یہ دیکھو۔"

ان چند دنوں میں مجھے اخبارات پڑھنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی اس اخبار پر نظر ڈال کر دیکھا بہت سے مختلف اسلحوں کی ایک بڑی سی تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے:

شہر کے مختلف علاقوں سے اسلحہ ضبط، کئی افراد گرفتار۔

جامی نے کہا، "امی لگتا ہے یہی اسلحہ عالم بھائی لوگوں کے باورچی خانے سے نکلا ہے۔"

اخبار کی اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر میں بہت سی سٹین گنیں، رائفلیں، سٹین گن کے میگزین، پستول، گرینیڈ، مائن، تاروں کا بنڈل اور کئی دوسری چیزیں نظر آ رہی تھیں۔

۳۱ اگست کے روزنامہ پاکستان، پروادیس، پاکستان ابزرور، پاکستان ٹائمز، تمام اخباروں میں اسلحے

کی تصویر چھپی ہے۔تمام اخباروں میں ایک ہی خبر لگی ہے۔''گزشتہ اتوار کی شب شہر کے مختلف علاقوں میں بیک وقت متعدد کامیاب کارروائیاں۔قابل ذکر تعداد میں اسلحہ، گولہ بارود، اور دھماکہ خیز مواد ضبط کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں ملوث کئی افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔

محبِ وطن شہریوں سے حاصل شدہ اطلاعات کی بنیاد پر یہ کارروائیاں بروئے کار لائی گئیں۔

محبِ وطن شہری! یا خدا ان محبِ وطن شہریوں کے لئے تیری پست ترین، سب سے زیادہ ہولناک دوزخ بھی ناکافی ہوگی۔

میرے دل و دماغ میں نفرت اور غصے کی آگ جلنے لگی۔

میں نے جامی سے کہا،''ایک بات کا جواب دو۔صاف صاف جواب، رومی پر کس طرح کا ٹارچر کیا گیا؟''

جامی اچانک چونک کر جیسے گونگا ہو گیا۔میرے دل میں غم، غصہ، خلش، نفرت جھاگ بن کر ابلنے لگا۔

میں نے دوبارہ کہا،''تم لوگوں نے واپس آ کر سب کے بارے میں تو بتایا ہے، بدیع پر کس طرح کا ٹارچر کیا ہے، الطاف محمود کا خون نکلا، حفیظ کی ایک آنکھ گل گئی، بشر کا ہاتھ ٹوٹ گیا، الطاف کے والد، سپن کے والد، شہادت کے بہنوئی، عالم کے چچا سب لوگوں کو ہک کے ساتھ لٹکا کر پیٹا گیا، پیٹھ کے اوپر چڑھ کر کچلا گیا، جویل کی انگلی توڑ دی۔لیکن رومی پر کس طرح کا ٹارچر کیا گیا ہے تم میں سے کسی نے نہیں بتایا۔ابھی بتاؤ مجھے۔''

جامی کہنے لگا،''امی....امی....میری بات سنو.....''

میں نے چیخ کر کہا،''کوئی بات نہیں سنوں گی۔میں جاننا چاہتی ہوں کہ رومی پر کتنا ٹارچر کیا گیا ہے۔بتاؤ تم۔محبِ وطن شہریوں سے اطلاع حاصل کر کے ملٹری نے میرے رومی کو پکڑ کر کتنا ٹارچر کیا ہے جاننا چاہتی ہوں۔''

جامی نے سیدھا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،''بھیا کو ہم نے آخری مرتبہ دیکھا تھا ۳۰ تاریخ دوپہر کے وقت۔پھر اس چھوٹے سے کمرے سے بھیا، بدیع بھائی اور چلو بھائی کو لے گئے تھے۔اس کے بعد بھیا کو دوبارہ نہیں دیکھا۔بھیا کو صبح جب اس چھوٹے کمرے میں لے کر آئے تو بھیا نے پہلے ہم چاروں سے کہا کہ ہم سب لوگ آرمی کے سامنے ایک جیسی بات کریں۔تھوڑی دیر کے بعد بھیا نے ابو کے پاس سے ذرا دور ہٹ کر مجھ سے اکیلے میں بات کی۔اس دوران بھیا نے مجھے بتایا''میں نے صرف پچیس تاریخ کی رات کے بارے میں اقرار کیا ہے۔انہوں نے مجھے بہت مارا ہے دوسروں کا نام اگلوانے کے لئے۔میں نے بدیع کے علاوہ اور کسی کا نام نہیں لیا ہے۔پورے واقعے کی ذمہ داری میں نے اور بدیع نے قبول کی ہے۔''میں نے کہا تھا''بھیا اگر بہت زیادہ ٹارچر کریں تو؟''بھیا نے کہا،''تم تو جانتے ہو میں کتنا سخت جان ہوں''انہیں بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے۔ان لوگوں نے مجھے ذہنی طور پر توڑنے کے لئے اس طریقے سے ٹارچر کیا ہے کہ باہر سے کہیں پر زخم نہیں لگا ہے، خون نہیں بہا ہے لیکن اندر سے یوں لگ رہا ہے کہ سارا کچھ اوپر نیچے ہو گیا ہے! دیکھنا امی کو یہ باتیں مت بتانا۔''امی تم نے زبردستی کی اس لئے میں نے تمہیں بتا دیا، ورنہ بھیا نے منع کیا تھا۔''

میں نے پوری کوشش کر کے مضبوطی سے کہا، مجھے جاننے کی ضرورت تھی۔ڈرو مت مجھے کچھ نہیں ہو

گا۔ ''اٹھ کر رومی کے کمرے میں گئی۔ کتابوں کی الماری کھول کر ایک کتاب نکالی۔ ہینری الیگ کی کتاب ''سوال۔'' رومی نے یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی کچھ روز پہلے۔ کہا تھا، ''امی جس پر ٹارچر کیا جاتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد وہ کچھ بھی فیل نہیں کرتا۔ بعد میں جو لوگ سنتے یا پڑھتے ہیں وہی لوگ زیادہ گھبراتے ہیں۔'' رومی نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مجھ سے، دشمن کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد کس کس طریقے سے ان کا ٹارچر برداشت کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کس طرح ٹارچر برداشت کر کے زبان بند رکھنا ممکن ہوتا ہے۔ اس بارے میں اس نے اپوکرس فائل اور دوسری کچھ کتابیں مجھے پڑھنے کے لئے دی تھیں۔

رومی، رومی، کیا تم واقعی وہ تمام طریقہ کار استعمال کر کے ان کا ٹارچر برداشت کر پا رہے ہو؟ کیا واقعی تھوڑی دیر کے بعد تشدد کا احساس نہیں رہتا ہے؟ میں کس طرح سے کس کے پاس سے تیرا حال معلوم کروں؟

۸ستمبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج صبح دس بجے اکبر کی ماں کے ساتھ پگلا پیر کی رہائش گاہ پر جانے کا پروگرام تھا۔ اکبر کی ماں نے بتایا کہ ان کی طرف جاتے ہوئے ساتھ کچھ لے کر جانے کا رواج ہے۔ کوئی خالی ہاتھ جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں چنانچہ عمیر الدین کو بھیجا ہے، مٹھائی لانے کے لئے۔ اس دوران گزشتہ چند روز کے اخبارات پر نظر دوڑا رہی تھی۔ کل تو جامی کے کہنے پر اخبار دیکھ کر غم و غصے میں رودھو کر شرمناک منظر بپا کر دیا تھا۔

صوبے میں اتنے دنوں کے بعد کوئی سول گورنر فائز کیا گیا ہے۔ گورنر ڈاکٹر ملک کی مسکراتی ہوئی تصویر اخبار میں چھپی ہے۔ نیا فوجی ایڈمنسٹریٹر بھی تعینات کیا گیا ہے، لیفٹننٹ جرنیل اے کے نیازی۔ ایک ساتھ ہی گورنر اور فوجی ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری نبھا کر ٹکا خان بالآخر رخصت ہو گئے ہیں۔ گورنر کا عہدہ سنبھالتے ہی ڈاکٹر ملک نے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی کابینہ کے ارکان کا چناؤ کیا جائے گا۔

فوجی دستے نے اور بھی چند علاقوں میں ریڈ کر کے اسلحہ ضبط کیا ہے۔ نو افراد کو ہلاک اور ایک فرد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ ڈھاکہ سے تین میل کے فاصلے پر نصیر آباد کی بستی میں کسی مکان سے یکم ستمبر کو پاک فوج نے یہ اسلحہ ضبط کیا ہے۔

اس موقع پر بھی محب وطن شہریوں سے حاصل کردہ اطلاع کی بنیاد پر ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کے ایک ٹولے نے مہم چلائی اور جن کو ہلاک کیا وہ ''بھارتی ایجنٹ،، تھے۔ سوچ رہی ہوں کہ کن نومکتی فوجیوں کو انہوں نے مارا ہوگا؟ ان میں سے کسی کو کیا ہم پہچانتے تھے؟ خدا بہتر جانتا ہے۔ معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۳۱ اگست کے پاکستان ٹائمز کی ایک خبر پر نظر رک گئی۔

جنم نا ہیے تو ملک کی خاطر جان دیں۔ بیس سالہ نوجوان پائلٹ راشد منہاس نے پاکستان ایئر فورس کے ایک طیارے کو زبردستی بھارت لے جانے کی کوشش کو ناکام کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی ہے۔

یہ کیسی خبر ہے؟ زبردستی بھارت لے جانے کی کوشش میں جو شخص ملوث تھا اس کا نام کیا ہے؟ ان کا تعارف کیا ہے؟

بعد کی تاریخوں کے اخباروں میں تلاش کرنے لگی۔ تین ستمبر تک راشد منہاس کے شاندار کارنامے کا ذکر ہے۔ جرأت مندی کے لئے اسے سب سے بلند اعزاز نشان حیدر سے نوازا گیا ہے۔ اسے مکمل فوجی وقار کے

ساتھ دفاعی فورس کے لئے مقررہ قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔اس کے والد کا انٹرویو کیا گیا ہے اور اس کے پورے خاندان کا شجرہ نسب بیان کیا گیا ہے لیکن جس آدمی نے طیارہ ہائی جیک کیا اس کا نام تک نہیں ہے!

چار ستمبر کے اخبار میں نام مل گیا۔راشد منہاس کی جرأت، حب الوطنی اور قربانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملے میں بتایا گیا ہے کہ آٹھ سال کا تجربہ رکھنے والے فلائٹ لیفٹننٹ اے کے ایم مطیع الرحمٰن نے طیارہ ہائی جیک کرنے کی کوشش کی۔ نتیجے میں طیارہ تباہ ہوا اور دونوں مارے گئے۔

کون ہے مطیع الرحمٰن؟ کہاں کا باشندہ ہے؟ کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔اس خبر سے ہی ظاہر ہے کہ اپنی سرزمین کی آزادی سے محبت کرنے والے بنگالی پائلٹ نے ایک طیارہ ہائی جیک کر کے بھارت فرار ہونا چاہا تھا۔ بھارت کی آسمانی حدود تک پہنچ بھی گیا تھا مگر بالاخر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔طیارہ تباہ ہو گیا اور دونوں اپنی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ان میں سے ایک کو سب سے بلند اعزاز سے نوازا گیا ہے اور دوسرے کو غدار کہا گیا ہے۔روزنامہ پروادیس میں ''غدار کا نام مطیع الرحمٰن ہے'' اس عنوان سے خبر چھاپی گئی ہے۔

آزادی کا شیدائی جاں باز بنگالی مطیع الرحمٰن غدار ہے؟ اگر کسی روز مشرقی بنگال کی یہ سرزمین کبھی آزاد ہوئی تو اے مطیع الرحمٰن وہ آزاد سرزمین تمہیں یقیناً سب سے بڑے اعزاز سے نوازے گی۔

ایلیفنٹ روڈ کا جو حصہ رمنا تھانہ کے سامنے سے گھوم کر آؤٹ سرکلر روڈ کراس کر کے ولیبرس کالونی کی طرف چلا گیا ہے اس پر جا کر ریلوے لائین کراس کریں تو تھوڑا سا آگے پگلا پیر بابا کی رہائش گاہ ہے۔پہلے شائد ٹین کی چھت اور باڑ کی چار دیواری تھی۔اب سامنے کی طرف کے دو تین کمرے پکے ہو گئے ہیں۔دیکھنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ نیا بنا ہے۔چاروں طرف اینٹیں، سریے بکھرے پڑے ہیں۔ایک کمرے کے اندر سیمنٹ کی بوریوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔پچھلی طرف کے کمروں پر کام جاری ہے۔بابا کے پاس دعا لینے والے مرد اور عورتوں کا رش لگا ہوا ہے۔

اکبر کی ماں نے بتایا ہے کہ بابا بہت کرنی والے ہیں۔دعا پڑھ کر پھونک دیں تو مہلک بیماری بھی پلک جھپکتے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ان کے پاس جو بھی مراد لے کر آؤ پوری ہوتی ہے۔کیبنٹ منسٹر سے بہت بڑے بڑے میجر، کرنل، جرنیل ان کے پاس دعا لینے کے لئے آتے ہیں۔دیکھئے گا وہ آپ کے رومی کی خبر نکال دیں گے۔''

اسی امید سے تو آئی ہوں۔اسی طرح کی امید لے کر راج شاہی کے ڈی آئی جی معمون محمود کی بیگم مشفقہ محمود بھی آئی ہوئی تھیں۔راج شاہی کے ایس پی شاہ عبدالمجید کی بیگم انجمن مجید، چٹاگانگ کے ایس پی شمس الحق کی بیگم محمودہ حق، الطاف محمود کی بیوی جھینو محمود بھی آئی تھیں۔

جھینو محمود کو دیکھ کر میں چونک گئی۔چھوٹی ناٹی سی، گوری گڑیا کی طرح خوبصورت خاتون ہے۔روتے روتے اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ بہت کم سن ہے، دیکھنے میں یوں لگتا ہے جیسے اٹھارہ انیس سال سے زیادہ عمر نہیں ہو گی۔گود میں ڈھائی سال کی بچی ساؤن۔اس چھوٹی سی عمر میں اس کی تقدیر میں اتنا دکھ لکھا تھا؟ جھینو کے ساتھ پگلا بابا کے پاس جھینو کی امی، اس کی چھوٹی بہن سنبل بالله اور چاروں بھائی نوجیل، کھنو، دینو اور

لینو باللہ آئے ہیں۔شریف، جامی اور معصوم کی زبانی ان چاروں بھائیوں کا ذکر پہلے ہی سن چکی ہوں۔

مشفقہ محمود کو پہلے تھوڑا بہت پہچانتی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ ۲۶ مارچ کو اس کے گھر پر ملٹری آ کر معمون محمود کو لے گئی ہے۔وہ جب کے گئے اب تک نہیں لوٹے۔یہی داستان نجمہ مجید اور محمودہ حق کی بھی ہے۔

ان میں سے کسی کو اپنے شوہر کی خیریت نہیں معلوم۔میں نہیں جانتی کہ میرا بیٹا کس حال میں ہے۔پگلا پیر بابا نے سب کو دلاسا دیا ہے۔یہ تمام لوگ زندہ ہیں۔وہ سب کی خیریت معلوم کر لیں گے۔

۵ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

ایک انتہائی حساس اور اہم مسئلے پر فیصلہ کرنے کیلئے شریف اور میں تکرار کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ رومی کو کس طرح چھڑایا جائے۔ اس بارے میں شریف کے یار دوست مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کر رہے تھے۔ بانکا اور فقیر کی رائے یہ تھی کہ کسی بھی قیمت پر رومی کو رہا کرانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بانکا اور فقیر نے تجویز رکھی کہ شریف اگر رومی کی زندگی کی بھیک مانگ کر رحم کی اپیل کرے تو ممکن ہے کہ رومی کو رہائی مل جائے۔ اس کے علاوہ صدر یحییٰ بھی عام معافی کا اعلان کرنے والے ہیں۔ یہ بھی ایک امید افزا بات تھی۔

رومی کے دکھ میں جذباتی ہو کر پہلے تو میں نے کہا کہ ''ایسا ہی کیا جائے۔'' لیکن شریف راضی نہیں ہوئے۔ جس فوجی جنتا کے خلاف رومی نے مکتی کی لڑائی میں شمولیت اختیار کی ہے، اسی حکومت کے سامنے رحم کی اپیل کرنا رومی کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوگا اور ممکن ہے اس کے لئے رومی ہمیں کبھی معاف نہ کر سکے۔ بانکا اور فقیر نے مختلف طریقوں سے شریف کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بیٹے کی زندگی بچانا سب سے اہم فرض ہے۔ رومی جیسا ذہین لڑکا بچ گیا تو ملک کے لئے بھی بہتر ثابت ہوگا لیکن شریف کسی بھی دلیل سے مطمئن نہیں ہوئے۔ جابر حکومت کے سامنے رومی کی زندگی کی بھیک مانگنا، گڑگڑانا رومی کے نظریات کی توہین کرنا ہوگا، رومی کے بلند سر کو جھکانے کے مترادف ہوگا۔ گزشتہ دو راتوں سے شریف سوئے نہیں تھے۔ میں نے ایک مرتبہ کہا، ''تمہاری بات ہی درست ہے، اس ظالم حکومت کے سامنے رحم کی اپیل کرنا ناممکن ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد روتے ہوئے دوبارہ کہا، ''نہیں، نہیں رحم کی اپیل ضرور کرو۔''

اسی طرح کی ذہنی کشمکش میں دو دن دو راتیں گزر گئیں۔ بالآخر شریف نے فیصلہ کیا کہ وہ رحم کی اپیل نہیں کریں گے۔ آنسو بہاتے بہاتے میں نے بھی شریف کے فیصلے کی تائید کی۔ رومی کو چھڑوانے کے لئے دوسرے جتنے حربے ممکن ہوں بروئے کار لائیں گے، مگر رحم کی اپیل ہرگز نہیں کریں گے۔

۶ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

آزاد کی امی سے ملنے کو دل بے چین ہو رہا تھا۔ گزشتہ دنوں فرصت نہیں نکال سکی، آج دن کے گیارہ بجے کے قریب ان کی طرف چلی گئی۔ آزاد کی ماں مجھ سے لپٹ کر روتے روتے بولیں، ہائے بہن، ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ آپ کے رومی کو بھی، سنا ہے، لے گئے ہیں کم بخت۔"

"ہاں آپا، گھر کے تمام لوگوں کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ دو دن دو راتوں کے بعد رومی کے علاوہ باقی لوگ واپس آئے۔"

اس گھر پر سے جیسے طوفان گزر گیا ہو۔ پلنگ ٹوٹا پڑا تھا، لوہے کی الماری کے پٹ پر گولیوں سے سوراخ ہو گئے تھے، دیوار پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے سوکھ کر کتھئی رنگ اختیار کر چکے تھے۔

مختلف سوالات پوچھ کر آزاد کی امی سے پورا واقعہ معلوم کیا۔

۲۹ اگست کی رات کو ان کے گھر پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ بہن کے لڑکے زاہد اور چنچل تو رہتے ہی یہیں تھے، ان کے علاوہ دوسری بہن کا لڑکا ٹنکر اور داماد منور گھومنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جویل، قاضی اور بشر بھی موجود تھے۔ تقدیر خراب تھی کہ اسی رات آزاد کا ایک دوست بھی آیا ہوا تھا جو سکندر حیات خان کے جوائنٹ سیکرٹری اے آر خان کا بیٹا ہے۔

گہری رات کو نیند سے اچانک بیدار ہو کر دیکھا کہ آرمی نے پورے مکان کو گھیر لیا ہے۔ مختلف کمروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھا کہ مکان کے سامنے، دونوں طرف، چھت پر، ہر جگہ فوجی موجود ہیں۔ خیال یہ تھا کہ پچھلی طرف کے تنگ راستے پر، جہاں سے جمعدار داخل ہوتے ہیں، شائد کوئی نہ ہو اور ادھر سے بھاگا جا سکے گا۔ زاہد چاروں ہاتھ پیروں کے بل چل کر بڑی مشکل سے، جمعداروں کے آنے جانے کے لئے بنے چھوٹے سے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے دروازہ کھولا ہی تھا کہ چار پانچ سپاہی اسی راستے سے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے مکان کے اندر آ کر سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ اس طرف سے ملٹری پولیس کے دوسرے سپاہی بھی مکان کے اندر داخل ہو گئے اور پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جویل کی دو انگلیوں پر اس وقت بھی بینڈج بندھی ہوئی تھی۔ کیپٹن نے ان انگلیوں کو پکڑ کر مروڑ کر توڑ دیا۔ جویل "اف، مر گیا!" کہہ کر چیخا اور عین اسی وقت قاضی اچانک کیپٹن پر کود پڑا۔ کیپٹن پلنگ کے اوپر گر پڑا۔ قاضی اس کے اوپر گرا۔ دونوں کے بوجھ سے پلنگ ٹوٹ گیا۔

قاضی کیپٹن کے ہاتھوں سے سٹین گن چھیننے کی کوشش کرتا رہا۔ سپاہی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آجائے گا۔ انہوں نے گھبرا کر اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اس فائرنگ سے زاہد اور ٹگر شدید زخمی ہو گئے۔ کھینچا تانی کے دوران قاضی کی لنگی اتر گئی لیکن وہ اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اسی حالت میں فرار ہو گیا۔

خان سپاہیوں نے قاضی کے فرار ہونے کا غصہ گھر پر موجود دوسرے افراد پر اتارنا شروع کر دیا۔ تشدد کے باعث آزاد کی ناک اور منہ سے خون نکل آیا۔ بشر کا بایاں بازو کلائی اور کہنی کے درمیان سے ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ جویل کی انگلیاں تو پہلے ہی ٹوٹ گئی تھیں اب ناک منہ سے خون بھی آنے لگا۔ منور اور سکندر کی بھی بہت پٹائی ہوئی۔

زاہد اور ٹگر گولیوں سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ انہیں خون میں لت پت چھوڑ کر باقیوں کو دھکیلتے ہوئے خان سپاہی باہر نکال کر لے گئے۔ آنکھوں کے سامنے اس طرح کا عبرت ناک واقعہ پیش آتے ہوئے دیکھ کر آزاد کی امی بہت دیر تک بے ہوش پڑی رہیں۔ جب ہوش آیا تو سحر ہو چکی تھی۔ پورے فرش پر خون بکھرا پڑا تھا۔ دونوں زخمی لڑکے اس وقت بھی بیہوش تھے۔ انہوں نے ساتھ والے مکان میں جا کر میڈیکل کالج ہسپتال میں فون کر کے ایمبولنس بھیجنے کے لئے کہا مگر ایمبولنس نہیں آئی۔ اسی طرح صبح کے آٹھ نو بج گئے۔ تب وہ لاچار ہو کر رکشے پر انٹرکان کے سامنے ٹیکسی سٹینڈ تک پہنچیں اور وہاں سے ایک ٹیکسی لے آئیں۔ زاہد اور ٹگر کو بہت مشکل سے اٹھا کر ٹیکسی میں ڈالا۔ ڈرائیور کو انہوں نے میڈیکل لے جانے کے لئے کہا۔ ڈرائیور نے مشورہ دیا کہ میڈیکل میں لے کر نہ جائیں کیونکہ وہاں پر فوجی بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گولی سے زخمی مریض دیکھا تو اسے غائب کر دیں گے لہٰذا آزاد کی امی زخمی لڑکوں کو لے کر ہولی فیملی ہسپتال چلی گئیں۔

ہالی فیملی میں زاہد اور ٹگر ابھی تک خطرے کی حالت میں ہیں۔ پلنگ جیسے ٹوٹا تھا اسی طرح پڑا ہوا ہے۔ فرش پر خون کے دھبے سوکھ کر سیاہی مائل ہو گئے ہیں۔ انہیں ابھی تک دھو کر صاف نہیں کیا جا سکا۔ کون صاف کرے؟ اکیلی عورت، اپنے بیٹے کے غم میں پریشان ہے۔ دوسری طرف بہن کے دو بیٹے ہسپتال میں موت سے لڑ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے بھاگ دوڑ الگ کرنی پڑتی ہے۔ ان آٹھ دنوں میں ان کا چہرہ بھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ بالوں میں تیل نہیں لگا، کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔ گھر کی طرف، اپنی طرف نظر ڈالنے کے لئے ایک لمحے کی فرصت نہیں ہے۔

آزاد کی ماں نے دریافت کیا، ''رومی کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا آپا؟''

''نہیں آپا، ابھی تک کسی طرف سے کوئی راہ نہیں نکلی۔ پگلا پیر نے امید دلائی ہے کہ رومی نکل آئے گا۔ آپا آپ جائیں گی ان کے پاس؟ بہت کرنی والے پیر ہیں وہ۔ گیخو نمنٹ سے بڑے بڑے جرنیل تک آتے ہیں ان کے پاس۔''

نہیں بہن میرے پیر صاحب جورین میں رہتے ہیں۔ میں گئی تھی ان کے پاس۔ اللہ نے چاہا تو میرا آزاد رہا ہو کر آجائے گا۔ میں نے رمنا تھانے میں آزاد کے ساتھ ملاقات کی ہے۔''

میرا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ ''آزاد سے ملاقات کرنے دی ہے انہوں نے؟'' ''نہیں بہن۔

انہوں نے ملاقات کرنے نہیں دی۔ رات کے وقت رمنا تھانے میں لاکر رکھتے ہیں۔ میرے ایک واقف کار نے سپاہی کو رشوت دے کر کسی طرح سے بندوبست کیا تھا۔ رات کے وقت چھپ کر کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر بات چیت کی ہے۔"

"کیا بات ہوئی؟ آزاد کس حال میں ہے؟"

"ہائے بہن! بہت مارا ہے میرے آزاد کو۔ میں نے کہا" بیٹے کسی کا نام تو نہیں بتایا؟" اس نے کہا، "نہیں ماں نہیں بتایا۔ لیکن ماں اگر اور ماریں؟ ڈر لگتا ہے کہ تشدد برداشت نہ کر پایا اور منہ سے کسی کا نام نکل گیا تو؟ میں نے کہا، بیٹا، جب وہ ماریں تو تم مضبوطی کے ساتھ برداشت کرنا۔"

۷ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز منگل

سہ پہر کے وقت پگلا بابا کے اندر والے کمرے میں بہت اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے لالو، امی، جھیو، سنبل، ان کی امی، مشفقہ محمود، اس کی والدہ، محمودہ حق، نجمہ مجید اور بہت دوسرے لوگ۔ پگلا بابا ساتھ والے کمرے میں مردوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں سب لوگوں کو آزاد کی امی کی بات بتا رہی تھی۔ سن کر تقریباً سب کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ تھوڑی دیر میں سنبل کی ایک بات پر دھچکہ لگا۔ گزشتہ تین روز سے الطاف محمود اور بدیع کو رمنا تھانے میں نہیں لایا جا رہا۔ ان کا پھر کیا بنا؟ میں نے سنبل سے دریافت کیا کہ اس نے کس سے یہ بات سنی ہے؟

''چلو بھائی کی بھابی سے۔''

چلو کی بھابی عشرت بھی پگلا بابا کے پاس آتی ہے۔ اس کے پاس سے ہمیں رمنا تھانہ کے بارے میں ہلکی پھلکی خبریں مل جاتی ہیں۔ چلو کے بھائی کے ساتھ کسی ڈی آئی جی صاحب کی اچھی واقفیت ہے۔ ان کے ذریعے رمنا تھانے کے بارے میں کچھ کچھ خبر چلو کے بھائی اور بھابی کو بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

جھیو مسلسل رو رہی تھی۔ میری امی اسے سینے سے لگا کر تسلیاں دے رہی تھیں۔ میں گم سم بیٹھ کر سوچنے لگی کہ رمنا تھانے میں نہ لانے کا مطلب کیا ہے۔ شریف اور جامی لوگوں نے جب الطاف محمود کو دیکھا تھا اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پھر کیا الطاف محمود فوت ہو گیا ہے یا اسے گولی مار کر ختم کر دیا گیا ہے؟ بدیع کا بھی وہی حشر ہوا ہے کیا؟ جامی نے واپس آنے کے بعد بتایا تھا کہ بدیع بہت بے تاب رہتا تھا۔ بار بار کہتا تھا ''میں مزید بچنا نہیں چاہتا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔'' ایک بار اس نے کمرے کے پلگ پوائنٹ میں انگلی گھسیڑ کر الیکٹرک شاک سے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک اور مرتبہ اس نے اچانک دوڑ لگا دی تھی کہ دوڑتے دیکھ کر فوجی اسے گولی مار دیں لیکن خان سپاہی بہت ہوشیار ہیں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ چاروں جانب سخت پہروں کے بیچ میں دوڑنے کا کیا مقصد ہے۔ گولی چلانے کے بجائے کچھ سپاہیوں نے تین سمت سے آ کر اسے قابو کر لیا تھا۔

رومی کو کبھی رمنا تھانے تک کیوں نہیں لائے؟ لانے سے پھر بھی ہلکی پھلکی خبر معلوم ہو جاتی۔ کہاں پر رکھا ہے اسے؟ کس حالت میں ہوگا، سوچتے ہوئے بھی جسم میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ پگلا بابا امید دلا رہے ہیں کہ جلد ہی وہ رومی کی خبر معلوم کروا دیں گے۔ لیکن کب؟

پگلا بابا اندر کے کمرے میں آئے تو ہم نے ان سے الطاف محمود کے بارے میں دریافت کیا۔ جمیو روتے ہوئے ان کے قدموں میں گر پڑی۔ جمیو کی ماں بھی رونے لگ پڑیں۔ ہم سب لوگ کھوئے ہوئے اپنوں کے بارے میں یاد کر کے رونے لگے۔ پگلا بابا نے سب کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ ''تم لوگ کہاں سے سب غلط سلط، فضول باتیں سن کر ماتم کرنے لگتے ہو! میں بتا رہا ہوں کہ الطاف صحیح سلامت ہے۔ جلد ہی اس کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔ باقی سب لوگ بھی خیریت سے ہیں۔ وقت آنے پر سب کی خبر معلوم ہو جائے گی۔ میں تو کوشش میں لگا ہوا ہوں پوری طرح۔''

۹ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

ہر جمعرات کو پگلا بابا کے ڈیرے پر محفل میلاد ہوتی ہے۔ یہاں پر آج صبح سے پگلا بابا نے رومی، الطاف محمود، معمون محمود، عبدالمجید، شمس الحق، کیپٹن جہانگیر، سب کے لئے قران خوانی شروع کروائی ہے۔ میلاد کے لئے دس سیر امرت لائی ہوں۔ دوسرے لوگ بھی اسی مقدار میں مٹھائیاں لے کر آئے ہیں۔ بعد عصر بہت لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔ پیچھے کی طرف باڑ کا ایک بڑا سا کمرہ ہے، نماز کے لئے جماعت خانہ۔ اس کمرے میں پگلا بابا خود میلاد پڑھاتے ہیں۔ بابا نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے جائے نماز پر بیٹھ کر خلوص دل سے تپسیا کر کے معلوم کیا ہے کہ رومی، الطاف، معمون سب لوگ زندہ ہیں۔ وہ جلد ہی ان سب لوگوں کو چھڑوا لائیں گے۔ ہمیں صرف تھوڑا سا صبر کرنا ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ رکھنا ہوگا۔ پگلا بابا پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

پگلا پیر کی ہدایات کے مطابق ہی چل رہی ہوں۔ ساتھ ہی عزیز رشتہ داروں میں سے جو کوئی بھی جو کچھ کہتا ہے عمل کرتی ہوں۔ ایک صاحب نے کہا کہ رومی کے لئے ایک بکرے کی قربانی دو، جان کا صدقہ۔ ویسا ہی کیا۔ پرسوں بازار سے ایک بکرا لا کر گھر پر قربان کیا گیا۔ اکبر کے والد نے خود ہی اپنے ہاتھ سے بکرا ذبح کیا۔ کچھ گوشت مسکینوں میں تقسیم کیا گیا باقی حصہ یتیم خانے میں بھیج دیا گیا۔ اسی روز دوپہر کے بعد پگلا بابا کے ڈیرے پر ختم کی دعا اور رومی کے لئے مناجات کروائی۔ بابا کے حکم پر سات سیر امرت لے کر گئی تھی۔ دو سیر الگ سے بابا نے دعا پڑھ کر پھونک دی تھی، محلے میں تقسیم کرنے کے لئے۔

ایسٹرن بینک کارپوریشن کے جی ایم امین الرحمٰن صاحب باقاعدگی سے آتے ہیں پگلا پیر کے پاس۔ وہ شریف، فقیر اور منی بھائی کے دوست ہیں۔ ان سے منت کر کے گزشتہ روز پگلا بابا کو گھر پر بلوایا تھا۔ بابا نے گھر پر آ کر دوسری منزل پر رومی کے کمرے میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی۔ سلام پھیرنے کے بعد دو منٹ تک آنکھیں بند کر کے گہری تپسیا میں مگن رہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر انہوں نے کہا، "بالکل مت گھبراؤ۔ وہ خیریت سے ہے۔ جلد ہی اسے نکال لاؤں گا۔"

میلاد ختم ہونے کے بعد زیادہ تر لوگ چلے گئے تھے۔ ہم لوگ بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پگلا بابا نے بیٹھنے کے لئے کہا۔ بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ باقی لوگوں کے چلے جانے کے بعد بابا نے مجھے اور شریف کو بلوا کر بتایا کہ رومی کو نکال لانے کا بندوبست انہوں نے کر لیا ہے۔ جماعت خانے میں انہوں نے ایک پنجابی سرجنٹ

کو بٹھا رکھا تھا۔ اس سے انہوں نے پہلے ہی بات چیت کر لی تھی۔ سرجنٹ نے معلوم کر لیا ہے کہ رومی کو کہاں پر رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں اگر اسے گاڑی پر اٹھا کر کینٹونمنٹ تک لے گئے تو وہ رومی کو نکال کر ہماری گاڑی میں بٹھا دے گا۔ یہ بات کسی اور کو ہرگز نہ بتائیں کیونکہ سب کے لئے اس طرح کا مخصوص انتظام کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ رومی کے لئے ہی انہوں بہت پاپڑ بیلے اور یہ خفیہ انتظام کیا ہے۔

یہ بات اتنی اچانک اور نا قابل یقین تھی کہ سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ حواس بجا ہونے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں بے خودی میں کہہ اٹھی، ''جائیں گے، فوراً جائیں گے۔'' شریف کا تاثر بالکل الٹا تھا۔ اس نے کہا، ''فوراً جانا ممکن نہیں ہے۔ فی الحال تھوڑا سا مسئلہ ہے۔ کل آپ کو بتائیں گے۔'' شریف کے لہجے میں کوئی ایسا اشارہ تھا کہ میں خاموش ہو گئی۔

واپسی پر شریف نے گاڑی میں مجھے سمجھایا کہ اس طرح سے کینٹونمنٹ جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہاں پر داخل ہونے کے بعد پاک فوجی اگر ہم دونوں کو مار کر گاڑی غائب کر دیں تو ہمارے عزیز رشتہ داروں کو قیامت تک معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہمارا کیا بنا۔

۱۱ستمبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

بوجھ اٹھانے والے گدھے کی طرح شب وروز کی اذیت جھیل رہی ہوں۔صبح کے چار پانچ بجے کے قریب پگلا بابا کے ڈیرے پر حاضری دیتے ہیں۔ گھنٹے دو کے بعد واپس آ کر شریف شیو کر کے نہانے کے بعد ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے ہیں۔ میں گھر کے کاموں میں جُت جاتی ہوں۔ لالو کے سر میں شدید درد رہنے لگا ہے، میگرین کا درد۔ پیر بابا نے کہا ہے کہ وہ فجر کی نماز سے پہلے لولو کے سر پر دعا پڑھ کر پھونک دیں گے۔ اسی مقصد سے صبح کے ساڑھے چار پانچ بجے ان کی طرف جانا پڑ رہا ہے۔

گزشتہ روز سے امی اور عطاء بھائی نے مل کر دوسری مرتبہ قرآن ختم کرنا شروع کیا ہے۔ عطاء بھائی پہلے سپارے سے پندرہ سپارے تک اور امی سولہویں سے آخری سپارے تک پڑھیں گی۔ اگلی جمعرات کو وہ قرآن ختم کرلیں گے۔ قرآن ختم کرنے کی آخری دعا پگلا بابے سے پڑھائی جائے گی، ان کے ہاں میلاد کی محفل میں۔

روزانہ اتنے سویرے اٹھنے کی وجہ سے شریف تھک سے گئے ہیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ بارق چلا گیا ہے۔ سہ پہر کو دوبارہ پگلا بابا کے ڈیرے پر جاتی ہوں، مختلف دعائیں، درود اور عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی کے بیچ میں ایک اور بکھیڑا پڑ گیا۔ ڈیڑھ بجے اچانک ابو کا فون آ گیا۔

ابو یعنی پاکستان ایئر فورس کا ونگ کمانڈر محبوب الرحمٰن، وہ تو کراچی میں تھا! اس کا فون ملا تو حیران ہوئی۔ ''تم ڈھاکہ میں کیا کر رہے ہو؟ کب آئے ہو؟''

''گھر پر تو ہو؟ آ کر سب بتاؤں گا۔''

ابو ۴۸۔۱۹۴۴ء کے دوران شریف کے ساتھ شب پور انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا۔ اسی وقت سے ان کی دوستی ہے۔ ابو کی کوئی بڑی بہن نہیں تھی۔ اس نے مجھے باجی بنایا تھا۔ اس کے بعد سے میں اس کے تمام بھائی بہنوں کی باجی ہوں۔

ابو نے گھر پر آ کر ایک حیران کن، ناقابل یقین مگر سچی بات سنائی۔

گزشتہ دو مہینے اور پانچ دنوں تک ڈھاکہ میں فوجی جنتا کی قید میں زندگی گزارتا رہا۔ آج اسے رہا کیا گیا ہے۔ اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے اسے کراچی جانا ہے۔ وہاں پر اس کے بیوی بچے ہیں۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ ابو ڈھاکہ میں ایسٹ ویسٹ کمیونی کیشن نٹ ورک کی مرمت کے کام میں مصروف ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ابو نے

ائیرفورس کے الیکٹریکل انجینئر کی حیثیت سے ڈھاکہ میں ملٹی چینل ریڈیو، ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر لنک نصب کیا تھا۔ ابو کو کراچی میں بتایا گیا تھا کہ ڈھاکہ میں یہ نظام ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا، چونکہ تم نے وہ نصب کیا تھا لہٰذا تمہارے علاوہ دوسرا انجینئر اسے ٹھیک طرح مرمت نہیں کر سکے گا۔

تیج گاؤں ائیرپورٹ پر اترنے کے بعد ابو کو بتایا گیا کہ اسے گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اس کا قصور یہ بتایا گیا کہ اس سال کے اوائل میں اس نے پاکستان کو توڑنے کی سازش کے سلسلے میں قاصد کے ذریعے شیخ کو خفیہ اطلاعات ارسال کی تھیں۔

اس کے بعد ابو پر غیر انسانی تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ائیرپورٹ کی مخالف سمت میں ائیرفورس آفیسرز میس ہے۔ میس کی پچھلی طرف کٹھل بگان میں کسی جگہ پر ابو کو رکھا گیا۔ بیرک کی طرح کے کمرے، ٹین کی چھت، پانچ انچ کی پکی دیواریں، چاروں طرف خاردار تاروں کا احاطہ۔ ابو کو ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا، بالکل تنہا۔ اسے بتایا گیا کہ ''ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکے ہیں۔ کسی بات کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو کچھ جانتے ہو، جو کچھ کیا ہے، صاف صاف بتا دو۔''

تیرہ روز تک تنہا ایک کمرے میں رکھنے کے بعد ایک رات ابو کو نیند سے اٹھا کر دوسری جگہ پر منتقل کیا گیا۔ یہ شیر بنگلہ نگر کا فیلڈ انٹروگیشن یونٹ تھا۔ یہاں پر بھی تیرہ دن گزرے۔ ان تیرہ دنوں میں اسے سونے نہیں دیا گیا، لیٹنے بھی نہیں دیا گیا۔ آنکھوں کے سامنے تیز بتی روشن کر کے مسلسل انٹیروگیشن چلتی رہی۔ سوال پر سوال، بے دریغ سوال۔ کئی گھنٹوں تک سوالات کرنے کے بعد کاغذ اور قلم دے کر کہتے لکھو، جو کچھ جانتے ہو لکھو۔ تحریر پسند نہ آتی تو دوبارہ تشدد کرتے۔ کافی دیر تک تشدد کرنے کے بعد تحریر پھاڑ کر دوبارہ لکھنے کے لئے کہتے۔

اس کے بعد ائیرپورٹ کے مخالف سمت میں صوبائی اسمبلی بلڈنگ کے قریب ایک مکان کے اندر رکھا گیا۔ چند دن تک یہاں پر رکھنے کے بعد دوبارہ کٹھل بگان کی بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ ہر جگہ پر غیر انسانی تشدد کرنے کے بعد بالآخر ابو سے بار بار بیان حاصل کرنے کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔

آج ابو کو رہا کر دیا گیا۔ پہلے وہ اپنے چچا کے گھر پر گیا تھا۔ جا کر دیکھا کہ چچا کے مکان کے گیٹ پر بندوق اٹھائے بہاری چوکیدار پہرا دے رہا ہے۔ چچا محلے کی امن کمیٹی کے ممبر ہیں۔ وہ وہاں پر ایک گھنٹہ بھی نہیں بیٹھا۔ یہاں پر چلا آیا ہے۔

میں نے کہا ''تمہارا چہرہ بالکل مریل ہو گیا ہے۔ خوب ڈنڈے کھائے ہیں؟''

''نہیں۔ میری انہوں نے ڈنڈوں سے بالکل بھی پٹائی نہیں کی۔ سب پر وہ ایک طرح کا ٹارچر نہیں کرتے۔ وہ پرکھ کر دیکھتے ہیں کہ کس میں کس طرح کا حوصلہ ہے۔ کون جلدی گھبرا جاتا ہے، کون نروس ہے، کس کے اعصاب مضبوط ہیں۔ قیدی کی نفسیات کو جانچ کر وہ ٹارچر کی نوعیت میں ردوبدل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک سینئر ملٹری افسر کی حیثیت سے میں جسمانی طور پر سو فیصد فٹ تھا لہٰذا بہت تشدد کے بعد بھی وہ مجھے قابو نہیں کر سکے۔ تم لوگ تو جانتے ہو میں نے ہمیشہ سے یوگا کی ورزشیں کی ہیں۔ ہیڈ سٹینڈ کیا ہے۔''

''ہمیں نہیں معلوم ہوگا تو اور کسے معلوم ہوگا۔ رومی کو ہیڈ سٹینڈ تو تم نے ہی سکھایا ہے۔ رومی نے یوگا کی ورزشیں بھی تمہارے ساتھ ہی شروع کی تھیں۔''

''انہوں نے شروع میں مجھ پر کچھ روائتی سا تشدد کیا لیکن جلد ہی سمجھ گئے کہ اس سے میرا کچھ نہیں بگاڑا جا سکے گا۔ پھر انہوں نے مختلف نوعیت کے ٹارچر کے ذریعے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی۔ پنکھے کے ساتھ پیر باندھ کر سر نیچے کی طرف لٹکا کر رکھا۔ مجھے ہیڈ سٹینڈ کرنے کی عادت تھی، ناک، منہ سے خون نہیں آیا۔ مسلسل تین راتوں تک، ہر مرتبہ تین گھنٹے تک الٹا ٹانگ کر دیکھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے یہ حربہ بھی ترک کر دیا۔ اصل میں ان کا مقصد، کسی بھی طریقے سے مجھے ذہنی طور پر کمزور کر کے اپنی مرضی کا اعتراف نامہ لکھوانا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر رکھا تھا کہ شروع میں جو کچھ کہا ہے آخر تک وہی کچھ کہتا رہوں گا۔ پہلے دن کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا۔ آخر تک وہی کچھ لکھتا رہوں گا۔''

تشدد کے نتیجے میں ابو کی انگلیوں کے جوڑ ہل گئے تھے۔ کمر میں شدید درد تھا۔ آگے کی طرف جھک نہیں سکتا تھا، بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔ بیٹھ جاتا تو اٹھنا مشکل ہو جاتا۔ شریف، جامی اور معصوم نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ان کی گردن اور کمر میں بھی شدید درد ہے۔ بیٹھتے وقت ان کے گھٹنوں میں اور مٹھی بند کرتے وقت ان کی انگلیوں کے جوڑوں میں شدید درد ہوتا ہے۔

ایک سوال بہت دیر تک زبان پر آ رہا تھا مگر بار بار جھجک محسوس کر رہی تھی۔ بالآخر پوچھ ہی لیا، ''کیا ایسا بھی کوئی ٹارچر ہے جس سے جسم کے باہر کہیں پر زخم نہ لگے، چوٹ نظر نہ آئے لیکن اندر سے سب کچھ چور چور ہو جائے؟''

یقیناً ہے بلکہ بہت طرح کے ہیں۔ جیسے ایک ہے سوکنگ، جرابوں کے اندر ریت بھر کر مارنے سے جسم پر کوئی نشان نہیں پڑتا لیکن درد کے مارے پورے جسم کے ماس.....''

جامی چیخ پڑا، ''امی پھر سے؟ ماموں پلیز مت بتایئے۔ امی ساری باتیں سنیں گی اور پھر روتے روتے بیہوش ہو جائیں گی۔''

۱۲ستمبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

دل بہت اداس ہے۔ ابو گھر سے گیارہ بجے کے قریب ائیر پورٹ جانے کے لئے نکلا۔ صبح اسے پراٹھے، بھنا ہوا گوشت، انڈے اور مٹھائی کے ساتھ، جس حد تک ہو سکا بھاری ناشتہ کرایا۔ کراچی کا طیارہ کتنے بجے روانہ ہوگا ابو کو معلوم نہیں تھا۔ اس کو ہدایت دی گئی تھی کہ بارہ بجے تک تیج گاؤں ائیر پورٹ پہنچ جائے۔

گزشتہ روز سہ پہر کے وقت ابو کو پگلا پیر کے پاس لے گئی تھی۔ پہلے ہی ابو کو کہہ دیا تھا کہ بابا جی کے پیروں میں پچاس روپے کا نوٹ ڈال کر سلام کرے۔ بابا جی نے ابو کی بہت خاطر کی۔ بات چیت کی، دعا دی، کمر پر پھونکا۔

کل رات کو پہلے تو نچلی منزل میں ڈرائنگ روم کی چوکی پر ابو کے لئے بستر بنا دیا تھا پھر محسوس کیا کہ نچلی منزل میں اکیلا رہنا ابو کے لئے راحت کا باعث نہیں ہوگا چنانچہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ پلنگ کے اوپر شریف اور ابو نے سونا تھا۔ میں فرش پر گدہ ڈال کر لیٹ گئی لیکن خاص نیند نہیں آئی۔ بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھی، قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر لیٹ کر دوبارہ بات چیت شروع کر دی۔ سحر کے وقت تھوڑی دیر کے لئے سو گئے۔

صرف بیس گھنٹوں کے لئے آ کر ہماری دکھوں سے بوجھل زندگی میں تھوڑی سی ہل چل پیدا کر کے ابو چلا گیا، اپنی نامعلوم، غیر واضح تقدیر کی راہوں پر۔ کون جانتا ہے کراچی میں اس کے لئے کون سی مصیبت انتظار کر رہی ہے؟ ہم لوگ نہیں جانتے آنے والے دنوں میں ہمارے لئے کون سی مصیبت انتظار کر رہی ہے۔

۱۳ستمبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

رومی کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ روزانہ پگلا بابا کے پاس جاتی ہوں۔ ان کے پیروں میں گر کر روتی ہوں۔ وہ زیادہ تر خاموشی سے مراقبے میں بیٹھے رہتے ہیں، کوئی بات نہیں کرتے۔ زیادہ اصرار کرنے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم سب لوگ پگلا پیر کے آستانے میں آس لگا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں، امی، لالو، مشفقہ محمود، اس کی امی، جھیو محمود، سنبل باللہ، ان کے چاروں بھائی، ان کی امی، نجمہ مجید اور محمودہ حق سب آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ چٹاگانگ انٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر نجم الحق کی بیگم، باریسال کے اے ڈی سی عزیز الاسلام کی بیگم، کومیلا کے ڈی سی شمس الحق خان کی بیگم، راجشاہی ریڈیو کے سینئر انجینئر محسن علی کی بیگم، چٹاگانگ چیف پلاننگ آفیسر ریلوے شفیع احمد کی بیگم، فیروز پور کے ایس ڈی او فرید الرحمٰن احمد کی بیگم، کومیلا کینٹونمنٹ کے ۴۰ فلڈ ایمبولنس کے سی او لیفٹیننٹ کرنل جہانگیر کی بیگم، کومیلا کنٹونمنٹ کے فلڈ ایلیجنس میجر انوار السلام کی بیگم کے علاوہ اسی طرح کے اور بہت سے لوگ۔ ان سب کے شوہر لاپتہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی درد بھری کہانیاں سنتے ہیں، روتے ہیں، دعا درود پڑھتے ہیں اور پھر آپس میں دکھوں کی باتیں کرتے ہیں۔ اتنے لوگ آتے ہیں پگلا پیر کے پاس! حیرت ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش بھر میں تقدیر کے ہاتھوں ڈسے ہوئے جتنے لوگ ہیں تمام کے تمام لوگ گویا ان کے پاس آتے ہیں! اتنے سارے لوگ اپنوں کو کھونے کے غم میں نڈھال ہیں۔ ان کے بیچ میں بیٹھ کر اولاد کا دکھ ذرا کم ہو جاتا ہے۔ ایک طرح سے دکھ بٹ جاتا ہے۔ سب کے ساتھ روحانی قربت محسوس ہوتی ہے، لگتا ہے ہم سب ایک کنبے کے افراد ہیں۔

پی ایس پی آوال صاحب پہلے سے ہمارے واقف کار ہیں۔ وہ آتے ہیں اپنی بیگم، چھوٹے بچے اور بچی کو ساتھ لے کر۔ میں جانتی ہوں کہ ان کے تین بڑے لڑکے مکتی باہنی میں ہیں لیکن ہم بھولے سے بھی ان کی بات نہیں کرتے۔ الطاف کے والد عزیز الصمد صاحب کے رہا ہونے کے بعد صادقہ صمد آپا ان کو لے کر پگلا پیر کے پاس آئی تھیں۔ ہم نے ان کی خیریت معلوم کی لیکن الطاف، اشفاق کیسے ہیں، ایک مرتبہ بھی دریافت نہیں کیا۔ ڈر لگتا ہے کہ سرگوشی میں پوچھنے سے بھی شائد دیواریں سن لیں۔ اشارے میں معلوم کرنے سے بھی شائد آسمان دیکھ لے گا۔ پگلا بابے کے پاس باقاعدگی سے آتے ہیں۔ مشہور گائک عبدالعلیم، بیدار الدین احمد کے علاوہ بہت سے دوسرے فنکار۔ صرف تقدیر کے ہاتھوں ڈسے ہوئے لوگ ہی نہیں آتے۔ تقدیر کے منڈپ پر بھینٹ چڑھنے سے

بچنے کے مقصد سے دعا لینے کے لئے بھی بہت سے لوگ آتے ہیں۔

فقیر پگلا پیر سے خوش نہیں ہے۔اس نے ہم لوگوں کے پگلا پیر کے پاس جانے کا سن کر پہلے دن اظہار خیال کیا تھا کہ بہت ''مہنگے'' پیر کے پاس گئے ہیں!'' اس کا دوست امین الاسلام باقاعدگی سے پگلا پیر کے پاس جاتا ہے، یہ بات بھی فقیر کو پسند نہیں۔اس موضوع پر اکثر وہ امین الاسلام کے ساتھ بحث کرتا ہے۔فقیر کو پورا یقین ہے کہ پگلا پیر پاک آرمی کا جاسوس ہے۔اس روز پنجابی سرجنٹ کے ساتھ اس نے ہمیں کیٹونمنٹ بھیجنے کی جو تجویز پیش کی تھی وہ بھی اس کا فریب تھا۔اصل مقصد تھا ہم لوگوں کو شیر کے پنجرے میں ڈالنا۔لیکن امین الاسلام اور ہم میں سے کسی نے بھی فقیر کی باتوں کی پروا نہیں کی۔ پگلا پیر پر یقین بھی نہیں کھویا۔

شریف کے ایک اور دوست آغا یوسف پہلے جب آرمی میں تھے، اس وقت موجودہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر لیفٹننٹ جرنیل نیازی ان کے پاس ہوتے تھے۔اس وقت نیازی کے ساتھ آغا کے اچھے تعلقات تھے۔ آغا یوسف بہت عرصہ پہلے آرمی سے ریٹائر ہو گئے تھے۔اب آئی بی بی کے چیئرمین ہیں۔لیفٹننٹ جرنیل نیازی کی ڈھاکہ آمد کے کچھ ہی دنوں کے اندر آغا یوسف نے اس سے رابطہ قائم کر کے اپنے گھر چائے پر بلایا تھا۔شریف اور فقیر نے مل کر ان سے درخواست کی ہے کہ نیازی سے کہہ کر رومی کے بارے میں معلوم کروائیں۔

۱۸ستمبر ۱۹۷۱ء بروز منگل

خون خشک کرنے والی ایک افواہ گردش کررہی ہے کہ چار ستمبر کی رات کو بہت سے مکتی سپاہیوں کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا ہے۔ پانچ ستمبر کو صدر یحییٰ نے عام معافی کا جو اعلان کیا ہے اس بارے میں فوج کے اندر اختلاف رائے موجود ہے۔ ایک ٹولے کا خیال ہے کہ یہ سارے ''سرکش غدار'' ہیں، معافی کے ہرگز قابل نہیں ہیں۔ ان کو معاف کر کے رہا کرنا ملک کے لئے نقصان دہ ہوگا لہٰذا صدر کے عام معافی کے اعلان سے پہلے راتوں رات ایک سو کے قریب ''غداروں'' کو گولی مار کر ختم کردیا گیا ہے۔

یہ افواہ سننے کے بعد ہم سب دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ خبر کی تصدیق کی کوشش کرتے رہے۔ سنبل نے جو کہا تھا کہ چار ستمبر کی رات سے الطاف محمود کو رمنا تھانے میں نہیں لایا جارہا ہے، اس بات کا تعلق کیا اس افواہ سے ہے؟ کیا واقعی چار ستمبر کی رات کو الطاف، بدیع، جوئل، آزاد، رومی.....؟

آزاد کی امی کے پاس گئی۔ انہوں نے بتایا کہ آزاد کے پکڑے جانے کے بعد صرف پہلے ہفتے کے دوران ہی آزاد سے بات ہوسکی ہے اور وہ بھی صرف دو مرتبہ۔ رات کے اندھیرے میں رمنا تھانے کی کھڑکی کے باہر کھڑے رہ کر بات ہوئی تھی اس کے بعد سے کوئی موقع نہیں ملا۔ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ آزاد کو اب بھی رمنا تھانے میں لایا جاتا ہے یا نہیں۔

چلو کی بھابی عشرت بھی کوئی بات نہیں بتا سکی۔ جو صاحب کچھ روز تک تھوڑی بہت خبر لاتے رہے تھے، انہیں بھی بہت مصیبت سر لے کر معلومات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اسی چکر میں شائد وہ خود بھی کسی مشکل میں نہ پھنس گئے ہوں۔

کیا کروں؟ کس کے پاس جاؤں؟ آغا یوسف صاحب نے امید دلائی ہے کہ وہ رومی کی رہائی کے لئے کوشش کریں گے لیکن ان کی دشواری یہ ہے کہ نیازی خود سے اگر انہیں چائے پر مدعو نہ کریں تو خود ان کے لئے نیازی سے رابطہ کرنا ممکن نہیں۔ صرف رومی کی ہی نہیں، احد صاحب اور سید الحسن کی خبر معلوم کرنے کے لئے بھی ان سے درخواست کی تھی۔

پگلا بابا مسلسل ایک ہی بات کہتے جارہے ہیں کہ وہ افواہ درست نہیں ہے۔ وہ سب لوگ زندہ ہیں لیکن پگلا بابا کی باتوں پر سو فیصد یقین کرنے پر اب دل آمادہ نہیں ہوتا۔ پگلا بابا کے پاس جاتو رہی ہوں لیکن دل

کے اندر سے کبھی کبھی ایک آواز اٹھتی ہے کہ رومی نہیں ہے، الطاف نہیں ہے، جوئل نہیں ہے۔ بدیع، بشر، حفیظ نہیں ہیں، آزاد نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، ان میں سے کوئی نہیں ہے۔

رومی نہیں ہے؟ اتنی سی عمر میں، جب دنیا کے روپ، رنگ، رس کا ذائقہ چکھنے کے لئے ابھی صرف ابتدا ہی کر رہا تھا، اسی وقت وہ نہیں ہے؟ ستمبر کی دو تاریخ سے الگن انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں اس کی کلاسیں شروع ہونا تھیں، کلاس میں جانے کی بجائے چار ستمبر کو وہ کہاں چلا گیا ہے؟

یاد آیا کہ ڈائننگ روم کی چوکی پر بیٹھ کر صرف چند روز پہلے، ۲۸ اگست کو اس نے کہا تھا کہ اگر میں چلا بھی گیا تو دل میں کوئی خلش لے کر نہیں جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے پوری زندگی کو تم لوگوں کی طرح سے نہ جان سکوں لیکن زندگی کی جتنی شیرینیاں اور تلخیاں ہیں ان سب کا ذائقہ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔

اس روز اس اداس سہ پہر کو رومی نے چوکی کے سامنے فرش پر ٹہلتے ہوئے اپنی زندگی کے پہلے اور آخری عشق کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ہجر، وصال اور جدائی کی ان کہی داستان تھی۔

ایک انتہائی خوبصورت لڑکی، یونیورسٹی میں اس سے ایک دو کلاس آگے پڑھتی تھی۔ اس لڑکی نے ہاتھ پکڑ کر اسے الفت کی لذت اور جدائی کے درد سے آشنا کیا تھا۔ بالآخر اس لڑکی نے اسے فریب ہی دیا تھا، رومی کو بہت صدمہ بھی پہنچا تھا لیکن بعد میں اسے اس لڑکی سے کوئی شکائت نہیں رہی کیونکہ وہ لڑکی اس کے لئے گوشت پوشت کی کوئی انسان نہیں تھی بلکہ وہ رومی کے دل کے آئینے میں پاکیزہ محبت کی علامت بن چکی تھی۔

اس روز کمرے کے اِس کونے سے اُس کونے تک ٹہلتے ہوئے رومی نے رابندر ناتھ ٹھاکر کی نظم کا ایک ٹکڑا سنایا تھا۔

حاصل جو کچھ ہوا ہے
جو کچھ گزر گیا ہے
چلتے ہوئے جو کچھ پیچھے کو رہ گیا ہے۔
وہ جوہر جو چمکا ہے
وہ درد جو چبھا ہے سینے میں
سائے کی طرح افق پر جو زوال پذیر ہوا ہے
دولت زندگی ہے سب نہیں کوئی متروک
ادنیٰ ہو جتنا بے شک، گرد میں اٹا ہوا
تکمیل کے مراحل ہیں سہل ان کے مول پر۔

۱۹ستمبر۱۹۷۱ء بروز جمعہ

دیبا ٹٹو کو لے کر اگلے روز کراچی جا رہی ہے۔ منی بھائی کے ساتھ والے مکان کے پڑوسی لفٹیننٹ کرنل قریشی کی حرکات وسکنات دن بدن تشویشناک ہوتی جا رہی ہیں۔ بھلے مانس کی پڑوسی کے ساتھ خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کی کوششیں حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہیں۔ منی بھائی کے گھر کے تمام افراد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری جیسے ان کے کندھوں پر عائد ہوگئی ہو۔ دونوں مکانوں کے درمیان کی دیوار خاصی نیچی ہے۔ وہ صاحب سہ پہر کے بعد لان میں تو بیٹھتے ہی ہیں، اس طرف منی بھائی لوگوں میں سے کوئی باہر نکلے تو وہ دیوار کے قریب آ کر چیخ کر پاس بلا لیتے ہیں اور خوش گپیاں شروع کر دیتے ہیں۔ منی بھائی لوگوں کے گھر پر کوئی مہمان آئے تو تھوڑی دیر کے اندر قریشی بھی گپ شپ کرنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ ظہیر، ٹٹو اور شوجن، دیبا اور منی بھائی کے تینوں لڑکے جیسے ان کی بھی آنکھ کا تارا ہوں۔ ان لڑکوں کی خبرداری کے ولولے نے منی بھائی اور دیبا کی آنکھوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ مارچ۔ اپریل کے دوران رومی اور جامی سمیت ان کی طرف آنا جانا کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان ہی دنوں قریشی صاحب سے ہمارا بھی تعارف ہوا تھا۔ غداروں اور فتنہ گروں کی وجہ سے ٹٹو امتحان نہیں دے سکا۔ کراچی میں نومبر سے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ منی بھائی کے بزنس پارٹنر چونکہ کراچی میں موجود ہیں لہٰذا بچے کو کراچی بھیجنا ہی عقلمندی کا کام ہوگا۔ قریشی کے ان دردمندانہ مشوروں سے منی بھائی لاچار ہو کر رہ گئے ہیں۔

بالآخر ٹٹو کو کراچی لے جانے کا ہی فیصلہ کیا گیا ہے۔ دیبا کل اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

فقیر نے کہا، ''ملک کے وزیروں کی حالت تو پلپلی ہے۔''

جامی نے ہنس کر کہا، ''انکل آپ بھی دیکھ رہے ہیں ''الٹی میٹم'' کے لہجے میں بات کرتے ہیں۔''

فقیر بھی ہنسے۔ ''صرف میں کیوں بیٹے! ڈھاکہ میں آج کل تقریباً ہر شخص اسی لہجے میں بات چیت کر رہا ہے، اف! بنگلہ زبان.....''

فقیر کے منہ کی بات شریف نے مکمل کی، ''.....کو وسعت دے دی ہے۔''

سنا ہے آج دوپہر کے وقت میڈیکل کالج ہسپتال کے سامنے وزیر مولانا محمد اسحاق کی گاڑی پر ''مکتیوں'' نے بم پھینکا ہے۔ وزیر صاحب کے ہاتھ اور پیر دونوں زخمی ہو گئے ہیں گاڑی کا ڈرائیور اور دو اور سواریاں بھی زخمی ہوئی ہیں۔ یہ خبر بھی فقیر ہی لے کر آئے ہیں۔ ۲۹ اور ۳۰ اگست کے دوران بہت سارے مکتی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے، تب سے ڈھاکہ شہر مریل ہوا پڑا تھا۔ اب جیسے دوبارہ ہوش میں آ کر ہل جل اٹھا ہے۔ دس تاریخ کو ''باشابو'' کے علاقے میں مکتی فوجیوں کے ایک ٹولے کی، ''قدم تلی'' پولیس سٹیشن کی پولیس اور رضا کاروں کے ساتھ، بڑی جھڑپ ہوئی ہے۔ مکتی فوجیوں نے دریا کے اس پار سے آ کر پولیس سٹیشن کا محاصرہ کر لیا اور کافی سارے سپاہی اور رضا کار مار دیئے۔ اس کے بعد دھڑلے سے واپس چلے گئے۔ یہ خبر ہمارے کانوں تک پہنچنے میں ذرا دیر لگی۔ اپنے ہی غم میں ہم بہت مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سننے کے بعد دوبارہ ذرا تازہ دم ہوئے ہیں۔

شریف نے کہا، ''اچھا، اخبار میں پڑھا تھا کہ شیخ صاحب کا مقدمہ ختم ہو گیا ہے۔ فوجی عدالت جلد ہی صدر کے پاس رپورٹ ارسال کرے گی۔ تمہارے خیال میں کیا نتیجہ نکلے گا؟''

فقیر نے کہا، ''کیا بتاؤں؟ سر پیر کا تو اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ شیخ صاحب کو اب تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہی مجھے کسی غیبی قوت کا کرشمہ لگتا ہے۔''

شریف نے کہا، ''مجھے لگتا ہے شیخ کو مارنے جتنا جگرا ان میں نہیں ہے۔ ویسے بھی اب ان کی حالت پلپلی ہے۔ اس وقت شیخ کو مارنے سے اور بھی گہرے کنویں میں گریں گے، اتنی سوجھ بوجھ تو ان میں ہے۔''

۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج سے تیس روز قبل وہ میرے رومی کو لے گئے تھے۔ ان تیس دنوں میں کسی کے پاس سے رومی کی کوئی خبر نہیں ملی۔

دوسروں کی بھی کوئی خبر نہیں ہے۔ پگلا پیر اگرچہ مسلسل بہت اعتماد کے ساتھ دلاسا دیئے جا رہے ہیں کہ وہ سب لوگ زندہ ہیں لیکن پھر بھی الطاف، بدیع، جوئل، بشر، حفیظ، معمون، مجید، شمس الحق، جہانگیر، کسی کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔

صوفیہ کمال آپا کے گھر پر آئی ہوں۔ جمیو نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہیں۔ صوفیہ کمال آپا بلند آواز میں رو نہیں سکیں۔ گہرا سانس چھوڑ کر جس طرح سے بات کرتی ہیں، یوں لگتا ہے کہ ان کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو لیتیں۔ اس سے شائد انہیں تکلیف کم ہوتی۔ مجھے سینے سے لگا کر وہ مسلسل کہتی جا رہی ہیں، ''ابھی تو بس پچھلے ہی سال..... ہم لوگ باریسال امداد تقسیم کرنے کے لئے گئے تھے۔ رومی نے مجھ سے کہا تھا خالہ آپ ذرا امی سے کہیے، امی مجھے جانے نہیں دیتیں..... میں نے تجھ سے کہا۔ تو نے کہا آپا آپ کے ساتھ جائے گا، مجھے اعتراض کس بات کا ہوگا؟ وہ تو آپ کا بھی بیٹا ہے۔ ہائے! میرا بیٹا! کس پیار سے تو نے اسے تراشا تھا، جب بھی آتا، چپکے سے پیچھے سے گردن سے لپٹ جاتا، رخسار چومتا۔ میلہ گھر سے واپس آتے ہی میرے پاس آیا تھا۔ لولو، ٹولو کی ساری خبریں مجھے سنا گیا اور وہ الطاف..... ہائے! چاند کا ٹکڑا تھا وہ لڑکا..... میں نے تو خود ہی جمیو کے ساتھ اس کی شادی طے کی تھی..... وہ بھی مجھے روتا چھوڑ کر جانے کہاں چلا گیا؟..... اور علوی..... ہائے! علوی جب میرے پاس آیا تو اس کے پورے جسم پر خون تھا، دبلا، بیمار سا لڑکا، کس قدر مارا تھا اسے..... میرے پیارے ہیرے کے ٹکڑوں کو وہ ظالم اس طرح سے تباہ کر رہے ہیں۔''

میں نے آپا کا سر اپنے سینے میں چھپا کر کہا، ''آپا چپ کیجئے۔ ذرا اطمینان سے بیٹھئے۔''

''میں تو اطمینان سے ہی بیٹھی ہوں بھئی۔ دیکھ نہیں رہی کس طرح سینے پر پتھر رکھ کر بیٹھی ہوئی ہوں۔ کھانا پکا رہی ہوں، گھر کی دیکھ بھال کر رہی ہوں، کھا پی رہی ہوں، سو رہی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کتنے سکون سے بیٹھوں؟''

''علوی کب آیا تھا آپ کے پاس؟''

''جس روز رہا ہوا اسی دن رات کو، رانا لے کر آیا تھا۔ رانا کو پہچانتی ہو؟ لطف الرحمٰن کا لڑکا..... لطف

الرحمٰن، شاعر غلام مصطفیٰ صاحب کا چھوٹا داماد۔"

"پہچانتی ہوں۔ وہی تو نوحیل، علوی لوگوں کو اسمبلی ہاؤس کے سامنے والی سڑک پر سے اٹھا کر لائے تھے۔

صوفیہ کمال آپا سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میں نے کہا، "نوحیل لوگ چاروں بھائی اور علوی جس روز رہا ہوئے، ایم پی اے ہاسٹل کے گیٹ سے مین روڈ تک پیدل آئے۔ اس کے بعد اسمبلی ہاؤس کے سامنے مٹی کا جو ڈھیر ہے اس پر وہ پانچوں بیٹھے تھے۔ ان کا جسم اتنا کمزور تھا کہ مزید چل نہیں پا رہے تھے۔ اس وقت اس سڑک پر سے لطف الرحمٰن صاحب گاڑی میں جا رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو پانچوں کو گاڑی پر بٹھایا اور گھر لے آئے۔ نوحیل لوگوں کی زبانی سنا ہے یہ واقعہ۔ ان کے ساتھ روزانہ پگلا پیر کے ہاں ملاقات ہوتی ہے۔ علوی اب کیسا ہے؟ دوبارہ ملاقات ہوئی ہے آپ کے ساتھ؟"

"ہاں بعد میں بھی دو مرتبہ آیا تھا۔ وہ شائد اتنے دنوں میں دوبارہ میلہ گھر چلا گیا ہوگا۔ اس کے کچھ فنکار دوست، دلاور، کبیر تھے، ان لوگوں نے اسے اپنے گھر میں چھپا کے رکھا اور اس کا علاج کروایا۔ میں نے علوی کے ساتھ غیاث کا رابطہ کرا دیا تھا۔ غیاث کا چھوٹا بھائی ڈاکٹر رشید الدین، اس پار جانا چاہتا ہے۔ طے پایا ہے کہ علوی اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ لگتا ہے اب تک تو وہ جا چکے ہوں گے۔"

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

امی نے کہا، ''رومی کے نام پر ایک اور صدقہ دے دو۔'' میں نے کہا اس مرتبہ پھر ایک گائے منگوا لیتے ہیں۔ رومی کے ساتھ الطاف، بدیع، جوئل کے نام پر بھی قربانی کر دیں گے۔''

ایک گائے خرید کر لائی گئی۔ سلیم اللہ یتیم خانہ قریب ہی ہے، عظیم پور میں۔ وہاں پر لے جا کر قربانی کی جائے گی۔ گائے لے کر عمیر الدین ڈرائیور اور ایک چپڑاسی پیدل روانہ ہو گئے۔ انہیں اچھی طرح سے سمجھا دیا گیا تھا کہ رستے میں اگر کوئی فوجی سوال کرے کہ گائے کہاں پر اور کس لئے لے کر جا رہے ہو، تو صرف اتنا کہنا کہ یتیم خانے میں لے کر جا رہے ہیں۔ قربانی کا ذکر ہرگز نہ کرنا۔ کہنا محمد پور سے آ رہے ہیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد معصوم کے ہاتھ رومی، الطاف، بدیع، جوئل، آزاد، بشر اور حفیظ کے نام لکھا ہوا رقعہ بھیج دیا۔ اس کو یہ بھی کہہ دیا کہ ہرگز نہ بتانا کہ یہ گائے کس مکان سے آئی ہے۔

معصوم نے کہا، ''اس سے تو کام نہیں بنے گا۔ ان کی کاپی پر پتہ درج کروانا پڑتا ہے۔''

''پھر جو بھی ہو، کوئی فرضی پتہ لکھوا دینا۔ محمد پور کا ہی بتا دینا اور امام صاحب سے کہنا کہ قربانی کے بعد گوشت پکا کر یتیموں کو کھلا دیں۔ چاروں طرف نظر ڈال کر دیکھ لینا کہیں پر کوئی فوجی تو نہیں کھڑا ہے۔ قربانی ہوتے ساتھ ہی کھسک آنا اور پہنچتے ہی عمیر الدین کو بھیج دینا۔''

ملٹری کے شبہات سے بچنے کے لئے اتنی احتیاط کی تھی۔ مکتی باہنی کے نام پر قربانی کرنے کے جرم میں کہیں ہمیں پھر سے پکڑ کر نہ لے جائیں۔

بوڑھے میاں کو اطلاع بھیج کر پھر سے بلوایا ہے۔ گھر پر چوبیس گھنٹے رہنے کے لئے کام کا آدمی چاہئے۔ امی اور لالو کتنے دن تک اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں پر رہ سکتے ہیں؟ آگے روزے آ رہے ہیں۔

بوڑھے میاں گزشتہ سولہ سال سے ہمارے گھر پر باورچی کا کام کر رہے تھے۔ السر کی وجہ سے اسی سال جنوری میں اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ باورچی کا کام کرنے کے باوجود بوڑھے میاں بہت رعب دار شخصیت کے مالک ہیں۔ بوڑھے میاں کے آنے سے میں نے سکون کا سانس لیا۔ پورا گھر اُن پر چھوڑ کر کسی بھی وقت، کہیں پر بھی بے فکری سے جایا جا سکے گا حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر فرار بھی ہوا جا سکے گا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز منگل

کل شب برات تھی۔ گزشتہ رات شریف نے ۱۴۰ رکعات نماز ادا کی۔ اس کے علاوہ دعا، درود بھی پڑھا، ذرا بھی نہیں سوئے۔ امی اور جامی نے بھی تقریباً ساری رات جاگ کر گزاری۔ بیچ میں دو تین گھنٹوں کے لئے سوئے ہوں گے۔ میں سب سے کم جاگی۔ بہت کمزوری ہے۔ آدھی رات کے بعد سر چکرانے لگا۔ امی نے زبردستی سلا دیا۔

آج حلوا روٹی پکانے میں گذشتہ سالوں کی طرح اتنا اہتمام نہیں کیا۔ سادہ آٹے کی روٹی، سوجی کا حلوا اور بڑا گوشت پکایا ہے۔ مقدار میں بھی پچھلے سالوں کی نسبت بہت زیادہ۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ مسکینوں کو کھلایا جا سکے۔ میرے علاوہ گھر تمام افراد نے روزہ رکھا ہے۔

میز پر افطاری لگا رہی تھی۔ شریف، جامی، معصوم باری باری وضو کر کے میز پر اکٹھے ہو رہے تھے کہ اچانک دھماکے کی آواز آئی۔ کافی دور سے آواز آئی لیکن پھر بھی پورا جسم کانپ گیا۔ بہت جانی پہچانی سی آواز تھی لیکن گزشتہ ایک ماہ سے بہت کم سنی ہے۔ آج کا دھماکہ بہت زوردار ہے۔

چہرے پر مسکراہٹ لے کر شریف میز پر آ کر بیٹھے۔ آہستہ سے کہا، ''سنا ہے؟''

''سنا تو ہے، لگتا ہے بہت دور سے آواز آئی ہے۔''

''اب سے نزدیک بھی سنو گی۔''

''اس کا مطلب؟''

''نیا گروہ آیا ہے۔''

امی اور لالو باورچی خانے میں تھے۔ دیکھا کہ دونوں ہاتھوں میں کھانے کے برتن اٹھا کر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کو آتے دیکھ کر شریف خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد کئی گھنٹوں تک اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پڑوس سے حلوا روٹی آ رہا ہے۔ دروازے پر مسکینوں کی بھیڑ، ان میں حلوا روٹی تقسیم کرنا، اتنے میں دادا بھئی اور مرتضیٰ ناشتہ دانی بھر کر حلوا روٹی لے آئے۔ ان کے آتے ہی شریف ان کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات کا وقت ہو جائے تو باقی تمام کام بند، جو جہاں پر بھی ہو، ریڈیو لے کر ضرور بیٹھتا ہے۔

رات کوسونے کی تیاری کرتے ہوئے شریف نے بتایا کہ میلہ گھر سے گوریلوں کا نیا ٹولہ آیا ہے اور ڈھاکہ کے باہر شمھار میں ڈیرا لگایا ہے۔اس ٹولے کا ڈپٹی لیڈر بچو منظور حسین کا سگا بھانجہ ہے۔بانکا کی بیوی ڈولی بھی منظور کی ایک بھانجی ہے۔اس رشتے سے بچو بانکا کا سالا لگتا ہے۔

ان لوگوں نے فی الحال فارم گیٹ اور فقیر پل میں دو مکان کرائے پر لئے ہیں۔بعد میں موقع دیکھ کر دو اور جگہوں پر مکان کرایہ پر لیں گے۔شب برات کے موقع پر انہوں نے پہلا ایکشن کرنا تھا۔آواز سن کر گمان ہوتا ہے کہ یہ انہی کا ایکشن تھا۔کل پرسوں تک تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

جھینو لوگوں نے مکان تبدیل کرلیا ہے۔ پہلے والا مکان راجر باغ پولیس لائین کے بالمقابل تھا۔ عزیز رشتہ دار جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہ مکان پگلا پیر کے آستانے کے پیچھے ہے۔ دونوں مکانوں کے بیچ کی دیوار اتنی نیچی ہے کہ اگر اس کے دونوں طرف دو پتھر رکھ دیئے جائیں تو آسانی سے دیوار پھلانگی جاسکتی ہے۔

آج پگلا بابے کے ہاں ہفتہ وار میلاد تھی۔ میلاد کے اختتام پر جھینو کے گھر آگئی تھی، نوجیل اور دینو کو دیکھنے کے لئے۔ ان دونوں بھائیوں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ چودھویں اور اماوس کی رات قریب آئے تو چاروں بھائیوں کی کمر پر، پشت پر، جوڑوں میں درد بڑھ جاتا ہے لیکن اس مرتبہ نوجیل اور دینو کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔

بجلی کی دو تین تاریں آپس میں بل دے کر اور درمیان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرہ دے کر اسے بطور ہنٹر استعمال کرتے ہوئے نوجیل پر بے تحاشا تشدد کیا گیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ہل گئے، پوری پیٹھ زخمی ہوگئی، سر پر شدید چوٹیں آئیں۔ دینو کی حالت بھی اتنی ہی خراب تھی۔ ایک کیپٹن کے طمانچوں سے اس کے کان کے پردے پھٹ گئے تھے۔ ڈنڈے کی چوٹ سے، دائیں ہاتھ کی کلائی سے ذرا اوپر، ہڈی میں فریکچر ہوگیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ٹوٹ کر دو ٹکڑے نہیں ہوگئی۔ نور جہان کی بہن کا شوہر ڈاکٹر عاشق الرحمٰن، مٹفورٹ ہسپتال میں ملازم ہے۔ دینو ان سے اپنا علاج کروا رہا ہے، مٹفورٹ جا کر۔ ڈاکٹر عاشق نے کہا تھا کہ ہاتھ پر پلستر کروانے سے جلدی آرام آجائے گا لیکن دینو خوف کی وجہ سے پلستر نہیں کرواتا۔ اگر رستے میں کوئی ملٹری والا ''مکتی'' کہہ کر پکڑ لے تو؟۔ اس کے بال گردن تک لمبے تھے اس لئے ایم پی اے ہاسٹل میں خان سپاہیوں نے ''یہ سالا مکتی ہے'' کہہ کر اس پر زیادہ تشدد کیا۔ جس سے دینو کچھ زیادہ سہم گیا تھا۔ ہاتھ پر پلستر نہ کروانے کی وجہ سے ٹھیک ہونے میں دیر ہو رہی ہے۔

جامی نے کہا، ''ماموں میرے بھی کبھی کبھی بہت درد ہوتا ہے۔ ابو کے بھی۔ وہ تو بچت ہوگئی کہ ہم میں سے کسی کو ہک کے ساتھ الٹا نہیں لٹکایا۔ اس کے باوجود حالت اتنی خراب ہوگئی ہے۔ سپن بھائی کے والد اور الطاف بھائی کے والد کا تو بہت برا حال کیا تھا۔ وہ تو اب خود سے چل بھی نہیں سکتے۔ سہارا لینا پڑتا ہے لیکن کم از کم ان کے بیٹے تو بچ گئے ہیں وہ اسی میں مطمئن ہیں۔''

جامی کو اس طرح بات کرتے سن کر میں اندر ہی اندر چونک گئی۔ رومی کی گرفتاری نے اسے کس قدر

بے قابو کر دیا ہے، سمجھ رہی ہوں۔ بچپن میں دونوں بھائی خوب لڑتے تھے لیکن تھوڑا بڑا ہونے کے بعد سے رومی اس کا ہیرو بن گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جامی دوبارہ بولا، ''سپن بھائی کس طرح سے فرار ہوئے تھے آپ لوگوں کو معلوم ہے؟ فوجی مکان کے سامنے کی طرف اکٹھے ہو چکے تھے۔ اسی دوران ان کی امی نے انہیں پیچھے کے دروزے سے نکال دیا۔ ان کا مکان ایک منزلہ ہے۔ مکان کے پیچھے جھاڑیوں کا جنگل سا تھا۔ اس کے پیچھے جھگیوں کی بستی تھی۔ سامنے برآمدے کی کھڑکی سے فوجیوں نے دیکھ لیا کہ سپن کی امی اسے فرار کرا رہی ہیں اسی وجہ سے تو وہ لوگ اس کے والد پر اتنا غصہ نکالتے تھے۔''

میں نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا، ''تم نے کس سے سنی ہیں اتنی باتیں؟''

''میرے سکول کا ایک دوست ان کے محلے میں رہتا ہے۔ سپن بھائی لوگوں کے گھر کے بہت قریب۔ آج صبح ''مرن چاند'' کی دکھائی پر مٹھائی خریدنے کے لئے گیا تھا تو اس دکان میں اس سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت اس نے بتایا۔''

میں نے سپن کا ۳۰ اگست کی صبح کا اڑا ہوا چہرہ یاد کیا۔ ''ہائے! بے چارے پر کتنی مصیبت گزری تھی، ساری رات پھر بھی چاند کا ٹکڑا صبح سویرے چلا آیا تھا خبر دینے کے لئے۔ میں نے جب کہا کہ ''رومی لوگ پکڑے گئے ہیں۔ تم فوراً بھاگ جاؤ۔'' تو اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ خاموشی سے گاڑی گھما کر واپس چلا گیا تھا۔ بتا تک نہیں سکا کہ اس کے گھر پر سے بھی طوفان گزر گیا ہے۔ ہائے! جہاں بھی رہے اللہ اسے حفاظت میں رکھے۔''

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

شریف نے کہا، ''ایک ماہ پہلے اخبار میں فلائٹ لیفٹننٹ مطیع الرحمٰن کے بارے میں جو پڑھا تھا، آج ان کے بارے میں سن کر آیا ہوں۔''

''کیا سن کر آئے ہو؟ کہاں پر سنا؟''

''ڈاکٹر ربی کے پاس سے۔ ربی کو جانتی ہو نا. ہمارے شجاع کا بھتیجا۔''

شریف کے ایک انجینئر دوست شجاع صاحب ہیں۔ ان کے بھتیجے کا نام ربی ہے۔

شریف نے کہا، ''آج فقیر کے دفتر گیا تھا، وہاں پر ربی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ مطیع الرحمٰن کا کنبہ ۲۹ ستمبر کو کراچی سے ڈھاکہ پہنچا۔ مطیع الرحمٰن کے سسر گلشن کے ایک مکان میں رہتے ہیں، وہیں پر ۳۰ تاریخ کو مطیع الرحمٰن کا چالیسواں تھا۔ ربی گیا تھا چالیسویں پر۔ مسز مطیع سنا ہے بنگلہ ڈپارٹمنٹ کے منیر الزمان کی سالی ہے۔''

ہمارے سر منیز الزمان؟ اس کا مطلب ہے ڈولی کی بہن؟ رکو اس کی بہن کو تو میں نے دیکھا ہے، ڈولی کے گھر پر، ملی اس کا نام ہے۔''

ڈولی کی بات یاد کر کے دل اداس ہو گیا۔ ڈولی، منیر الزمان سر، ان لوگوں کی کوئی خبر معلوم نہیں ہے۔ دو دو بچے لے کر کہاں پر چھپتے پھر رہے ہیں، کسے معلوم؟ اس پار نہیں گئے۔ گئے ہوتے تو ریڈیو پر آواز ضرور سنائی دیتی۔ آزاد بنگلہ بے تار سے بہت سے جاننے والوں کی آواز سنتی ہوں۔ وہ لوگ فرضی نام استعمال کرتے ہیں لیکن آواز سن کر پہچان جاتی ہوں۔ پہلے دن آزاد بنگلہ بے تار سے صالح احمد کی خبریں سنیں، بہت جانی پہچانی آواز لگی تھی۔ دو ایک دن کے بعد پہچان گئی تھی کہ یہ آواز حسن امام کی ہے جو صالح احمد کے فرضی نام سے خبریں پڑھ رہا ہے۔ ابو محمد علی اور احمد چودھری کے نام سے جو لوگ انگریزی خبریں اور تبصرہ پڑھتے ہیں وہ لوگ ہیں علی ذاکر اور عالمگیر کبیر۔ نغموں کے فنکاروں کی آواز آسانی سے پہچانی جاتی ہے۔ رابندر ناتھ رائے، عبدالجبار، اجت رائے، اندر موہن راج بنگشی، ہرلال رائے۔ مقالے پڑھنے والے، علی احسن، قمر الحسن، فیض احمد.... تقریباً سب کی آوازیں سن کر ہی پہچان لیتی ہوں۔ تمثیلوں کے فنکار راجو احمد، مادھوری چٹیا پدھیٰ، ان لوگوں کی آوازیں ایک منٹ میں بوجھ لیتی ہوں۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

آج پورے شہر میں شور سا پڑا ہوا تھا۔ گزشتہ رات دو مکتی فوجیوں نے بنانی میں منعم خان کے گھر میں داخل ہو کر انہیں گولی ماری اور فرار ہو گئے۔ صبح کے وقت میڈیکل کالج ہسپتال میں منعم خان فوت ہو گئے۔ اخباروں میں تصویر کے ساتھ تفصیل سے خبر چھپی ہے۔

شام کے بعد منعم خان اپنے ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ مہمانوں میں صوبے کے ریٹائرڈ ایجوکیشن منسٹر امجد حسین، مسلم لیگ کے چند رہنما اور منعمخان کے داماد جہانگیر محمد عادل موجود تھے۔ ڈرائنگ روم کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ منعمخان دروازے کی طرف رخ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں دروازے کے قریب سے کسی نے ایک گولی چلائی۔ گولی ان کے پیٹ پر لگی۔ منعم خان، خون آلود جسم کے ساتھ ہی صوفے سے فرش پر گر گیا۔ گولی چلا کر حملہ آور اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ منعمخان کو ہسپتال میں لانے کے بعد معلوم ہوا کہ گولی ان کے پیٹ سے گھس کر پشت سے نکل گئی ہے۔ ان کی حالت خطرناک تھی۔ آدھی رات کو آپریشن بھی کیا گیا لیکن انہیں بچایا نہیں جا سکا۔

سوچا تھا کہ آج فخرو کو ہسپتال میں دیکھنے جاؤں گی لیکن اخبار میں منعمخان کے بارے میں پڑھنے کے بعد سے سوچ رہی تھی کہ آج ہسپتال کی طرف رخ نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔ فوجیوں سے سارا علاقہ یقیناً بھرا ہوا ہو گا۔ دانتوں کے ڈاکٹر فخر الزمان کی کڈنی میں کینسر ہو گیا ہے۔ وہ میڈیکل کالج ہسپتال کے نیو کیبن میں زیر علاج ہیں۔ فخرو سے ہمارا بیس سالہ پرانا تعلق ہے۔ سگے بھائی کی طرح سمجھتی ہوں اسے۔ اس کی بیماری کے بارے میں سن کر دل بہت اداس ہو گیا ہے۔ کینسر جیسا مہلک مرض!

فخرو لندن جا کر آپریشن کروائے گا۔ تیاریاں چل رہی ہیں۔

نکلنے کا سوچا تھا لہٰذا گھر پر دل نہیں لگا۔ سوچا کہ نیو مارکیٹ جا کر کچھ ضروری دوائیاں خرید لوں۔ پھر پگلا پیر کے ہاں میلاد کے لئے ابھی سے مٹھائی بھی خرید لاؤں۔

جس دکان پر بھی جاتی ہوں وہیں دبی دبی سی رونق محسوس ہوتی ہے۔ ہر طرف سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ منعم خان کو مار دیا ہے، اس سے زیادہ خوشی کی خبر جیسے اور کوئی نہیں۔ بچھو کتنے دھڑلے سے برآمدے پر آ کر دروازے کے قریب سے گولی چلا کر چلے گئے۔ کمرے میں اتنے لوگ، لیکن کوئی کچھ بھی نہیں کر سکا، اس سے

زیادہ کامیاب ایکشن شائد ممکن ہی نہیں۔ مٹھائی کی دکان پر جا کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دکان صاف ہو چکی تھی! صبح سے پے در پے گاہک آ کر ساری مٹھائی خرید کر لے جا چکے تھے۔ ڈھاکہ کالج کے سامنے مٹھائی کی دو دکانیں ہیں۔ مرن چاند اور دیس پریا۔ دونوں دکانوں سے ملا جلا کر جلیبی دو سیر کے قریب، رس گلے، کالا جامن، چم چم سب کچھ ملا کر ڈیڑھ سیر مٹھائی ملی اور کچھ بھی نہیں بچا تھا دکان پر۔

گھر پر آ کر سوچنے لگی کہ ایک ظالم سے کس حد تک نفرت ہو تو لوگ اس کے مرنے پر، اس طرح خوشی سے مٹھائی خرید کر دکانیں خالی کر سکتے ہیں! اسی منعمخان نے، بنگال کے اس نااہل فرزند نے، ایوب خان کے دور میں گورنر کے عہدے پر فائض ہو کر بنگالیوں پر تشدد کا سٹیم رولر چلا دیا تھا۔ عوام نے اسے چھ سات برس تک تو مسلسل برداشت کیا، بالآخر اکتا کر احتجاج شروع کر دیا۔ ۶۹ء کی عوامی تحریک اسی احتجاج کا نتیجہ تھی۔ حاکم ایوب خان کے زوال سے پہلے ہی اس کے تابعدار منعمخان کو زوال آ گیا تھا۔ اس کے بعد کا وقت منعمخان نے گھر کے اندر ہی گزارا، باہر نہیں نکلا لیکن اس سال کے وسط میں اس نے دوبارہ انگڑائی لی تھی۔ اب پاکستانی حکام کے ساتھ ہاتھ ملا کر، کچھ نہ کچھ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

سہ پہر کو پگلا بابے کے ڈیرے پر بھی جا کر دیکھا کہ لوگوں کے چہروں پر خوشی کے آثار ہیں۔ کسی نے سرگوشی کی، ''پگلا بابا کو چاہئے کہ آج میلاد کے بعد ان بچھوؤں کے لئے دعا کریں۔''

لیکن پگلا پیر بابا آج حد سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔ ان کا مزاج بھی بہت تلخ ہے۔ کسی بات پر شائد پریشان ہیں۔ کون جانے کہ وجہ کیا ہے؟

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

کل نیو مارکیٹ سے جو دوائیاں خریدی تھیں ان کا پیکٹ بنا رہی تھی، بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے۔ جامی اپنے دادا کے پاس بیٹھا تھا۔ امی اور لالو ذرا باہر گئے تھے۔ آج کل مختلف سرحدی محاذوں پر شدید لڑائی جاری ہے۔ دوائیوں کی بہت ضرورت ہے۔ دوائیاں خرید کر چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنا کر رکھ چھوڑتی ہوں۔ موقع ملنے پر مختلف لوگوں کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔ صرف دوائیاں ہی نہیں، روپے، سگریٹ وغیرہ بھی۔

زیادہ تر زخمیوں کے لئے استعمال ہونے والی دوائیاں خریدتی ہوں، پنسلین آنکمنٹ، ٹیرامائسین آنکمنٹ، سلفونامائڈ پوڈر، آئیوڈیکس، ڈیٹول، ٹنکچر آیوڈین، ٹنکچر برمین، روئی، گاز۔ اس کے علاوہ اینٹی باؤٹک، ٹیرامائیسین، پنمر یثان، کلوروفارم، نیواسپٹ۔

بخار اور سر کے درد کے لئے نوولجین، ڈسپرین۔ نزلہ زکام اور کھانسی کے کے لئے ویکس، یوکلپٹس آئل۔ اس کے علاوہ چھوٹی قینچیاں اور بلیڈ بھی ایک ایک رکھ دیتی ہوں، ہر پیکٹ کے اندر تا کہ ایمرجنسی کے وقت خود ہی پٹی وغیرہ باندھی جا سکے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج جھینو لوگوں کے گھر پر میلاد تھا۔ نئے مکان میں آنے کا میلاد۔ میلاد کے بعد "رنگاماں" نے کہا، "بیٹی ذرا بیٹھ کر جاؤ، بات کرنی ہے۔"

جھینو کی امی کو میں رنگاماں کہتی ہوں۔ اس ادھیڑ عمر میں بھی کچے سونے کی طرح کا رنگ، دیویوں جیسا روپ ہنس مکھ، خوش اخلاق۔ ان خوبیوں کے باعث رنگاماں کے علاوہ انہیں اور کسی نام سے مخاطب کر ہی نہیں پاتی۔

ایک ایک کر کے تمام لوگ چلے گئے تو رنگاماں اندر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں مجھے لے گئیں۔ ایک چوکی پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے اندر جاتے ہی ایک لڑکے نے اٹھ کر میرے پیروں پر ہاتھ لگا کر سلام کیا۔ میں حیرت زدہ نظروں سے تکتی رہی۔ "اکو!"

منان کے بڑے بھائی بقی صاحب کا لڑکا، اکو، ۲۸ اگست کو شہادت اور عالم کے ساتھ میلہ گھر چلا گیا تھا۔

"کب آئے ہو اکو؟"

"اس مہینے کے شروع میں ہی آ گیا تھا۔"

اکو سے معلوم ہوا کہ وہ ساٹھ گوریلاؤں کے ایک بہت بڑے ٹولے کے ساتھ آیا ہے۔ کیپٹن حیدر نے ڈھیر سارا اسلحہ دے کر انہیں بھیجا ہے، ڈھاکہ میں گوریلا آپریشن کرنے کے لئے۔ وہ لوگ گوپی باغ کی پچھلی طرف سے ڈھاکہ میں داخل ہوئے تھے۔ ڈھاکہ کے باہر اس طرف بائیگدانام کے ایک گاؤں میں ان کا بیس کیمپ ہے۔ وہاں سے تھوڑا تھوڑا اسلحہ ڈھاکہ لے کر آ رہے ہیں۔

اسلحہ لانے کے طریقہ کار کے بارے میں سنا۔ صبح سویرے بہت سے لوگ ٹوکریوں میں سبزیاں بھر کر ڈھاکہ میں لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر سبزی والے کا روپ دھار کر، ٹوکری کے اندر سبزیوں کے نیچے، چھوٹا اسلحہ بھر کر لے آتے ہیں۔ بڑا اسلحہ عام طور پر رات کے وقت بوریوں میں دوسری چیزوں کے ساتھ ڈال کر لے آتے ہیں۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

صبح ساڑھے سات بجے تیار ہو کر ڈاکٹر خالق کے ساتھ سکریٹریٹ گئی تھی۔ ہیلتھ منسٹری سے فخر الزمان کا میڈیکل بورڈ کا آرڈر لینا تھا۔ اس کے نہ ہونے سے ان کی لندن روانگی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ یہ کام جتنا جلد ہوتا اچھا تھا کیونکہ لندن جانے میں جتنی تاخیر ہوگی اس کا کینسر اتنا ہی بگڑتا جائے گا۔

آرڈر ٹائپ ہونے کے بعد دستخط ہوئے۔ مجھ تک پہنچنے میں بارہ بج گئے۔ کاغذ لے کر میڈیکل کالج ہسپتال آئی۔ اب اس پر ڈاکٹر علی اشرف کے دستخط کرانے تھے لیکن وہ آپریشن تھیٹر میں مصروف تھے۔ فخرو کی بیوی انجو کے ساتھ آپریشن تھیٹر کے سامنے چھوٹے سے اینٹی روم میں کھڑی رہی۔ وارڈ بوائے کی جیب میں دس روپے کے دو نئے نوٹ ٹھونس کر اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ ڈاکٹر علی اشرف جیسے ہی ایک آپریشن ختم کر کے اپنے منہ سے ماسک اتاریں وہ ان سے کہے کہ میں ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں باہر ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ دو منٹ کے لئے ضرور آئیں۔

ڈاکٹر علی اشرف بہت غصیلے آدمی ہیں۔ اس طرح آپریشن تھیٹر سے بلوانے کے نتیجے میں وارڈ بوائے تو ڈانٹ کھائے گا ہی، خدا جانے میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔ وقت بھی تو دوڑتا چلا جا رہا ہے، آج ان کے دستخط نہ ہوئے تو غیر ملکی کرنسی حاصل کرنے میں دیر ہو جائے گی۔ اگلے کل اور پرسوں بینک گیارہ بجے تک کھلا رہے گا۔ اس سے اگلے روز اتوار ہے، بینک بند رہے گا۔

ڈاکٹر علی اشرف غصے میں باہر آئے۔ مجھے بہت برا بھلا کہا کہ انہیں اس طرح، آپریشن کے دوران میں کیوں بلایا گیا ہے۔ میں نے بھی بلند آواز میں کہا، ''اس کے علاوہ چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ایک انسان مر رہا ہے۔ مزید دیر ہوئی تو اس کے بچنے کا کوئی ''چانس'' نہیں رہے گا۔''

ڈاکٹر علی اشرف نے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ہی دستخط کر دیئے۔ ان کے رویے کو نظر انداز کر کے، دانت نکال کر ان کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آئی۔

فخر الزمان کے کیبن میں پہنچ کر دیکھا کہ ڈاکٹر فضل ربی انہیں دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ ڈاکٹر ربی فخرو سے کہہ رہے تھے، ''جایئے۔ تندرست ہو کر واپس آیئے۔ شاید آپ کی واپسی تک ہم میں سے بہت سے لوگ موجود نہ رہیں۔''

۲۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج سے روزے شروع ہو گئے ہیں۔ شریف، جامی، بوڑھے میاں، تینوں نے روزہ رکھا ہے۔ امی اور لالو پرسوں اپنے گھر پر واپس چلے گئے تھے۔

رومی کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا۔ پگلا بابا مسلسل امید دلائے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی ہر جمعرات کو پچاس کا ایک نوٹ، پانچ سات سیر مٹھائی، ایک کارٹن ۵۵۵ (بابا ۵۵۵ کے علاوہ کوئی سگریٹ نہیں پیتے) بطور نذرانہ دیئے جا رہے ہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی بھیج دیتی ہوں۔ آج کل فجر کی نماز سے پہلے نہیں جاتے۔ مسلسل تین ہفتے تک دم کروانے کے بعد بھی لالو کے سر کا درد ٹھیک ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چنانچہ پگلا بابا سے کچھ کہے سنے بغیر ہی سحر کے وقت جانا بند کر دیا تھا۔ گزشتہ روز بابے نے دوبارہ کہا کہ کل سحر کے وقت آنا چنانچہ آج سحر کے وقت گئی تھی۔ پہلے روزے کے دن اتنا سویرے جانا کتنا تکلیف دہ تھا کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ گزشتہ میلاد کے بعد بابے کو تھام کر میں بہت روئی تھی۔ اسی لئے بابا نے کہا تھا کہ وہ ساری رات اپنے حجرے میں بیٹھ کر عبادت کریں گے، میں سحر کے وقت ان سے ملوں۔ آج سحر کے وقت بہت امید باندھ کر گئی کہ بابا ضرور کوئی خوشخبری سنائیں گے لیکن انہوں نے بس اتنا کہا کہ اتوار تک دیکھتا ہوں اس کے بعد جو کچھ بھی ممکن ہوا کروں گا۔ آٹھ بجے گھر پر لوٹ کر دوبارہ گاڑی بھجوا دی، پگلا بابے کو ضرورت ہے۔

کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، سر میں درد ہو رہا ہے۔ تکلیف، مایوسی، بے چارگی اور غصے کی کیفیت میں آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے جا رہے ہیں، روک نہیں پا رہی ہوں۔ معصوم نے گزشتہ کل ایک لڑکا لا کر دیا ہے، عثمان۔ اسے کچھ کام سمجھانا تھا، وہ بھی نہیں کر پائی۔

اس دیوانگی کی کیفیت میں کتنی دیر رہی کچھ معلوم نہیں۔ ابھی اسی کیفیت ہی میں تھی کہ دروازہ بجا۔ چونک کر اٹھی دیکھا کہ مظہر، رضیہ اور منی بھائی آئے ہیں۔ مظہر الحق شریف کے ایک انجینئر دوست ہیں، رضیہ ان کی بیگم ہے اور منی اس کے بڑے بھائی کی بیٹی۔

رضیہ یعنی بچو میری بہت پکی سہیلی ہے۔ اس کے بھی میری طرح صرف بیٹے ہیں، کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اسی لئے شائد منی اکثر اس کے ساتھ نظر آتی ہے۔ منی بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہنس مکھ، خوش اخلاق۔ انٹرمیڈیٹ فرسٹ ائیر میں پڑھتی ہے۔ رابندر ناتھ ٹھاکر کے گانے بہت اچھے گاتی ہے۔ منی سے گانا سنانے کی فرمائش کریں

تو عام طور پر بہانے کرتی ہے۔ آج کہا تو پہلے اس نے میری رو رو کر سرخ کی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر اس نے گانا شروع کر دیا۔

منی لوگ دکن پور میں رہتے ہیں، اپنے آبائی مکان میں۔ مظہر صاحب لوگ بھی گلشن کا مکان چھوڑ کر دکن پور کے مکان میں چلے گئے ہیں۔ بچو کے والد کا مکان بھی سسرال سے دو مکان چھوڑ کر ہی ہے۔ کریک ڈاؤن کے بعد سے ہم سب لوگوں میں، عزیز رشتے داروں سے مل کر، اکٹھے رہنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ فوجی جنتا کے بے رحم مظالم کے سامنے بے سہارا نہتے بنگالی کنبے آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے قریب رہ کر قوت اور حوصلہ اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا کر ہی شائد وہ لوگ بہت دیر تک میرے ساتھ رہے۔ منی کی زبانی ڈھاکہ میں مکتی باہنی کی کچھ کارکردگی کے بارے میں معلوم ہوا۔

بچو کی بڑی بہن کا لڑکا جون، بچو کا بڑا لڑکا، دولن کے دوست کا چھوٹا بھائی عارف، ان کا دوست فردوس، سب لڑکے سکول کے طلباء ہیں لیکن سارے جاں باز بچھو ہیں۔ جون نارندہ میں رہتا ہے، فردوس گ بازار میں اور عارف دھان منڈی میں۔ یہ سب لڑکے منی لوگوں کے گھر پر اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ وہیں کھاتے پیتے ہیں اور اپنے پروگرام طے کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے دوسرے لڑکے بھی آتے ہیں۔ محبوب، جو گانا گاتا ہے اور ایل پی محبوب کہلاتا ہے، سہیل، فیروز، نصیر الدین یوسف بچو، رئیس الاسلام، اسد، مانک اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے۔ مکتی باہنی سے ان کا رابطہ ہے۔ ان کا ایک گروہ ساوار کے قریب گاؤں کے ڈیرے میں مقیم ہے۔ گاؤں کا نام منی کو معلوم نہیں تھا لیکن وہاں سے اسلحہ لا کر ڈھاکہ تک پہنچانے کے سلسلے میں منی، ڈالیا اور صلاح الدین کی خالہ شہانہ مدد کرتی ہیں۔ عارف گاڑی پر منی اور شہانہ کو شارار کے قریب دریا کے کنارے تک لے جاتا ہے۔ وہاں پر گاڑی میں اسلحہ لادا جاتا ہے۔ گاڑی پر خواتین موجود ہوں تو عام طور پر فوجی چیک پوسٹ پر گاڑی سرچ نہیں کرتے۔ گاڑی کو روک کر ایک دو سوالات پوچھنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے منی اور شہانہ گاڑی میں موجود رہتی ہیں۔

میں نے اندازہ کر لیا کہ منی جس نصیر الدین یوسف بچو کی بات کر رہی ہے وہی منظور کا بھانجا بچو ہے، جس کے بارے میں شریف مجھے پہلے ہی بتا چکے تھے۔ میں نے منی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا کہ میں ان لوگوں کے بارے میں پہلے ہی سن چکی ہوں۔ میں خاموشی سے منی کی باتیں سنتی جا رہی تھی۔ جتنا سن رہی تھی اتنا ہی میرے دل کی اداسی کم ہوتی جا رہی تھی، اندر کی تکلیف، مایوسی اور غصہ غائب ہوتا جا رہا تھا۔ ۳۰۔۲۹ اگست کی گرفتاریوں کے بعد صرف چند روز تک ڈھاکہ میں سناٹا طاری رہا تھا۔ اس کے بعد بچھوؤں نے دوبارہ رینگنا شروع کر دیا۔ یہ بچھو دوبارہ سے گروہ در گروہ، مختلف سمتوں سے ڈھاکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یوسف بچو لوگ ساوار کی طرف سے، اکو لوگ گوپی باغ کی طرف سے اور بھی کتنے گروہ کس کس طرف سے ڈھاکہ میں داخل ہو رہے ہیں ان سب کی خبر مجھے نہیں ہے۔

گزشتہ پرسوں دوپہر کے ایک بجے سٹیٹ بینک کی چھٹی منزل کے ایک باتھ روم میں بم کا دھماکا ہوا۔ اس سے دو پاکستانی کمانڈو ہلاک ہو گئے۔ جو بچھو اس دھماکے کے ذمہ دار ہیں ان کا نام نہیں جانتی۔ اس سے ایک روز قبل، منگل کی صبح، موتی جھیل میں آئی پی آئی ڈی سی، حبیب بینک اور پروڈنشیل بلڈنگوں کی سامنے والی سڑک پر ایک بم دھماکے سے وہاں پر پارک کی ہوئی چھ عدد گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ بلڈنگوں کے سامنے کی طرف والی کھڑکیوں کے تمام شیشے ٹوٹ گئے۔ جن لڑکوں نے دن کی روشنی میں بے مثال دلیری کے ساتھ یہ دھماکہ کیا ان کا نام بھی مجھے معلوم نہیں۔ اس سے بھی دو روز پہلے، ۱۸ تاریخ کو، ریسیڈنشیل ماڈل سکول میں بم کا دھماکہ ہوا۔ کس نے کیا معلوم نہیں۔

لیکن نام نہ بھی معلوم ہو تو اتنی بات سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ مکتی باہنی کے گوریلوں کے کارنامے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ہی گھروں کے جاں باز بنگالی لڑکے ہیں۔ رومی نے جو ایک نظم سنائی تھی۔

بس میں ہوتا تو آسمان چیر کر نکال لاتے
وہ غوطہ لگاتے پاتال کے اندھیروں میں۔
تم اور مستقبل ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑھ رہے ہو۔
ہر طرف تمہارے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔
دکھ ہرتا، تم میرے بھائی ہو
اے میری اولاد و.....

گوریلوں کے بارے میں لکھی گئی یہ نظم مجھے اس وقت بہت یاد آئی۔

منی کی زبانی جاں باز لڑکوں کے ایک اور کارنامے کے بارے میں معلوم ہوا: ''جانتی ہو چچی اس مرتبہ ۱۸ اگست کو کیا واقعہ پیش آیا؟ غبارے میں گیس بھر کر غبارے کے ساتھ بنگلہ دیش کا جھنڈا اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں باندھ کر اڑا دی گئیں۔ غباروں کی فیکٹری جون کے بہنوئی کی اپنی ہے، وہاں سے بہت سے غبارے لا کر گھر کے اندر چھپا کر گیس بھری گئی۔ قائداعظم کالج کے چند لڑکے گیس سلنڈر لے آئے تھے۔ ہم سب نے مل کر کاغذ کے جھنڈے اور کشتیاں بنائیں۔ سحر کے وقت ہماری چھت سے غباروں کو اڑا دیا گیا۔ ایک غبارے کا دھاگہ نواب پور میں بجلی کے ایک تار سے اٹک گیا غبارے سے کشتیاں بندھی تھیں۔ اس پر پورے علاقے میں شور مچ گیا۔ رضا کار کسی کو وہاں پر کھڑا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ موہن چچا نواب پور کے بازار جا رہے تھے، خریداری کرنے کے لئے، یہ منظر دیکھ کر بازار کو بھول بھال کر گھر لوٹ گئے۔ اس روز سارا محلہ خوف زدہ رہا! کون جانے، فوجی اگر محلہ سرچ کرنے کے لئے آ جائیں۔''

''آئے تھے؟''

منی نے خوش دلی سے ہنس کر کہا، ''نہیں آئے۔''

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

چند دنوں سے قومی اور صوبائی نشستوں پر ضمنی انتخابات کے سلسلے میں اخبارات کے صفحے گرم ہیں۔ کتنی نشستوں کے لئے کتنے امیدواروں نے نامزدگی کے کاغذات جمع کرائے ہیں، یہ تفصیل بہت اہتمام کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔ بہت سے امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہورہے ہیں۔

فقیر نے کہا، ''یہ لوگ تو منتخب ہو ہی گئے ہیں۔ اب باقی نمائندے بھی شائد جلد منتخب ہو جائیں۔ ان لوگوں نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کے بعد ان کی تقدیر میں کیا لکھا ہے؟''

شریف نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا، ''کیا لکھا ہے؟''

''کفن کا کپڑا، اگر بتیاں اور پچاس کا ایک نوٹ۔''

میں نے کہا، ''پچاس کا نہیں دس کا نوٹ۔''

یہ تو پیس کمیٹی کے گاؤں کے ارکان کے لئے مقررہ رقم ہے۔ کچھ بھی ہو آخر یہ لوگ صوبائی اور قومی اسمبلی کے منتخب نمائندے ہیں، ان کے لئے دس روپے بہت کم نہیں؟ رتبے کی توہین بھی تو نہ ہونا۔''

''سنا ہے آج کل مکتی سپاہی بہت شریر ہو گئے ہیں۔ امن کمیٹی کے چیئرمین، ممبران، یونین کونسل کے چیئرمین اور ممبران، سب کے سب کو کفن کا کپڑا، اگر بتی کا پیکٹ اور دس کا ایک نوٹ ایک خط کے ساتھ بھیج رہے ہیں۔ خط میں لکھا ہے۔ ''جو کچھ دل چاہے ان دس روپیوں میں کھالینا۔ تمہارے دن قریب آگئے ہیں۔''

میں نے کہا، ''اتنی تعداد میں بنگالی نامزدگی کے کاغذات داخل کرائیں گے، مجھے توقع نہیں تھی''

فقیر نے کہا، ''کیوں توقع نہیں تھی بھابی؟ سارے ہی بنگالی تو محب وطن نہیں ہیں۔ اس بات کا ایک ثبوت تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ رومی کا دوست بدیع جو سب سے پہلے پکڑا گیا تھا، وہ تو اپنے دوست کے گھر سے پکڑا گیا تھا۔ اس کا وہ دوست پاکستانیوں کا مخبر تھا، اس میں تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ بدیع دوپہر کے وقت ایک اور بنگالی دوست کی غداری کی وجہ سے پکڑا گیا تھا، اسی لئے تو اتنا بڑا نقصان ہوا۔ اسی طرح بہت سے نالائق، نااہل بنگالی جنہیں اب تک کوئی کارنامہ سرانجام دینے کی توفیق نہیں ہوئی تھی اب انہیں اسمبلی کا ممبر ہونے کا موقع ملا ہے۔''

شریف نے کہا، ''البتہ اتنے لوگ جو بلا مقابلہ منتخب ہورہے ہیں اس سے ایک شبہ اور پیدا ہوتا ہے۔

زیادہ تر علاقوں سے، سنگینوں کی نوک پر خوفزدہ کر کے، امیدوار کھڑے کئے گئے ہیں۔ ایک سے زیادہ امیدوار دستیاب بھی نہیں ہوئے لہٰذا مقابلہ بھی نہیں ہوا۔ جماعت میں ایک ہی طالب علم ہے لہٰذا فرسٹ کلاس فرسٹ۔"

"بہت سی جگہوں پر ایک سے زیادہ لوگوں نے بھی تو نامزدگی کے کاغذات جمع کرائے ہیں۔"

"یوں لگتا ہے کہ یہ سب لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے فرضی خبریں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقے سے صرف ایک ہی امیدوار راضی کیا جا سکا ہے، وہ بھی بڑی مشکل سے۔"

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز منگل

آج صبح اچانک چیتیا آ کھڑا ہوا۔ چیتیا ہمارا بہت پرانا ترکھان ہے۔ بہت ایماندار اور محنتی کاریگر ہے اسی لئے عزیز دوستوں میں سے کسی کو ترکھان کی ضرورت ہو تو ہم بلا جھجک چیتیا کو بھیج دیتے ہیں۔ زیادہ مخلص اور سیدھا ہونے کی وجہ سے چیتیا زندگی میں زیادہ ترقی نہیں کر سکا۔ اکثر محتاجی کے مارے ہمارے پاس آ کر التجا کرتا ہے کہ کہیں پر کام دلا دیں۔

آج اسے دیکھ کر ہم سب چہک اٹھے۔ ''کیا خبر ہے چیتیا؟ کیسے گزرے اتنے دن؟ کہاں پر رہے؟ بھارت نہیں گئے؟''

چیتیا آبائی زمین چھوڑ کر بھارت نہیں جا سکا۔ اس کے علاوہ بڈا کی طرف ان کے گاؤں پر براہ راست فوجی حملہ بھی نہیں ہوا۔ کسی طرح لک چھپ کر جان بچالی البتہ کام کاج بالکل بھی نہیں ہے۔ پہلے کچھ عرصے تک گھر پر بیٹھ کر تھوڑا بہت کھا پی کر گزارا ہوتا رہا مگر اب دونوں وقت فاقوں تک نوبت آ گئی ہے لہٰذا ہمت کر کے نکل آیا ہے۔

میں نے کہا، ''بہت اچھے وقت پر آ گئے ہو۔ اسی گھر میں تمہارے لئے بہت سا کام جمع ہے۔''

اکثر افواہ سنائی دیتی ہے کہ میر پور، محمد پور سے بہاری اس طرف کو لوٹ مار کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر محلے میں شور پڑ جاتا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کے دروازے کھڑکیاں مرمت کرا رہے ہیں، ہر دروازے کی کنڈیاں تالے چیک کر رہے ہیں اور بیرونی مداخلت سے بچاؤ کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی بہت دنوں سے سوچ رہے تھے سامنے کی طرف کے دونوں دروازوں کے پٹ تبدیل کروانے ضروری ہیں۔ وہ پٹ اتنے ہلکے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ لاتوں سے ہی ٹوٹ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ڈرائنگ روم اور سیڑھیوں کے پاس والی دونوں کھڑکیوں کا شیشہ اتار کر لکڑی کے تختے لگانے کے بارے میں بھی غور کر رہی تھی۔ شیشے کی کھڑکیاں بند کر دینے سے بھی محفوظ نہیں لگتا ہے۔ چیتیا کی خبر نہیں مل رہی تھی۔ نیو مارکیٹ سے نیا مستری بلوا کر کام کروانے پر بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ چیتیا کے خود سے آ جانے سے مجھے فکر سے نجات مل گئی۔

چیتیا اپنے بھتیجے نرنجن کو ساتھ لے کر آیا ہے۔ اس سے پہلے ہمیشہ سے چیتیا خود جا کر ضرورت کے مطابق لکڑیاں خرید کر لاتا تھا۔ آج اس نے کہا، ''مجھے دکان پر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لکڑی اگر صاحب خود خرید لائیں تو....''

چیتیا لوگ جہاں پر کام کرتے ہیں وہیں پر رہ لیتے ہیں۔ پہلے مکان کے شمال کی طرف کے خالی گیراج میں رہتے تھے۔ گیٹ اس گیراج کی سیدھ میں ہے۔ سڑک پر سے دکھائی دیتا ہے۔ اس مرتبہ ان کے رہنے کا انتظام جنوب کی طرف، سرونٹ کوارٹرز کے ایک کمرے میں کر دیا۔ ایک کمرے میں بوڑھے میاں رہتے ہیں۔ ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ چیتیا لوگ پورا دن کام کرتے ہیں۔ دوپہر کے وقت چینی کے ساتھ ڈبل روٹی کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ شام کو سودا سلف لا کر کھانا پکاتے ہیں۔ ایک روز چیتیا نے کہا کہ ان کا سودا بھی اگر بوڑھے میاں لا دیا کریں.... انہیں بازار جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

میں نے کہا، ''ٹھیک ہے تم لوگوں کو الگ سے پکانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھا لیا کرو۔ کیوں، ہمارے ہاتھ کا کھانا کھانے سے تم لوگوں کی ذات تو نہیں ماری جائے گی؟''

چیتیا نے کھسیانی سی ہنسی ہنس دی، ''کیا بات کرتی ہیں اماں! اس وقت تو جان کی پڑی ہوئی ہے۔''

گھر کے اندر والے صحن میں وہ لوگ کام کرتے ہیں۔ دوپہر اور رات کو بوڑھے میاں ان کے کمرے میں کھانا دے آتے ہیں۔ وہ لوگ بالکل بھی باہر نہیں نکلتے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

نرنجن کا ایک پاؤں لنگڑا ہے لیکن زبان سے موتی جھڑتے ہیں۔ چیتیا بہت کم بولتا ہے۔ ہنستا اور بھی کم ہے۔ چلتا بہت آہستہ ہے۔ نرنجن ٹھیک اس کا الٹ ہے۔ لنگڑی ٹانگ سے ہی گلہری کی طرح چھلانگیں لگاتا ہے۔ مسلسل بولتا ہے۔ جب چاہے ہنس دیتا ہے۔

میں ان کا کام دیکھنے کے لئے اکثر کرسی لے کر صحن کے ایک طرف بیٹھ جاتی ہوں۔ نرنجن اپنے چچا کا ہاتھ بٹاتا ہے ساتھ ہی اس کا منہ بھی چلتا رہتا ہے۔ گلشن، بنانی، بڈا کی تمام خبریں اس کو رٹی ہوئی ہیں۔

آج اس نے کہا، ''دیدی ماں آپ نے سنا؟ منعم خان کی لاش، کہتے ہیں کہ قبر سے نکال کر لے گئے ہیں؟''

میں چونک گئی، ''نہیں تو! میں نے تو نہیں سنا! کس نے اٹھائی ہے اور کیوں؟''

کافی خود اعتمادی کا اظہار کرتے ہوئے نرنجن نے کہا، ''مکتیوں نے اٹھائی ہے۔ کہتے ہیں اس طرح کے ایک بے ایمان کی لاش اس ملک میں نہیں رہنے دیں گے۔''

چیتیا نے ڈانٹ دیا، ''آہا۔ کہنے دو بے چارے کو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی بات کرتے ہوئے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اپنا لڑکا بھی تو مکتی تھا۔ نرنجن تمہیں مکتیوں کی اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں؟''

میری حوصلہ افزائی پر خوش ہو کر نرنجن نے کہا، ''ارے واہ! کیوں نہیں جانوں گا؟ ہماری طرف کیا کم مکتی ہیں؟ وہ لوگ ایکشن کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سٹین گن بھی میں نے دیکھی ہے۔''

چیتیا نے لاچاری سے کہا، ''یہ لڑکا مجھے ڈبوئے گا۔ اتنی بک بک کرتا ہے۔''

''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چیتیا۔ مجھے بتانے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ وہ باہر تو کہیں نہیں جاتا۔ ہاں تو نرنجن اپنے گاؤں کے مکتی فوجیوں کے بارے میں بتاؤ۔''

''ہمارے گاؤں میں تو مکتی نہیں ہیں البتہ آس پاس کے گاؤں میں ہیں۔ ہم لوگ ان کے بارے میں سنتے رہتے تھے۔ بہت سے لڑکے اگرتلا سے ٹریننگ لے کر آئے ہیں۔ ہماری طرف کے ایک لڑکے نے ہی تو منعم خان کو مارا تھا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''

مجھے یہ سننا بہت خوفناک لگا لیکن دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی، ''واقعی؟ وہ تم لوگوں کی طرف کا کوئی لڑکا تھا؟ تمہیں صحیح سے معلوم ہے نا کہ جنہوں نے مارا تھا ان کا تعلق مکتی باہنی سے ہے؟''

''ہاں۔وہ لوگ اگرتلا سے ٹریننگ لے کر آئے تھے۔ان کے پاس سٹین گنیں بھی تھیں۔گرینیڈ بھی ہیں۔گرینیڈ دیکھنے میں بالکل انناس کی طرح لگتا ہے۔''

''تم نے دیکھا ہے؟''

''میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے لیکن سنا ہے۔''

''اچھا نرنجن تم نے اگرتلا کے قریب کسی میلہ گھر نام کی کسی جگہ کے بارے میں سنا ہے؟

''لگتا تو ہے کہ سنا ہے۔میلہ گھر....اگرتلہ.... ہاں۔وہ تو میلہ گھر کے لڑکے ہی تھے۔''

''ذرا بتاؤ تو سہی کس سے طرح سے منعمخان کو ہلاک کیا تھا؟تم نے کیا سنا ہے؟''

''ان میں سے ایک لڑکا منعمخان کو مار کر آیا تو بات پھیل گئی۔گاؤں میں کوئی بات چھپی تو رہتی نہیں۔ وہ لڑکا منعمخان کو مارنے کی بہت دنوں سے کوشش کر رہا تھا۔سنا ہے کہ وہ میلہ گھر سے منعم خان کو مارنے کا آرڈر لے کر آیا تھا۔ منعمخان کے مکان پر گائیوں کی رکھوالی کرنے والے ملازم نے اس کی مدد کی تھی۔ منعمخان کے پاس بہت سی گائیں تھیں،ان کی رکھوالی کے لئے ایک ملازم بھی تھا۔وہ ملازم منعمخان سے خوش نہیں تھا۔سنا ہے اس کو تنخواہ نہیں دیتا تھا۔تنخواہ مانگنے پر پولیس کی دھمکی دیتا تھا۔منیم خان آدمی بہت ہی برا تھا۔بہر حال اس ملازم کے ساتھ کسی طرح سے اس لڑکے نے دوستی کر لی۔شام کے وقت جب گائیوں کو لے کر وہ ملازم مکان کے اندر جاتا تھا تو ساتھ وہ مکتی لڑکا بھی مکان کے اندر جانے کی کوشش کرتا۔ویسے تو اندر جانا ناممکن تھا کیونکہ باہر گیٹ پر دو دو چوکیدار بندوق اٹھا کر کھڑے ہوتے تھے۔اندر پستول لئے منعم خان کا باڈی گارڈ موجود ہوتا تھا۔وہ لڑکا پہلے دن تو ناکام رہا۔دوسرے دن بھی شام کے وقت اندر داخل ہوا لیکن کام پورا نہیں کر سکا۔ منعم خان دوسری منزل پر تھا۔وہ لڑکا کامیاب نہیں ہوا تو پیچھے کی دیوار پھلانگ کر واپس بھاگ گیا۔تیسرے دن اس لڑکے کو موقع مل گیا۔اس روز منعمخان نچلی منزل کی بیٹھک میں بیٹھ کر مہمانوں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔وہ لڑکا اسی طرح گائیوں کی آڑ میں اندر داخل ہوا۔سٹین گن اس کے پاس تھی۔اس نے منعمخان پر گولی چلائی اور پیچھے کی دیوار پھلانگ کر بھاگ گیا۔اس لڑکے کے پیچھے وہ ملازم بھی فرار ہو گیا۔''

نرنجن کی باتیں سن کر میں دنگ رہ گئی۔گاؤں کے اِن کم تعلیم یافتہ اور جاہل لڑکوں کو ہم کتنا نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ ان کی عقل،پیداواری کاموں میں ان کا حصہ،مشاہدہ کرنے کی قوت اور اطلاعات اکٹھی کرنے کی صلاحیت میں یہ رائٹر کے صحافیوں کو بھی نیچا دکھا دیں!

''تم نے اس مکتی فوج کو دیکھا ہے؟''

''دیکھا ہے۔ منعمخان کو مارنے کے اگلے دن اسے دیکھنے کے لئے آس پاس کے گاؤں سے بہت سے لوگ جا رہے تھے۔میں بھی گیا تھا۔دور سے دیکھا ہے۔اتنے لوگوں میں بات پھیل جانے کی وجہ سے اس کے والد اور چچاؤں نے اسے کہیں اور بھیج دیا تھا۔''

''نام جانتے ہو اس لڑکے کا؟''

نرنجن شرمندہ سا ہو گیا۔ ''سنا تو تھا لیکن بھول گیا ہوں۔ ذرا مشکل سا نام تھا، زبان پر چڑھتا نہیں۔''

آج دوپہر کو شریف عام دنوں کی نسبت بہت دیر سے لوٹے، تقریباً ڈھائی بجے۔ چہرہ سرخ، آنکھوں میں چمک، اندر داخل ہوتے ہی بولے، ''زبردست خبر ہے! ڈی آئی ٹی بلڈنگ میں بم کا دھماکہ ہوا ہے۔''

''واقعی! کس وقت؟''

''ابھی، سوا ایک بجے کے قریب۔ ہمارے دفتر سے تو قریب ہی ہے۔ اچھی طرح تفصیل معلوم کرنے میں ذرا دیر ہو گئی۔''

''کیسی خطرناک بات ہے۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی جلدی سے بھاگ آنا چاہئے تھا۔''

شریف ہنسنے لگے۔ ''دھماکہ سننے کے بعد ہی سڑک پر اتر آتا تو دوبارہ نظر نہ آتا، فوجی گردن دبوچ لیتے۔ دفتر کے اندر رہنا ہی محفوظ تھا۔ فون پر ادھر ادھر سے معلومات حاصل کیں، اس کے بعد سڑکیں جب ذرا کلیئر ہوئیں تو واپس آ گیا۔''

''کیا کچھ تباہ ہوا ہے؟ کس کس منزل پر؟''

''ساتویں منزل پر۔ ٹاور کے ایک طرف بڑا سا گڑھا ہو گیا ہے۔ ہمارے دفتر کی کھڑکی سے نظر آ رہا تھا اور اس سوراخ سے دھواں نکل رہا تھا۔ اندر آگ لگی ہوئی تھی۔''

میں حیران رہ گئی، کیسی خطرناک مہم جوئی تھی۔ نچلی منزل پر نہیں، دوسری منزل پر نہیں، بالکل ساتویں منزل پر؟ آج کل تو سن رہی ہوں کہ ہر منزل پر ہی سیڑھیوں کے سرے پر الگ الگ چیک پوسٹ قائم کی گئی ہیں۔ بلڈنگ میں داخل ہوتے وقت چیک پوسٹ، نچلی منزل میں داخل ہوتے وقت چیک پوسٹ، ہر منزل پر چیک پوسٹ۔ اتنی ساری چیک پوسٹوں پر موجود اتنے فوجیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اوپر تک کیسے پہنچے؟ اتنے بڑے پیمانے پر دھماکہ کرنے کے لئے دھماکہ خیز مواد کی کافی مقدار درکار ہوتی ہے، وہ کس طرح سے اندر لے کر گئے؟ واقعی بچھو کمال دکھا رہے ہیں! میں نے کہا، میرے پاس بھی کچھ خبریں ہیں۔''

میں نے شریف کو نرنجن سے سنی ہوئی خبر بتائی۔ شریف نے بتایا کہ گزشتہ روز صبح کے وقت موتی جھیل کے گریس سکول کی ہیڈ مسٹرس کے گھر پر مکتیوں نے بم پھینکا تھا۔ ان کی بلڈنگ کو خاصا نقصان پہنچا۔ تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ کل شام کے بعد بچھوؤں نے کھل گھاؤں میں ایک جگہ پر ریلوے لائن کا ایک حصہ تباہ کر دیا، بم مار کر۔

خبریں سن کر میں نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا، ''روزانہ اگر اسی قدر خبریں آتی رہیں تو خوب ہو۔''

شریف بھی ہنسے، ''امید ہے کہ ملتی رہیں گی۔''

۲۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج سے ٹھیک ساٹھ روز قبل، رات کے بارہ بجے پاک فوجی میرے رومی کو لے گئے تھے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بحیرہ بنگال میں آندھی پیدا ہوئی، اس کے اثرات گزشتہ کل سے ڈھاکہ میں بھی محسوس ہو رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ سب لوگوں نے گرم کپڑے نکال لئے ہیں۔

آج شریف کی سالگرہ ہے۔ کل بیت المکرم کے فٹ پاتھ سے ایک خوبصوت ٹوپی خریدی۔ اس کے علاوہ خاص طرح کی ایک تسبیح بھی خریدی جو اندھیرے میں چمکتی ہے۔ آج صبح سالگرہ کے تحفے کے طور پر انہیں یہ دونوں چیزیں دیں۔ باغ میں کسی پودے میں ایک بھی پھول نہیں ہے۔

جانی نے ہنس کر کہا، ''آپ کی سالگرہ پر بچھوؤں کے ایکشن کی ایک خبر تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔'' اس کے بعد خبریں پڑھنے کے انداز میں کہنے لگا، ''گزشتہ روز شام کے وقت مارننگ نیوز کے دفتر کے گیٹ پر ایک مکتی سپاہی نے گرینیڈ پھینکا ہے۔ دھماکے سے اگرچہ کوئی ہلاک یا زخمی نہیں ہوا تاہم علاقے میں خاصی دہشت پھیل گئی ہے۔''

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج فخر الزمان لندن کے لئے روانہ ہوں گے۔ دوپہر کے بعد فلائٹ ہے۔ صبح نو بجے کے قریب انجو کو، پری باغ کے شاہ صاحب کے پاس لے گئی، فخر کے لئے دعا کرانے۔ اس کے بعد ساڑھے دس بجے امی اور لالو کو گلشن لے کر گئی، فخرو سے ملاقات کرانے کے لئے۔ فخر کے ساتھ انجو بھی جا رہی ہے۔ بچے اس کی ماں کے پاس ملک میں ہی رہیں گے۔

دوپہر کے وقت شریف، فق چہرہ لے کر گھر لوٹے، ''سنا ہے؟ بہت بری خبر ہے، خالد مشرف لڑائی میں مارا گیا ہے۔''

ہم لوگوں پر بھی اداسی طاری ہوگئی۔ کتنے افسوس کی خبر ہے! کیسا غضب ہو گیا! خالد مشرف زندہ نہیں ہے؟ جنگ میں ہلاک ہو گیا ہے؟

رومی کی گرفتاری کا دھچکہ آہستہ آہستہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ڈھاکہ میں گوریلوں کے مختلف ایکشن دل میں تھوڑی تھوڑی امید پیدا کر رہے تھے کہ یہ بجلی ٹوٹ پڑی!

یہی خالد جسے کریک ڈاؤن کے وقت، اس کے پنجابی باس نے اسے کومیلا سے سلہٹ بھیج کر مارنے کی سازش کی تھی، اپنی دور اندیشی اور عقل مندی سے یقینی موت کے منہ سے بچ نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ غیر یقینی مستقبل کی طرف گامزن ہوا۔ اپنے پیچھے ڈھاکہ میں خوبصورت جوان بیوی اور پھولوں کی طرح نازک دو لڑکیاں چھوڑ گیا۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ ۲۵ مارچ کی سیاہ رات کو پاکستان کی وحشی فوج نے اس کے سسرال میں قیامت برپا کر دی تھی۔ اس کے سسر، ساس، بڑی سالی اور ہم زلف کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی بچے، حملہ آور پاک فوج کے ہاتھ سے بچنے کے لے ہر روز مختلف گھروں میں پناہ لیتے رہے تھے۔ واقعی کیا وہ نہیں جانتا تھا؟ اسے یقیناً اندازہ ہوگا کہ اس کے کنبے اور عزیزوں پر اسی طرح کا ستم ڈھایا جا رہا ہوگا۔ یہ اندازہ کر کے ہی وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے کی طرف بڑھ گیا تھا، غیر یقینی مستقبل کی طرف۔ وہ ظلمات کے کنارے کھڑا، فرار ہو کر آنے والے باغی بنگالی فوجی افسروں اور جوانوں کو، جنگ میں شرکت کے خواہش مند سیکڑوں نوجوانوں کو، اکٹھا کر کے آزادی کی جنگ کو منظم رخ دینے جیسی دشوار مہم میں مصروف ہو گیا تھا۔

ڈھاکہ سے اپنے کنبے کے بارے میں اسے پہلی مرتبہ اپنے دوست کے چھوٹے بھائی شہید اللہ خان

بادل سے خبر ملی۔ بادل اور اس کے تین اور دوست اشفاق الصمد آشفی، مسعود اور بدیع، ۲۷ مارچ ہی کو ڈھاکہ چھوڑ گئے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر کریک ڈاؤن کے بعد کہیں نہ کہیں پر مقابلے کی تیاری ضرور شروع ہوگئی ہوگی۔ وہ بھی اس جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ وہ لوگ محاذ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ خالد مشرف کہاں پر ہے۔ راہ میں مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے کرتے، مختلف واقعات وحالات سے گزرتے گزرتے، بالاخر خالد مشرف کے ساتھ ان کا رابطہ ہو ہی گیا۔

خالد نے بادل کو بتایا کہ "یہ ایک طویل لڑائی ہوگی۔ اس لڑائی کے لئے ریگولر آرمی کے ساتھ ساتھ گوریلا فورس کی ضرورت ہوگی۔ تم ڈھاکہ واپس جا کر لڑکوں کے ساتھ رابطہ قائم کرو۔ جو لوگ آنا چاہتے ہیں، آزادی کی لڑائی میں شریک ہونے کے خواہش مند ہیں، انہیں یہاں پر بھیجتے رہو۔"

خالد نے یہ بھی کہا، "جنگ تین محاذوں پر لڑی جائے گی، سیاسی فرنٹ، اقتصادی فرنٹ اور فوجی فرنٹ۔ فوجی فرنٹ کے لئے باقاعدہ فوج موجود ہے۔ باقی دونوں محاذوں کے لئے پورے ملک کے نوجوانوں، دانشوروں، انجینئروں، ڈاکٹروں، صحافیوں اور ہر سطح سے آزادی کا جذبہ رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی یہاں پر بھیجنا ہوگا۔" اس سلسلے میں تمام انتظامات کی ذمہ داری خالد مشرف نے بادل پر عائد کردی تھی۔ ایس ایس سی اور ایس ایچ سی میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والا ذہین طالب علم بادل، اپنے یقینی مستقبل کو بھول کر غیر یقینی نتائج کی حامل مکتی کی لڑائی کی تنظیمی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔

خالد مشرف کے مشورے اور حوصلہ افزائی پر ہی بادل بار بار زندگی کو داؤ پر لگا کر ڈھاکہ آتا رہا۔ اشفاق الصمد جیسے دوستوں کی مدد سے اس نے ڈھاکہ کے نوجوانوں کو منظم کیا۔ جو لوگ جنگ میں شمولیت اختیار کرنے کے لئے بے تاب تھے مگر انہیں راہ نہیں مل رہی تھی، ان کو راستہ بتایا۔ اس کے بھیجے ہوئے لوگ یکے بعد دیگرے، چھوٹے چھوٹے ٹولوں میں بٹ کر، سرحد کے اس پار پہنچنے لگے تھے۔ ان ہی میں قاضی، مایا، فاتح، پلو، غازی، سراج، آنو اور بہت سے نوجوان بھی شامل تھے۔ شہادت چودھری، احرار احمد، کیپٹن ظفر احمد، پاکستان ایئر فورس کے قادر، اے آر خندکر، سلطان محمود، پی آئی اے کے پائلٹ کیپٹن عالمگیر ستار، کیپٹن شہاب اور اس جیسے بہت سے دوسرے افراد بھی اس کی رہنمائی میں اس پار گئے تھے۔

اپریل کے وسط میں بادل نے، خالد مشرف کی بیوی روبی اور اس کی ماں کو بہت مصائب جھیل کر ڈھاکہ سے خالد مشرف کے پاس پہنچا دیا تھا۔ راستے میں دو جگہ، گھوڑا سال اور بھیرب بازار میں پاک آرمی سے مڈ بھیڑ ہوئی لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور ان سے بچ کر نکل آئے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھاگتے، چھپتے، جان بچاتے، بالاخر روبی ایک روز خالد مشرف کے پاس پہنچ گئی لیکن دونوں بچیاں ڈھاکہ میں رہ گئیں۔ بعد میں فوجی حکام نے خالد مشرف کی دونوں لڑکیوں کو آگرانی سکول کی ہیڈ مسٹرس مسز انورہ منصور کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

میجر خالد مشرف کی بیگم کو سرحد پار کروانے کے جرم میں فوجی حکومت نے بادل کے نام وارنٹ

گرفتاری جاری کر دیا۔ اس کے باوجود، سر پر وارنٹ لے کر بھی بادل چند دنوں کے بعد ڈھاکہ آ گیا۔ اس بار اس کی ذمہ داری تھی خالد کی دونوں لڑکیوں کو لے کر ان والدین کے پاس پہنچانا۔ بہت دشوار اور خطرناک کام تھا۔ منصور کی رہائش گاہ، ایلیفنٹ روڈ پر سرکاری کوارٹرز کی تیسری منزل پر تھی۔ وہاں سے دو بچوں کو اغوا کر کے لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس مہم میں بادل کے ساتھی تھے بدیع، قاضی، سپن اور چلو۔ چلو نیچے گاڑی سٹارٹ رکھ کر بیٹھا رہا۔ باقی تینوں اسلحہ لے کر تیسری منزل پر جا پہنچے لیکن دونوں لڑکیوں کو وہ اٹھا کر نہیں لا سکے۔ منصور کے ساتھ بحث و تکرار کے دروان سپن نے دیکھ لیا کہ گھر کا فرد ٹیلی فون کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سپن نے پستول سے ہوا میں گولی چلا دی۔ اس کے بعد تو تہلکہ سا مچ گیا۔ منصور کی بڑی بہن بھاگ کر سامنے آئی تو کسی اور نے اس کے پیروں میں گولی چلا دی۔ گولی پاؤں کی کھال کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ منصور کے سر پر سٹین گن کے بٹ سے وار ہوا۔ بڑی لڑکی بے بی، بادل کو پہچانتی تھی لیکن چھوٹی بچی نہیں پہچانتی تھی۔ مسز منصور روپن کو سینے سے جکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ گولی چلانے کے بعد بادل لوگوں نے وہاں پر زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ بادل بے بی کو گود میں اٹھا کر دوسرے ساتھیوں کو ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ گاڑی کے پاس لوگ اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں۔ بدیع نے خوفناک انداز میں گرج کر چند لوگوں کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ لوگ جلدی سے گاڑی پر سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ شہر کے اندر کسی دوسری جگہ پر وہ نہیں رکے۔ گوپی باغ پہنچ کر ایک جگہ پر چلو نے انہیں اتار دیا۔ بادل اور قاضی بے بی کو لے کر مانگ نگر کی طرف سے داؤد کندی سے ہوتے ہوئے اور راستے میں بہت سی مشکلات عبور کرتے ہوئے خالد مشرف کے کیمپ تک جا پہنچے۔

اتنا کچھ بیت جانے کے باوجود خالد مشرف ٹھنڈے دماغ سے آزادی کی جنگ کی ذمہ داریاں نبھاتا رہا۔ رفتہ رفتہ دو نمبر سیکٹر قائم ہو گیا۔ جس کا ہیڈ کوارٹر میلہ گھر میں بنا۔ اب ایک بہت بڑی گوریلا فورس، باقاعدہ فوج کے ساتھ ساتھ، وجود میں آ چکی تھی۔ ملک کے دوسرے علاقوں کے علاوہ، خاص طور پر ڈھاکہ کے تقریباً سب تعلیم یافتہ، صحت مند، پھرتیلے اور جاں باز لڑکے آ کر اس سیکٹر ٹو میں اکٹھے ہوئے۔ خالد مشرف صرف ان کا سیکٹر کمانڈر ہی نہیں بلکہ ''ہیرو'' بھی تھا۔ جتنے لڑکوں کو سیکٹر میں رکھنے کی گنجائش تھی اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لڑکوں کو خالد پناہ دیتا تھا۔ مخصوص تعداد کے لڑکوں کے لئے جتنا راشن مقرر تھا اسے دوگنا زیادہ لڑکے مل بانٹ کر کھا لیتے تھے۔ خالد کہتا تھا، ''ڈھاکہ میں گوریلا کارروائی برقرار رکھنے کے لئے مجھے کثیر تعداد میں لڑکے چاہئیں۔ عوامی لیگ کی کلیئرنس اور بھارتی حکومت کی منظوری کے بعد جتنے لڑکے مجھے فراہم کئے جاتے ہیں ان کی تعداد ناکافی ہے۔'' لہٰذا خالد بادل سے کہا کرتا تھا، ''جتنا زیادہ ہو سکے لڑکوں کو براہ راست ریکروٹ کر کے سیدھا میرے پاس لے آیا کرو۔ یہ جنگ ہماری قومی لڑائی ہے لہٰذا جماعت اور خیالات سے بالاتر ہو کر جو بھی ملک کی خاطر جنگ کرنے کے لئے آئے گا میں ان سب کو یکساں خلوص کے ساتھ قبول کروں گا۔''

بادل لوگ ایسا ہی کرتے لہٰذا رجسٹر پر جتنے لڑکوں کا نام درج ہوتا اس سے دگنی تعداد میں لڑکوں کو خالد مشرف کیمپ میں رکھ کر گوریلا تربیت دے کر ڈھاکہ بھیجنے کے لئے تیار کر لیا کرتا۔ تین سو لڑکوں کا راشن چھ سو لڑکے

مل بانٹ کر کھاتے تھے۔ جیب خرچ کے پیسے بھی اسی طرح سے تقسیم کرلیا کرتے۔ ہر ایک لڑکے کو ایک مہینے کے بعد گیارہ بھارتی روپے ملا کرتے تھے۔

بہت سے لڑکے جنگ لڑنے کے جنون میں مبتلا ہو کر براہ راست اگرتلا پہنچ جاتے۔ یہ لوگ اور کہیں سے تربیت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ خالد مشرف اگر بھارتی حکومت کے ناک کے نیچے رہتے ہوئے، اس طرح کے لڑکوں کو اپنے کیمپ میں پناہ دے کر تربیت دینے کی پالیسی اختیار نہ کرتے تو ڈھاکہ میں گوریلا کارروائیاں اتنی زوردار نہ ہوتیں نہ ہی ان میں اس طرح سے تسلسل برقرار رہ پاتا۔ ۳۰۔۲۹ اگست کے دوران اتنی تعداد میں گوریلے پکڑے جانے کے باوجود صرف ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد ہی ڈھاکہ کے مختلف اطراف سے اتنی کثیر تعداد میں گوریلے شہر میں داخل ہو گئے اور اپنے ایکشن سے پاک آرمی کے دانت کھٹے کر دیئے، فوجی حکومت کی جڑیں ہلا دیں، ملک کے عوام کا حوصلہ بڑھایا۔ یہ سب کچھ خالد مشرف کی دور اندیشی ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ خالد مشرف دلیر اور خود سر شخص تھا۔ بنگلہ دیش کے لئے جو کچھ اس نے بہتر سمجھا وہی کیا۔ اس سلسلے میں اس نے عوامی لیگ یا بھارتی سرکار کی ہدایات کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کی اس دلیری، خود اعتمادی اور دور اندیشی نے اسے سیکٹر ٹو کے گوریلا لڑکوں میں بہت مقبول کر دیا تھا۔ خالد کے کسی بھی حکم کی آنکھ بند کر کے تعمیل کرنے کے لئے ہر ایک گوریلا لڑکا ایک پاؤں پر کھڑا ہوتا تھا۔ خالد مشرف سیکٹر ٹو کی جان تھا۔

وہی خالد مشرف محاذ پر شہید ہو گیا ہے؟ یقیناً اس کے لئے فخر کی موت ہے۔ شہید کا درجہ ملا ہے اسے۔ لیکن سیکٹر ٹو کے لئے، میلہ گھر کے جاں باز گوریلا فورس کے لئے، ڈھاکہ میں محدود ہم جیسے شہریوں کے لئے تو قیامت برپا ہو گئی ہے۔ ہم سب کے لئے اس سے بڑا غضب اور کیا ہو سکتا ہے؟

خالد کی موت کی خبر نے رومی کا غم پھر سے تازہ کر دیا۔ میلہ گھر سے واپسی کے بعد سے رومی، خالد مشرف کی اتنی باتیں کیا کرتا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ خالد ہی تو لڑکوں سے کہا کرتا تھا، ''کوئی بھی آزاد ملک زندہ گوریلے نہیں چاہتا۔ چاہتا ہے خون میں نہائے ہوئے شہید۔'' کیا اسی لئے خالد آج شہید ہو گئے ہیں؟ لاکھوں لڑکوں کو آزاد مملکت کا خواب دکھا کر خالد کہاں پر چھپ گیا ہے؟

دور کہیں پر ایک گرینیڈ پھٹا۔ کسی ایک رومی نے، کسی بدیع نے، کسی جوئل نے، دھوپ میں اجلی اس سہ پہر میں، موت کے خوف کو دانت دکھا کر، کہیں پر وار کیا ہے۔ آزادی کے عزائم کو آگے بڑھا رہے ہیں خالد مشرف کے ہاتھوں تربیت یافتہ گوریلے۔ ان لڑکوں کو کیا معلوم ہو چکا ہے کہ ان کا رہنما اس جہاں سے کوچ کر گیا ہے؟

خالد نہیں ہے، رومی نہیں ہے، بدیع نہیں ہے، جوئل نہیں ہے، لیکن جنگ جاری ہے..... آزدی کی جنگ۔

۳ نومبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج سارا دن بجلی نہیں تھی۔ کہاں پر کیا ہوا ہے ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی۔ لولو خبریں لانے میں بہت ماہر ہے۔ آج اس کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔

۴نومبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

شب وروز بے رونق، بے جان گزر رہے ہیں۔ کہیں پر جانے کو دل نہیں کرتا۔ فون پر منی سے بات کر لیتی ہوں۔ رضیہ اور ڈولی سے بھی۔ خالد مشرف کی شہادت کی خبر سن کر سب لوگ بہت اداس ہو گئے ہیں۔ منی سے معلوم ہوا کہ خالد کی شہادت کا سنتے ہی ڈھاکہ کے تمام گوریلوں نے آہ وزاری شروع کر دی تھی۔ ہر ایک ٹولے سے دو دو گوریلے میلہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے، تفصیلی خبر معلوم کرنے کے لئے۔ امید ہے کہ ایک دو روز کے اندر ہم لوگوں کو بھی تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔

خالد کی شہادت کا سن کر گوریلوں نے اگرچہ آہیں بھرنا شروع کر دی ہیں تاہم کسی کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ ان کے روزانہ کے ایکشن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے خالد کی موت کا بدلہ لینے کے لئے وہ اور بھی کمر باندھ کر یکے بعد دیگرے ایکشن کئے جا رہے ہیں۔

جنا کی سینما ہال کے قریب پلوبل مارکیٹ میں کل بچھو مسلم کمرشل بینک کے اندر گھس کر روپیہ پیسہ لوٹ کر لے گئے۔ دن کے گیارہ بجے عوام کی آنکھوں کے سامنے۔ اس ایک ہی روز مئو چاک مارکیٹ کے یونین بینک کے اندر تین چار بچھو داخل ہو کر سات ہزار روپے چھین کر لے گئے۔ یہ واقعہ بھی گیارہ ساڑھے بجے کے قریب دن کی روشنی میں پیش آیا۔

اخباروں میں ان بینکوں میں ڈاکہ پڑنے کا واقعہ شائع ہوا ہے۔ اخباروں میں یہ بھی چھپا ہے کہ یکم نومبر کو صوبائی انتخابی کمیشن کے دفتر میں بم کے دھماکے سے ایک فرد ہلاک، دو زخمی ہوئے ہیں۔ دو عدد کمرے تباہ ہو گئے ہیں، چھت گر گئی ہے اور دھماکے سے پھیلنے والی آگ کی لپیٹ میں آ کر تمام دستاویزات جل کر راکھ ہو گئی ہیں۔ ۲ نومبر کی شام کو کرائل پٹرول پمپ پر گرینیڈ پھینکا گیا ہے۔ رات کے آٹھ بجے عظیم پور کے آرمی ریکروٹنگ سنٹر میں بم کا دھماکہ کیا گیا ہے۔

آج سہ پہر کو پگلا پیر بابا کے ڈیرے پر ہفت روزہ محفل میلاد ہے لیکن مجھے جانے کی خواہش نہیں۔ طے کیا ہے کہ جامی کو مٹھائی کے ساتھ بھیج دوں گی۔ جامی کو اس بات پر زیادہ اعتراض نہیں ہے کیونکہ سنبل لوگوں کے ساتھ اس کی خوب دوستی ہو گئی ہے۔ ویسے ہی ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہے ان کے گھر جانے کے لئے۔

فیصلہ کر لینے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی ہوں کیونکہ اب مجھے کسی کام کی جلدی نہیں

رہی۔گھڑی کی طرف نظر ڈال کر دیکھا ابھی بارہ بجے ہیں۔

سکون سے ایک پیالی چائے کی لے کر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ جامی نے دروازہ کھولا۔ ہنستا ہوا چہرہ لے کر منی اندر داخل ہوئی۔ اندر آتے ہی خوشی سے بولنے لگی، ''چچی خوشخبری ہے۔ خالد مشرف مارے نہیں گئے ہیں۔ لڑائی کے دوران شدید زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن جان بچ گئی ہے۔''

خالد مشرف زندہ ہے!

خدا! تو کتنا مہربان ہے!

میں نے منی کو سینے سے لگا کر اپنے قریب بٹھا کر سوال کیا، ''کس سے سنا ہے؟ کھل کر بتا؟''

منی نے بتایا کہ ڈھاکہ سے جو مکتی سپاہی میلہ گھر کی طرف بھاگے تھے ان میں سے ایک دو لوگ واپس آ گئے ہیں۔ ان سے منی نے سنا کہ لڑائی کے دوران دشمنوں کے شیل کا ایک اڑتا ہوا ٹکڑا خالد کے ماتھے پر لگا۔ انہیں فوری طور پر اگرتلا کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں سے ہیلی کاپٹر پر لکھنو۔ اس سے زیادہ منی کو ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ بے شک نہ پتا ہو.... خالد مشرف زندہ ہے یہی خبر ہمارے لئے بہت ہے۔

منی لوگوں کا گھر گوریلوں کا ایک ڈیرا ہے۔ اس کے خالہ زاد، چچا زاد، محلے کے بہت سے بھائی، مکتی باہنی میں ہیں۔ وہ لوگ اور ان کے توسط سے دوسرے مکتی سپاہی ان کے گھر پر آتے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے گھر پر پاک آرمی نے ابھی تک حملہ نہیں کیا لہٰذا گوریلے بے خوف ہو کر ان کے گھر آتے جاتے ہیں۔ میں نے سوال کیا، ''ڈی، آئی، ٹی، بلڈنگ میں کن لوگوں نے دھماکہ کیا تھا، معلوم ہوا ہے کچھ؟''

منی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ بات بات پر ہنستی ہے۔ اس نے ہنس کر کہا، ''ارے واہ چچی، وہ تو ہمارے جون اور فردوس تھے۔''

''سچ؟ سکول کے وہ دونوں لڑکے؟ اس طرح کی سخت سیکورٹی سے بچ کر؟ کس طرح سے کیا؟''

''ان کی بات مت کیجئے وہ تو اس قدر بچھو ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ بہت دنوں سے وہ منصوبہ بنا رہے تھے کہ کس طرح سے ڈی آئی ٹی بلڈنگ کے اندر دھماکہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈی آئی ٹی میں محبوب علی نام کے ایک صاحب ملازمت کرتے ہیں۔ وہ صاحب ٹی وی پر بھی اداکاری کرتے ہیں، وہ جو شجاع خنذکر کے ساتھ کبھی کبھی گرو۔ چیلہ کے نام سے ایک مزاحیہ پروگرام کرتے ہیں، وہی محبوب۔ اس نے جون اور فردوس کی بہت مدد کی۔ ان کو اندر داخل ہونے کا پاس بنوا دیا۔ اپنی ٹانگ پر جعلی بینڈج باندھ کر اس کے اندر پی کے چھپا کر ڈی آئی ٹی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر لے گیا۔ ساتویں منزل کے اس کمرے میں بہت سی پرانی فائلیں ڈھیروں کی شکل میں رکھی تھیں۔ ان فائلوں کے ڈھیر میں پی کے چھپا کر رکھا کرتا تھا۔''

''محبوب علی کی بہت ہمت ہے!''

''ہمت جیسی ہمت.... وہ ایک دو روز نہیں بلکہ مسلسل بارہ روز تک روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے پی کے بینڈج کے اندر چھپا کر لے جاتا رہا۔ ایک وقت میں ایک پاؤنڈ سے زیادہ لے جان ممکن نہیں تھا کیونکہ بینڈج زیادہ

موٹی ہو جاتی تو پاک فوجی شبہ کرتے۔ جون اور فردوس کا منصوبہ اور بھی بڑا تھا۔ وہ ڈی آئی ٹی ٹاور کے اوپر نصب ٹی وی انٹینا کا ٹاور اڑانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ۱۶ پاؤنڈ پی کے اندر پہنچانے کی ضرورت تھی لیکن بارہ پاؤنڈ پہنچانے کے بعد اچانک خبر ملی کہ ساتویں منزل کے اس کمرے میں رکھی فائلیں ترتیب سے رکھنے کا حکم آیا ہے۔ وہ لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ فائلوں کے پیچھے چھپایا ہوا پی کے اگر ایک مرتبہ پکڑا جاتا تو خیر نہیں تھی۔ ڈی آئی ٹی بلڈنگ کے تمام بنگالیوں کی جان تو جاتی ہی، مستقبل میں کبھی ڈی آئی ٹی بلڈنگ کے قریب بھی نہیں پھٹکا جا سکے گا۔ جون اور فردوس نے اس سے پہلے کہ وہاں سے فائلیں اٹھائی جائیں، آپریشن مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا؟ دھماکہ تو انہیں ضرور کرنا تھا کیونکہ وہ دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ پاکستانی آرمی کی سیکورٹی اٹوٹ نہیں ہے۔ پاکستانی آرمی کے تشدد کے نیچے سسکیاں بھر کر بھی بنگالی مر نہیں گئے۔ انہوں نے محبوب کی بینڈج کے اندر چھ فٹ سیفٹی فیوز چھپا دیا اور ایک فاؤنٹین پن خالی کر کے اس کے اندر ڈیٹونیٹر بھر دیا۔ یہ چیزیں لے جاتے ہوئے محبوب تقریباً پکڑا جانے لگا تھا۔ پہلے تو پولیس صرف قمیض اور پتلون کی جیبیں چیک کرتی تھی۔ اس روز پولیس کے سپاہی کو نہ جانے کیا ہوا، وہ اچانک محبوب کی کمر، رانیں، گھٹنے بھی ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ محبوب کا اس وقت برا حال ہو گیا! پولیس کا سپاہی اگر اور ایک انچ نیچے ہاتھ لگاتا تو اس کی ٹانگ پر بندھی نقلی بینڈج کا راز فاش ہو جاتا، لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ پولیس کا سپاہی اس حد تک تلاشی لے کر ہی مطمئن ہو گیا۔ محبوب نے جون اور فردوس کو آڈیشن دینے والے دو پاس بنوا دیئے تھے۔ وہ لوگ پاس دکھا کر بلڈنگ کے اندر داخل ہوئے اور آپریشن مکمل کر کے باہر آ گئے۔"

میں نے سینے میں اٹکی ہوئی سانس چھوڑ کر کہا، "اف! کہنا کتنا آسان ہے لیکن وہ لوگ جس وقت یہ کام کر رہے تھے تو اس وقت یہ سارا کچھ بالکل بھی آسان نہیں تھا۔"

"ظاہر ہے، گڑبڑ بھی کیا کم ہوتی چچی؟ آج کل تو ہر منزل پر چیک پوسٹ موجود ہے۔ چھٹی منزل تک چیک پوسٹ سے پولیس والوں نے انہیں جانے دیا مگر ساتویں منزل پر جاتے وقت پولیس والے نے باقاعدہ پوچھ گچھ کرنا شروع کر دی، "کیوں جاؤ گے؟ کس کے پاس جاؤ گے؟ کیا کام ہے؟ جون اور فردوس بھی تو کم بچھو نہیں ہیں۔ انہوں نے دھڑلے سے کہا، "ارے ہم سرکاری دفتر کے آدمی ہیں۔ حکومت کے ایمرجنسی کام پر اوپر جا رہے ہیں۔ تم ہمیں روکو گے تو حکومت کا ہی نقصان ہو گا۔ ہمیں کیا؟ ہم لوگوں کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ ٹاور کے اوپر سے کھڑے ہو کر جائزہ لیں کہ بوڑھی گنگا کا پانی کس حد تک بڑھا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو چند دنوں سے کس قدر بارش ہو رہی ہے؟ اس سال اتنی زیادہ بارش کی وجہ سے ہی تو اس حد تک سیلاب بڑھ گیا ہے، اتنی مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ کھڑکی سے ذرا جھانک کر تو دیکھو میدان، کھیت وغیرہ کس طرح پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کی لمبی تقریر کے دوران پیچھے سے اور بھی لوگ آ کر اوپر جانے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ ان سب کو بھی چیک کرنا تھا۔ پولیس والا تو مغربی پاکستانی تھا، جانتی تو ہیں کہ بے چارے کس قدر سیدھے ہوتے ہیں، جون کی باتوں سے تنگ آ کر اس نے کہا، "اچھا، اچھا، جاؤ۔"

منی ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ ابھی ہنسی اتنی بڑھ گئی کہ بات روکنا پڑی۔ جامی اور میں بھی خوب

ہنسے۔ سچی بات ہے کہ خالد کی موت کی جھوٹی خبر سننے کے بعد سے پہلی مرتبہ دل کھول کر ہنسے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہنسی روک کر میں نے کہا، ''اس کے بعد.....؟''

''اس کے بعد کیا؟ وہ لوگ ساتویں منزل کے اس کمرے میں گئے، جو کچھ کرنے کی ضرورت تھی کیا۔ سارا پی کے اکٹھا ڈھیر کیا، فیوز وئیر لگایا، ڈیٹونیٹر فٹ کیا۔ دونوں نے مل کر سارا کام مکمل کیا۔ اس کے بعد فیوز وئیر کے سرے پر آگ لگا کر باہر آ گئے۔ فیوز وئیر جل کر بلاسٹ ہونے میں تین منٹ کا وقت لگتا ہے۔ اس وقفے کے اندر ان لوگوں کو ڈی آئی ٹی بلڈنگ سے باہر نکل جانا تھا۔ اس دوران نہ نکل سکتے تو وہ لوگ پھنس جاتے کیونکہ دھماکہ ہوتے ہی آرمی پوری بلڈنگ کا محاصرہ کر لیتی۔ کسی کو باہر نہ نکلنے دیتی۔ تین منٹ کے اندر ساتویں منزل سے اتر کر سڑک پر نکل آنا کوئی آسان بات ہے چچی؟ بھاگ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ پولیس والے دیکھ لیتے تو شک کرتے۔ چل کر جائیں تب بھی مقررہ وقت کے اندر باہر نہیں نکل پائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ جہاں پر کوئی نہ ہوتا وہاں وہ لوگ دوڑ لگا دیتے جوں ہی کوئی آتا محسوس ہوتا، فوراً بھلے مانسوں کی طرح شکل بنا کر سکون سے چلنے لگتے۔ ان کی قسمت بہت اچھی تھی کہ دھماکے سے عین ایک لمحہ پہلے وہ باہر نکل آئے تھے۔''

میں نے سینے میں رکی ہوئی سانس باہر نکالی اور کہا، ''بہت بہادر ہیں وہ لوگ۔ اللہ نے بچا لیا ہے انہیں۔ شیر کے منہ سے بچ کر آ گئے۔''

منی نے کہا، ''چچی کل ہماری طرف سارا دن تک بجلی نہیں تھی۔ آپ کے اس طرف کیا حال رہا؟''

''اس طرف بھی نہیں تھی، صبح چھ بجے سے شام کے چھ بجے تک۔ جانتی ہو کل ہی پہلی مرتبہ ٹیوب ویل استعمال کیا ہے۔ ٹیوب ویل لگانے کے بعد سے ایک روز بھی بجلی نہیں گئی۔ دل میں بہت افسوس تھا کہ سارا پیسہ بے کار گیا۔''

منی دوبارہ ہنس کر لوٹنے لگی۔ ''پیسہ تھوڑا بہت کل وصول ہو گیا پھر؟''

''وہ تو ہوا۔ مگر کس نے کہاں پر کیا کیا کچھ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا۔''

''جامی کھانے کی میز پر بیٹھ کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا، ''کیوں؟ اخبار میں تو خبر چھپی ہے۔ تم نے نہیں دیکھا۔''

واقعی؟ کیا لکھا ہے؟'' جامی نے پڑھا، سدھر گنج پاور ہاؤس پر بم کا دھماکہ۔

کل بروز بدھ سحر کے وقت سدھر گنج پاور ہاؤس پر یکے بعد دیگرے بم کے تین دھماکے ہوئے، جس کے نتیجے میں پاور ہاؤس کو خاصا نقصان پہنچا اور چاروں جنریٹر ناکارہ ہو گئے۔ دھماکے کے فوراً بعد ڈھاکہ، نرائن گنج، ٹنگی اور آس پاس کے علاقوں میں بجلی کی فراہمی بند ہو گئی۔'' سنتے سنتے میں اداس ہو گئی۔ رومی لوگ سدھر گنج پاور سٹیشن پر آپریشن کرنے کا منصوبہ لے کر ہی ڈھاکہ آئے تھے۔ وہ لوگ ایسا کرنے سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے۔ رومی، بدیع اور جوئل ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے لیکن رومی لوگوں کا نامکمل کام مکمل کرنے کے لئے اور بہت سے رومی، بہت سے بدیع اور بہت سے جوئل پیش پیش ہیں۔

۷نومبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج ڈولی کے گھر پر نصیرالدین بچھو کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس سے خالد مشرف کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔

خالد کی موت کی خبر اکتوبر کی ۲۹۔۲۸ تاریخ کو ان کے بیس کیمپ تک پہنچی۔ خبر ملتے ہی لڑکوں میں کربلا کا ماتم برپا ہو گیا۔ مکتی فوج کے یہ تمام جاں باز لڑکے، اپنے دلیر ہیرو رہنما کی موت کی خبر سن کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے فوراً دو گوریلا لڑکوں کو میلہ گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ کل ہی وہ لوگ معلومات لے کر لوٹے ہیں۔

قصبے میں لڑائی کی رہنمائی کرتے وقت خالد مشرف زخمی ہوا۔ شیل کا ایک ٹکڑا خالد کے ماتھے میں سوراخ کر کے مغز کے اوپر والے حصے میں جا لگا تھا۔ گو اس کی حالت ابھی تک بہت نازک ہے لیکن امید ہے کہ جلد ہی مکمل طور پر تندرست ہو جائے گا۔ لکھنؤ شہر کے جس ہسپتال میں خالد کو زیر علاج رکھا گیا ہے اس کا معیار خاصا بلند ہے۔

میلہ گھر میں خالد کے زخمی ہونے کی خبر سے غم کے سیاہ بادل اتر آئے تھے۔ سب لوگ بچوں کی طرح رونے لگ پڑے تھے۔ بہت سے مکتی سپاہی ضابطے کے برخلاف کیمپ چھوڑ کر اگرتلا کی طرف دوڑ پڑے تھے، خالد کے حالات معلوم کرنے کے لئے۔ خالد مشرف میلہ گھر کے لڑکوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ خالد ان کا سیکٹر کمانڈر ہی نہیں ان کا ''محافظ فرشتہ'' بھی ہے۔ البتہ اس قدر بری خبر کے ساتھ ایک خوشی کی خبر بھی ہے کہ جس قصبے میں لڑائی کے دوران خالد زخمی ہوا تھا، اس پر مکتی باہنی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

قصبے کی لڑائی؟ اکتوبر کی ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴ تاریخ کے دوران چار دن تک اخبارات میں قصبے کی جھڑپوں کے بارے میں مسلسل خبریں شائع ہوتی رہی تھیں۔ خاصے پرزور انداز میں بیانات جاری کئے گئے کہ کس طرح سے ''بھارتی کارندوں'' نے کمان، فلڈ گن، بھاری مارٹر، اینٹی ٹینک گن کے ساتھ حملہ کیا ہے اور کس طرح سے پاک آرمی نے بہت سے ''بھارتی کارندوں'' کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن کہیں پر اس بات کا گمان تک نہیں ہونے دیا کہ مکتی باہنی نے ان سے قصبہ چھین لیا ہے۔

خالد مشرف کے زخمی ہونے کے بعد اب حیدر نے سیکٹر ٹو کا چارج سنبھال رکھا ہے۔

اسی دوران میں بچو کے گھر پر بھی مصائب کا پہاڑ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے والدین اور بھائی بہن

ڈھاکہ کے جس گھر میں رہتے تھے وہاں پر اچانک ۲۳ اکتوبر کو پاک آرمی ہلہ بول کر اس کے پانچ بھائیوں کو پکڑ کر لے گئی۔ اس کے والد کو کہہ گئے ہیں کہ تمہار جولڑکا ملتی ہے اسے لا کر دو گے تو ہم تمہارے ان پانچ بیٹوں کو چھوڑیں گے۔ بچو کے والد نے بتایا کہ انہیں اس لڑکے کی کوئی خبر ہی معلوم نہیں، وہ کس طرح سے اسے لا دیں؟ فوجی حکام کی ہدایت کے مطابق بچو کے نام پر اخبارات میں اشتہار بھی جاری کیا گیا۔ خیر فوجی حکام کو جب اس بات کی تسلی ہوئی کہ بچو کے والد کو حقیقتاً اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تو انہوں نے اس کے پانچوں بھائیوں کو ۳۰ تاریخ کو چھوڑ دیا۔

بچو نے کہا، ''اتنے مصائب کے بعد بھی ہم حوصلہ نہیں ہارے۔ اسی دوران ہم نے ایکشن بھی جاری رکھا۔ ستمبر کے آخری دنوں میں جب ہم آئے تھے اس وقت خالد مشرف اور حیدر بھائی نے کہا تھا کہ عنقریب مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، ہو سکے تو تم لوگ کچھ پیسوں کا بندوبست کر کے بھیج دینا۔ گزشتہ ہفتے حیدر بھائی کا ایک اور خط ملا ہے جس میں انہوں نے جلد از جلد کچھ پیسے بھیجنے کی ہدایت کی ہے چنانچہ چند روز پہلے ہم نے پلوبل مارکیٹ کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈال کر پیسے حاصل کئے اور سیکٹر میں بھیج دیئے ہیں۔''

پلوبل مارکیٹ کے بینک میں پھر تم لوگوں نے ہی.....''

بچو ہنس پڑا، ''ہاں ہم لوگوں نے ہی.....''

''لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہاں سے سیکٹر میں پیسے بھیجنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟''

بھارتی حکومت نے سیکٹر ٹو میں اسلحہ فراہم کرنا بند کر دیا ہے۔ پیسے اور راشن بھی نہیں دے رہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ سیکٹر ٹو سے بھارتی حکومت کا ایک اختلاف شروع سے ہی تھا؟ گزشتہ دو ماہ کے دوران مسئلہ اور بھی شدید ہو گیا ہے۔ وہ لوگ تو سیکٹر ٹو کو ''ریڈ سیکٹر'' کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں سے ''مسلوں'' کی مدد کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میرا بھی ایک واقعہ ہے۔ میں بھاشانی نیپ کی سیاست پر یقین رکھتا ہوں چنانچہ مجھے دو تین مرتبہ انڈین آرمی نے انٹروگیشن کے لئے لے جانے کی کوشش کی لیکن خالد مشرف نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ ہمارے گروہ کا لیڈر مانک ''چھاترا لیگ'' سے وابستہ ہے، اس نے بھی کئی موقعوں پر مجھے بچایا۔ ہم دونوں دو مختلف سیاسی نظریات کے حامی ہیں لیکن دیکھئے کہ محاذ پر ہم اکٹھے جنگ کر رہے ہیں۔ مانک لیڈر ہے اور میں ڈپٹی لیڈر۔ اس سلسلے میں ہمارے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری قومی جنگ ہے، ہماری بقا کا سوال ہے۔ نچلی سطحوں پر جو لوگ بیٹھے ہیں وہی لوگ گدی پر قبضہ جمائے رکھنے کے حربے کر رہے ہیں۔''

''تم لوگوں نے بینک میں کس طرح سے ڈاکہ ڈالا.... ذرا بتاؤ نا؟''

بچو ہنس پڑا، ''یہ ایک دلچسپ ماجرا ہے۔ سات آٹھ روز پہلے حیدر بھائی کا خط ملا کہ خاصی بھاری رقم کی ضرورت ہے۔ اس وقت طے کیا کہ ساوار میں جہاں ہمارا بیس کیمپ ہے وہاں کی پیس کمیٹی کے ممبروں سے کچھ پیسے حاصل کریں گے اور ڈھاکہ کے کسی بینک میں ڈاکہ ڈالیں گے۔ جنا کی ہال کے قریب اس مسلم کمرشل بینک کو ٹارگٹ کیا۔ ایکشن پر گئے اسد، منیر، فیروز، جون، عارف اور فردوس۔ اس نے ایک سٹین گن لی۔ منیر کے ہاتھ میں

کھلونا ریوالور تھا جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگتا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کھلونا ریوالور سے ہی وہ لوگ پچیس ہزار کی رقم اٹھالائے تھے۔ عارف اپنے والد کی گاڑی کوئی بہانہ کر کے لے آیا تھا۔ ہم لوگوں نے نورتن کالونی میں جولی لوگوں کے گھر میں بیٹھ کر گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کی۔ عارف کے والد پیر صاحب ہیں لہٰذا ان کی گاڑی بھی ہر شخص پہچانتا ہے۔"

میں نے متعجب ہو کر کہا، "پیر صاحب!"

پیر صاحب لیکن ان کی گاڑی میں اسلحہ چھپایا گیا۔ پیر صاحب ہونے کی وجہ سے ہی تو سہولت ہے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر کے وہ لوگ گیارہ بجے چلے گئے۔ عارف گاڑی چلا رہا تھا۔ جون پہلے سے ہی جا کر سڑک پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بینک کے سامنے پہنچتے ہی جون نے "آل کلیئر" کا اشارہ کیا۔ اسد، منیر اور فیروز اترے۔ اندر داخل ہوتے ہی پہلے چوکیدار کو قابو کر کے اس کی رائفل چھین لی۔ باہر آرمی کی دو دو لاریاں کھڑی تھیں مگر انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اسد نے سٹین گن اٹھا کر سب سے کہا، "ہینڈز اپ" منیر نے اپنا کھلونا پستول تان کر سب کو کیش کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ منیجر سے جب کہا گیا کہ "پیسے دو" تو انہوں نے بھی فوراً کہا، "یہ لیجئے پیسے لے جایئے، آپ لوگ مکتی باہنی ہیں، میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو پیسوں کی ضرورت ہے۔" سب لوگوں نے تعاون کیا لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ رقم ڈالیں کس چیز میں۔ انہوں نے تو روپیوں کے بنڈل سامنے رکھ دیئے تھے لیکن رقم لینے کے لئے تو یہ لوگ کوئی تھیلا وغیرہ لے کر نہیں گئے۔ اس وقت فیروز نے اپنی شرٹ اتار دی۔ قمیض کے اندر روپیوں کے بنڈل لپیٹ کر جب نکل رہے تھے تو پتا چلا کہ آستین کے سوراخ سے روپے سڑک پر گر رہے ہیں۔"

ہنستے ہنستے بچو کو ہچکی آ گئی۔ "یہ یقیناً ایک دلچسپ بینک ڈکیتی ہے! اتنی دیر میں پاک آرمی کو اندازہ ہو گیا۔"

"پیسے گرتے دیکھ کر اندازہ ہوا ہو گا؟"

"نہیں وہ سڑک پر لوگوں کو تالی بجاتے دیکھ کر چونکے۔ اب ڈھاکہ کے لوگوں کو عادت ہو گئی ہے۔ مکتی لوگ کوئی ایکشن کریں تو وہ تالیاں بجاتے ہیں، جوئی بنگلہ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اب وہ آرمی سے نہیں ڈرتے۔ اس تالی سے ہی آرمی کو اندازہ ہو گیا، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکے۔ عارف پہلے سے ہی گاڑی سٹارٹ کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اسد منیر لوگ بینک سے نکلتے ہی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ آرمی کی بھاری لاری کے گھوم کر پیچھے آتے آتے وہ لوگ ہوا ہو گئے۔ وہ دوبارہ جولی لوگوں کے گھر پر ہی واپس آئے۔ اس مکان کا مین گیٹ پیلی روڈ کی طرف ہے۔ وہ لوگ پیلی روڈ کی طرف سے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ جعلی نمبر پلیٹ اتاری اور پیچھے کی طرف کے دوسرے گیٹ سے شانتی نگر کی سڑک پر نکل گئے۔ بہت گھوم پھر کر دھان منڈی میں عارف لوگوں کے گھر پر چلے گئے۔ شام کے وقت جب باہر نکلے تو دیکھا کہ سڑک پر تمام سیاہ مورس مائز گاڑیاں چیک کی جا رہی ہیں۔ پیر صاحب کی گاڑی سیاہ رنگ کی مورس مائز ہے۔

"تم لوگوں نے میلہ گھر میں کتنے پیسے بھیجے ہیں؟"

"بینک کے پچیس ہزار اور پیس کمیٹی کے پچیس ہزار ملا کر کل پچاس ہزار۔"

''تم لوگوں نے جو اتنے پیسے وہاں بھیج دیئے، تم لوگوں کا اپنا گزارا کیسے ہوگا؟''

''ہم لوگ؟ ہماری کیا فکر ہے؟ ہم لوگ جہاں پر بھی جاتے ہیں سب لوگ اپنی مرضی سے آ کر چندہ دے جاتے ہیں۔ جس کے لئے جتنا ممکن ہو۔ مچھیرے مچھلیاں دے جاتے ہیں۔ کسان کھیت کی سبزیاں۔ ذرا کھاتا پیتا کسان ہو تو ثابت گائے بھیج دیتا ہے۔ دریا کے گھاٹ پر مچھیروں نے ایک بڑا سا جھاپا باندھ دیا ہے۔ سویرے دریا سے گزرتے وقت اپنی اپنی کشتی سے اپنی اپنی اوقات کے مطابق مچھلیاں اس جھاپے میں ڈال جاتے ہیں۔ دن کے آخر میں کبھی بیس تیس سیر اور کبھی ایک من تک مچھلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ ان سے ہمارا دو وقت کا کھانا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ سب لوگ باقاعدگی سے چندہ دے جاتے ہیں۔ اس رقم سے گروہ کے ہر ایک فرد کو مہینے میں ایک سو روپئے جیب خرچ کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب شروع میں ''روہا'' گاؤں میں بیس کیمپ لگایا تھا تو اس وقت میلہ گھر سے صرف ۵۲ لڑکے آئے تھے۔ اس کے بعد علاقے کے بہت سے لڑکے آ کر گروہ میں بھرتی ہو گئے۔ جانتی ہیں، صرف دس دن کے اندر ہم لوگ ۴۵۰ افراد ہو گئے تھے۔

۸نومبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

حارث لوگوں کے گھر گئی تھی، رومی کی ایک تصویر کا نیگیٹیو لانے کے لئے۔ تقریباً ایک سال پہلے وہ دونوں مغربی پاکستان گھومنے کیلئے گئے تھے، میری دو بہنوں کے پاس۔ اس وقت حارث نے وہ تصویر اتاری تھی۔ میرے پاس ایک کاپی ہے۔ کمر میں چشی کا پستول ڈال کر کندھوں کے گرد گولیوں کا بلٹ ڈال کر اور سر پر کیپ لگا کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے رومی جیسے کچھ کہہ رہا ہو..... اس پوز میں اتری ہوئی تصویر تھی وہ۔ بہت جان دار تصویر ہے۔ کل حارث نے خود ہی اچانک فون کر کے بتایا کہ اس کے پاس رومی کی تصویروں کے کچھ نیگیٹیو ہیں۔ آج جا کر لے آئی ہوں۔ چند دنوں سے گھر پر موجود تمام البم کھول کر رومی کی تصویریں ڈھونڈ رہی تھی۔ گزشتہ دنوں رومی تصویریں بالکل نہیں اتروا تا تھا۔ تصویریں جتنی ہیں سب دو تین سال پہلے کی اتاری ہوئی ہیں۔ حارث سے نیگیٹیو لا کر سٹوڈیو میں دیا ہے۔ ذرا بڑے سائز کا پرنٹ بنوایا ہے۔

پرانے لڑکے کبھی کبھی اچانک آ کر ملاقات کر جاتے ہیں۔ سلیم آیا تھا گزشتہ روز۔ آج منو یعنی منیر العالم آیا تھا۔

۱۰ نومبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

معصوم آج گھر گیا ہے۔ سحر کے وقت گاڑی پر جا کر کوچ سٹیشن پر اتار آئی ہوں۔

عید کی خریداری اگرچہ زوروں پر ہے تاہم یہ ایک خاص طبقے کے لوگوں تک ہی محدود ہے۔ جن کے گھروں کی لڑکیوں کے کپڑوں میں اور لڑکوں کی ٹوپیوں میں زیادہ سے زیادہ گوٹے ستارے نظر آتے ہیں۔ ان بہاریوں اور اردو بولنے والے بنگالیوں میں ہی عید کی خریداری کی رونق نظر آ رہی ہے۔ ہم لوگ عید کی کوئی خریداری نہیں کر رہے۔ ہماری طرح کے اور بہت سے کنبوں میں عید کی خریداری کا کوئی شوق نہیں۔ کہیں سے معلوم نہیں کن لوگوں نے سائکلو سٹائل کیا ہوا ہینڈ بل تقسیم کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ملک کے ان مصائب کے دنوں میں عید کی خوشی کا کوئی جواز نہیں لہٰذا عید کے موقعہ پر نئے کپڑے وغیرہ خریدنا اور جشن کی تیاری کرنا بے موقع ہے۔ دوسری طرف فوجی جنتا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے کہ عید کی خوشیاں آنے والی ہیں، دل کھول کر خوشیاں منائیں، کپڑے خریدیں، پلاؤ، قورمہ، سویاں اور شیر خورموں کا اہتمام کریں۔ ایک طبقے کے لوگ جشن کی تیاریوں میں مگن بھی ہو گئے ہیں۔ نیو مارکیٹ، بیت المکرم، جناح ایونیو پر ان لوگوں کا جوش اور ولولہ دیکھ کر دل کے اندر غصہ، کراہت اور اکتاہٹ پیدا ہونے لگتی ہے۔

۱۲نومبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

ہر طرف جنگ کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ اخبارات کے صفحوں پر بھارتی تجاوز، بھارت کی طرف سے جنگ کی دھمکیاں، سرحدوں پر بھارت کی محاذ آرائی وغیرہ جیسی خبروں کا سیلاب سا آیا ہوا ہے۔ پانچ تاریخ کو اچانک حکومت کے احکام پر ڈھاکہ۔ نرائن گنج میں رات کے ساڑھے آٹھ سے ساڑھے نو بجے تک بلیک آؤٹ کیا گیا۔ آج کے اخبار میں دیکھ رہی ہوں کہ سرکاری اور غیر سرکاری تمام مکانوں کے قریب خندقیں کھودنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

دوسری طرف بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی، بنگلہ دیش کے حق میں عالمی رائے حاصل کرنے کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں کے دورے پر نکلی ہیں۔

ملک کے اندر بھی اچھل کود کم نہیں ہو رہی۔ پی ڈی پی کے چیئرمین نورالامین نے صدر یحییٰ سے درخواست کی ہے کہ رضا کاروں کی تعداد اور ان کے مہیا کئے گئے اسلحے کی تعداد بڑھائی جائے۔ ضمنی انتخابات ہونے کے بعد سے مشرقی پاکستان میں جس رفتار سے "بھارتی" تباہ کن کارروائیاں شروع ہوگئی ہیں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے رضا کاروں کے ہاتھ اور بھی مضبوط کرنا بے حد ضروری ہے۔

مٹی کے تیل کی قیمت اچانک ایک چھلانگ میں فی کنستر ۱۳ روپے سے ۱۸ روپے تک بڑھ گئی۔ کیا قصہ ہے؟ سدھر گنج پاور سٹیشن میں بچھوؤں کے ایکشن کا ردعمل معلوم ہوتا ہے!

اتنے دنوں تک اخباروں میں صرف رضا کاروں کا ہی ذکر ہوتا تھا۔ اب دیکھ رہی ہوں دو اور ناموں کا اضافہ ہوا ہے، الشمس اور البدر۔ ان دونوں لفظوں کا مطلب کیا ہے؟ اخباروں میں لکھتے ہیں رضا کاروں کی الشمس اور البدر باہنی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ رضا کار باہنی ہی کے دو گروہ ہیں۔

کل بیت المکرم کی ایک دکان میں دھماکہ ہوا ہے۔ آج کل ڈھاکہ میں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آئے تو تفصیلات معلوم کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی۔ منی کو فون کرنے سے ہی سب پتہ لگ جاتا ہے۔ اسی سے معلوم ہوا ہے کہ اس ٹولے کے اندر بھی جون اور فردوس شامل تھے۔ دوسروں میں اسد، فیروز، بابو، سحر، منیر اور زاہد شامل تھے۔ ان کے اس ایکشن کے نتیجے میں فینسی ہاؤس نام کی ساڑھیوں کی ایک دکان میں موجود ایک پنجابی میجر، اس کی بیگم اور چند دوسری خواتین زخمی ہوئی ہیں۔ دکان کے سامنے کھڑے ہوئے تین عدد خان سپاہی ہلاک

اور چند دوسرے افراد زخمی ہوئے ہیں۔اس دھماکے کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی دنوں کے لئے تمام دکانیں بند ہو گئیں۔عید کی خریداری کرنے والوں کے گڑھ میں ریت پڑ گئی ہے۔

۱۷ نومبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج کا دن بھی خوب گزرا۔ گزشتہ رات شب قدر تھی۔ شریف اور بوڑھے میاں محلے کی ایئر وپلین والی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گئے تھے۔ گزشتہ رات کرفیو نہیں تھا، شب قدر کی وجہ سے۔ نمازی رات بھر مسجد میں عبادت بندگی کر کے فجر کی نماز کے بعد گھروں کو لوٹے۔ جامی اور میں نے گھر پر ہی نفل نمازیں ادا کیں۔ آدھی رات کو دو ڈھائی گھنٹوں کے لئے سو بھی گئے۔ پانچ بجے کے قریب اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ دل یک دم دھڑک اٹھا۔ اس سحر کے وقت گھنٹی؟ فجر کی نماز پڑھے بغیر تو شریف لوگوں کے واپس آنے کا کوئی جواز نہیں تھا، پھر؟ سوچتے سوچتے دوبارہ گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری منزل کے برآمدے پر نکل کر آہستہ سے پوچھا، ''کون ہے؟''

شریف کی آواز سنائی دی، ''میں ہوں۔''

تعجب ہوا اور نیچے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ''ابھی تو فجر کی نماز نہیں ہوئی، ابھی سے چلے آئے؟''

''کرفیو لگا دیا گیا ہے، ساڑھے پانچ بجے سے مائک پر اعلان کرتے پھر رہے ہیں۔ تمام نمازی بھاگم بھاگ گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ فجر کی نماز تک رکنے کا موقع کہاں ہے؟ رکنے سے تو مسجد کے اندر ہی محدود ہو کر رہ جائیں گے۔''

ظاہر ہے۔ فجر کی اذان ہو گی پونے چھ بجے اور کرفیو لاگو ہو گا ساڑھے پانچ بجے سے، لہٰذا فجر کی نماز تک مسجد میں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آج شب قدر کی وجہ سے چھٹی تھی۔ کل ساری رات جاگ کر مومن مسلمانوں نے عبادت کی، آج دن کے وقت نیند پوری کریں گے۔

شریف نو بجے کے قریب غسل خانے میں گھسنے ہی والے تھے کہ باہر اچانک مائک پر اعلان ہونے لگا۔ سب کو اپنی اپنی بندوقیں، پستول اور ان کے لائسنس لے کر مین روڈ پر جانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔

یہ کیا مسئلہ ہے؟ شریف نے گیٹ پر جا کر دیکھا کہ حسین صاحب، ڈاکٹر صاحب، رشید صاحب، سب لوگ اپنے اپنے گھروں کے گیٹ سے باہر جھانک رہے ہیں۔ گلی میں ملیشیا پولیس کے دو سپاہی کھڑے تھے۔ کرفیو کے دوران بندوق، پستول وغیرہ لے کر مین روڈ تک جانے سے کہیں کرفیو کی خلاف ورزی نہ شمار ہو، سب کے دلوں میں یہی خوف تھا۔ ملیشیا کے سپاہیوں نے دلاسہ دے کر کہا کہ کرفیو کے اندر ہی تو حکم دیا گیا ہے۔ ڈرنے

کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہمارے گھر پر ایک بارہ بور کی شٹ گن، ایک ٹوٹو رائفل اور ایک پستول موجود تھا۔ شریف اور جامی سارا اسلحہ اور ان کے لائسنس اٹھائے مین روڈ کی طرف چلے گئے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ میں نے بھی گیٹ تک جا کر دیکھا۔ دوسرے تمام لوگ بھی اپنا اپنا اسلحہ اور لائسنس لے کر آہستہ آہستہ مین روڈ کی طرف جا رہے تھے۔

وہ لوگ سہ پہر کے چار بجے لوٹے۔ ہاتھ خالی، اسلحہ اور لائسنس دونوں رکھ لئے گئے، صرف کاغذ کے چند ٹکڑوں پر رسید لکھ کر دے دی تھی۔ شریف کے چہرے پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور دونوں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ گزشتہ رات جاگ کر گزاری تھی اور پورا دن غسل نہیں کر سکے۔ نہ ہی آرام کرنے کا موقع ملا۔ اوپر سے سارا دن اسلحہ اٹھا کر دھوپ میں کھڑے رہے۔ اگرچہ سردیوں کی دھوپ تھی پھر بھی رات کی بے آرامی، روزے کی حالت اور نیند پوری نہ ہونا، اوپر سے پورا دن کھڑے رہنا، یقیناً بہت تکلیف دہ تھا۔ جامی کا چہرہ دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔

۱۹نومبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

سب کے دل بہت اداس ہیں۔ رنج، مایوسی، ڈر، خوف، بے جا عتاب.... سب کچھ مل کر ہمیں شائد دیوانہ بنا کر چھوڑے گا۔ شریف کا وزن بہت تیزی سے گھٹ رہا ہے۔ میرا وزن بھی کم ہو گیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں روتی ہوں، آہ وزاری کرتی ہوں، بات چیت کرتی ہوں، دل کا غبار نکال لیتی ہوں۔ شریف ویسے بھی کم بولتے ہیں، آج کل اور بھی کم۔ اس پر یہ کہ وہ روتے بھی نہیں، آہ وزاری بھی نہیں کرتے۔ دل کا غبار کیسے نکلے۔ روزانہ عادت کے مطابق سارا کام سرانجام دیتے ہیں۔ صبح اٹھ کر شیو کرنا، نہانا، بیچ بیچ میں آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات سننا، اس کے بعد دفتر، سہ پہر کے وقت ٹینس، شام کو دوبارہ آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات، دوستوں کے ساتھ جنگ آزادی کے بارے میں گفتگو۔ باہر سے دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ انہیں اندر ہی اندر کوئی دکھ چاٹ رہا ہے۔

شہر میں ایک نیا منظر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ بہاری لوگ سارا سر منڈوا کر ماتھے پر لال پٹی باندھے گھوم رہے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی بہت سے بنگالی بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر خان سپاہی چھوڑ دیتے ہیں شائد اسی لئے خوامخواہ کی پریشانی سے بچنے کے لئے بہت سے ڈرپوک بنگالی نوجوان بھی سر منڈوا رہے ہیں۔

رومی کی بڑی کی ہوئی تصویر سٹوڈیو سے لے آئی ہوں۔ سائز زیادہ بڑا نہیں صرف آٹھ انچ بائی دس انچ ہے۔ اسی سائز کا فوٹو فریم بھی لے آئی ہوں۔ تصویر کو فریم میں لگا کر بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ کتنے دنوں سے نہیں دیکھا ہے وہ پیارا چہرہ۔ یہی تھی کیا تقدیر کی تحریر؟ رومی۔ رومی۔ تم کیا صرف تصویر بن کر رہ جاؤ گے میری زندگی میں؟ تم گوریلا بننا چاہتے تھے، گوریلا بنے تھے۔ رات کے اندھیروں میں خاموشی سے تیز قدم چلا کر بلا خطا دشمن پر وار کرتے تھے۔ دشمن بھی ایک دن بلا خطا نشانے پر حملہ کر کے رات کے اندھیرے میں تمہیں اٹھا کر لے گئے۔ کبھی واپس نہیں پاؤں گی تمہیں؟ تم تو ہمیشہ جیون آنند داس کی نظم کے لفظوں میں یوں کہا کرتے تھے۔

آؤں گا پھر سے اس بنگال میں"

رومی تمہیں لوٹ کر آنا ہی ہوگا پھر سے۔

آنکھیں پونچھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر جلی حروف میں لکھا "لوٹ آؤں گا پھر سے اس بنگال میں"۔ تصویر کو نچلی منزل کی بیٹھک میں کونے کی میز پر رکھ دیا۔ اگلے روز عید ہے۔ بہت سے لوگ عید ملنے کے لئے آئیں

گے۔ وہ سب لوگ دیکھیں گے کہ رومی کس طرح سے کمر پر ہاتھ رکھ کر شاندار انداز میں کھڑے ہو کر فخر سے اعلان کر رہا ہے ''لوٹ آؤں گا پھر سے اس بنگال میں''۔

۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

آج عید کا دن ہے۔ عید کا کوئی اہتمام نہیں ہوا ہمارے گھر میں۔ کسی کے کپڑے نہیں خریدے گئے۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے نہیں دھلے، مکڑیوں کے جالے صاف نہیں ہوئے۔ بیٹھک خانے کی میز پر عطر دان نہیں رکھا۔ شریف اور جامی عید کی نماز تک پڑھنے نہیں گئے۔

لیکن سحر کے وقت اٹھ کر میں نے عید کی سویاں اور زردہ تیار کیا۔ اگر رومی کا کوئی ساتھی آج گھر میں آ گئے؟ والدین، بھائی، بہن، کنبے سے جدا کوئی گوریلا اگر رات کے اندھیرے میں اس گھر میں آ جائے؟ ان کو کھلانے کے لئے میں نے پلاؤ، قورمہ، کوفتے اور کباب پکائے ہیں۔ ان میں سے کوئی اگر آئے تو میں چپکے چپکے اپنے ہاتھوں سے نکال کر کھلاؤں گی۔ ان کی قمیض پر لگانے کے لئے عطر کی ایک شیشی بھی خرید کر چھپا رکھی ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

واقعات جیسے کچھ تیزی سے ہی پیش آ رہے ہیں گزشتہ چند روز سے۔ مشرقی بنگال کے چاروں طرف کی تمام سرحدوں پر جوں جوں مکتی باہنی کے حملے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں ڈھاکہ کے تمام اخبارات میں ''بھارتی حملے'' کی خبریں اتنے ہی زیادہ کالم میں چھپ رہی ہیں۔ ۲۳ تاریخ کی صبح روزنامہ پاکستان دیکھتے ہی چونک گئی تھی۔ آٹھ کالم پر مشتمل بہت بڑی سرخی تھی ''بھرپور بھارتی حملہ''۔

باضابطہ اعلان کے بغیر ہی بھارت نے مشرقی پاکستان کے خلاف بھرپور حملہ کیا ہے۔ کئی مہینوں سے جاری رہنے والے چھوٹے چھوٹے حملے اور چھوٹی بڑی جھڑپوں اور مشرقی پاکستان کے چاروں طرف باقاعدہ منصوبے کے تحت پیدل فوج کی بارہ ڈویژنیں متعین کرنے کے بعد یہ حملہ کیا گیا ہے۔

اسی لئے ہر طرف اتنی تیاریوں کی دھوم پڑ گئی تھی۔ ۲۸ تاریخ کو پاکستان کی حکومت نے ہنگامی حالات کا اعلان کیا۔ اسی روز شام کے چھ بجے سے سات بجے تک ڈھاکہ، نارائن گنج اور ٹنگی شہر کے آس پاس کے علاقوں میں بلیک آؤٹ کیا گیا۔ شہر میں ہر جگہ جو خندقیں کھودی جا رہی ہیں اس کی خبر بھی تصویروں سمیت بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپی جا رہی ہے اور روزانہ اخباروں میں بکس کے اندر جو مختلف کہاوتیں شائع ہو رہی ہیں وہ الگ۔ کہاوتیں کچھ اس طرح سے ہیں۔

''دوران جنگ خاموشی افضل ہے''۔

جا گفتگو وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔''

پرامن رہئے، خاموش رہئے، اپنا خفیہ کلمہ اپنے دل میں رکھئے۔''

''افواہ تیز دھار خنجر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔''

وغیرہ وغیرہ۔

جنگ کے امکانات سے پاکستانی حکومت بہت پریشان ہوگئی ہے۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں سمجھ نہیں پا رہے۔ کل کے اخبار میں اعلان کیا گیا کہ ایک ہفتے تک روزانہ شام کے وقت بلیک آؤٹ کی پابندی کی جائے گی۔ آج کے اخبار میں وہ اعلان منسوخ کر کے نیا اعلان جاری کیا گیا ہے۔ ۲۸ تاریخ بروز بدھ شام کے ساڑھے پانچ بجے اچانک کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ شریف اور جامی ڈھاکہ کلب میں ٹینس کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ شام کے بعد شریف

کی ایک میٹنگ بھی تھی۔ اچانک سوا پانچ بجے باپ بیٹے گھر پر پہنچ گئے۔ کیا ہوا؟ معلوم ہوا کہ ساڑھے پانچ بجے سے کرفیو ہے! اس وقت آئیڈیل لائبریری سے ریاض صاحب کتابوں کی فہرست لے کر آئے ہوئے تھے۔ ڈھاکہ کلب کی لائبریری کے لئے کافی ساری کتابیں خریدنی تھیں۔ شریف کی زبانی کرفیو کا سن کر بھلے مانس، پاگلوں کی طرح بھاگ نکلے۔ انہوں نے ایلیفنٹ روڈ پر ہی اپنے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بجے کرفیو اٹھالیا گیا! یہ سب کیا تماشہ ہو رہا ہے؟

کل دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے کے قریب سننے میں آیا کہ دوپہر کے ایک بجے سے کرفیو لگ جائے گا۔ فوراً تمام لوگ دفتر، عدالتیں، دکانیں وغیرہ بند کر کے گھروں کی طرف بھاگ نکلے۔ حتیٰ کہ رکشا ملنا بھی مشکل ہو گیا۔ رکشے والے بھی تو گھروں کی طرف بھاگ نکلے تھے۔ میں گیارہ بجے کے قریب نیو مارکیٹ گئی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے سوچا کہ امی کی طرف سے ہوتے ہوئے گھر لوٹوں گی۔ سڑک پر آ کر دیکھا کہ سنسان ہوئی پڑی ہے۔ ۳ خالی رکشے جا رہے تھے، سواریوں کی آوازوں پر کان نہیں دھر رہے تھے۔ راہ گیر تقریباً دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے امی کی طرف جانے کا خیال ترک کر دیا۔ گاڑی گھما کر سیدھا گھر چلی آئی لیکن تھوڑی ہی دیر میں سنا کہ کرفیو نافذ نہیں کیا گیا وہ جھوٹی افواہ تھی! مائیک پر اس بات کا اعلان کیا گیا، ریڈیو پر سپیشل بلیٹن کے ذریعے افواہ کے بارے میں وضاحت پیش کی گئی لیکن سنسان سڑکیں دوبارہ آباد نہ ہو سکیں۔ خاصا مزہ آیا۔ ایک روز حکومت نے بے وقت چار گھنٹوں کے لئے کرفیو جاری کیا، دوسرے دن عوام نے افواہ کو ہی سچ سمجھ لیا۔ عوام کا اس میں کیا قصور ہے؟

۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

زندگی کس قدر غیر یقینی اور حقیقی معنوں میں کنول کے پتے پر پانی کے قطرے کی مانند ہے، اس حقیقت کو ان دنوں دل و دماغ کے اندر سے محسوس کر رہی ہوں۔ کتنے سالوں سے کتنی خوبصورت چادریں، غلاف، تولئے، پلیٹیں، گلاس، کپ، ڈشیں اور چمچ، الماری میں سنبھال کر رکھتی آئی ہوں کہ کسی خاص موقع پر نکالوں گی۔ رومی اور جامی سے اکثر ہنس کر کہا کرتی تھی "گھر میں بہو آئے تو نکالوں گی۔" وہ خاص مواقع کبھی آئیں گے کیا؟ آج کل تو جو زندہ بچ جائے اس کی زندگی ہی خاص واقعہ ہے۔ اس سے زیادہ خاص موقعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آج الماری کھول کر خوبصورت چادریں اور غلاف نکال کر بستر پر ڈال دیئے۔ قیمتی جاذب نظر پلیٹیں، گلاس، کپ، ڈش اور چمچ وغیرہ سارا کچھ نکال کر کھانے کی میز پر رکھ دیئے۔ شریف اور جامی کی حیرت زدہ آنکھیں دیکھ کر میں نے ہنس کر کہا، "مر جائیں تو سات بھوت لوٹ کر کھائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ خود ہی استعمال کر جائیں"۔

اگلے روز یوم "کرش انڈیا" کا سوچ کر بہت سے لوگ پریشان ہیں۔ میر پور اور محمد پور کے باشندوں میں اس روز کی تیاری میں جس قدر جوش و خروش نظر آ رہا ہے، بہت سے بنگالی اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ ان کے "بھارت کے خلاف" نفرت کے لاوے کے تلاطم میں بالآخر ڈھاکہ کے بنگالی بھی کہیں ڈوب نہ جائیں! بہت سے غیر بنگالیوں کی گاڑی کے شیشے پر کرش انڈیا لکھا ہوا سٹیکر چمک رہا ہے۔ غیر بنگالیوں کی دکانوں پر بھی کرش انڈیا لکھا ہوا پوسٹر سجا ہوا ہے۔

۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

جتنے خوفزدہ ہوئے تھے اتنا کچھ پیش نہیں آیا۔ صبح سے گاڑی، رکشے، بسیں بند رہیں۔ دکانیں بھی بند تھیں، غیر بنگالیوں کی دکانیں جوش کے نتیجے میں اور بنگالیوں کی دکانیں خوف کی وجہ سے۔

گیارہ بجے کے قریب لولو کے ساتھ پیدل چل کر عظیم پور کے ایک مکان میں گئی۔ راستے میں دو جلوس نظر آئے۔ شرکاء نے اردو اور انگریزی کے حروف میں بھارت کو تباہ کرنے کے بہت سے نعرے لکھے ہوئے پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں جلوس محمد پور کی طرف سے آئے تھے۔

بارہ بجے ہڑتال ختم ہوگئی۔ ڈیڑھ بجے رکشے پر گھر واپس آ گئی۔

جلسے جلوس سنا ہے شام تک چلتے رہے۔

آج سے ٹھیک ترانوے روز پہلے حملہ آور پاک فوجی رات کے بارہ بجے آ کر میرے رومی کو پکڑ کے لے گئے تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج بہت سویرے اٹھنا پڑا ہے۔ آٹھ دس روز ہوئے ہیں بازار سے مٹی کا تیل غائب ہو گیا ہے۔ کسی کسی دکان پر سنا ہے کہ مٹی کے تیل پر مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر حکومت نے مناسب قیمت پر مٹی کے تیل کی دکانیں قائم کی ہیں۔ بوڑھے میاں کو صبح سویرے ہی ڈھاکہ کالج کے الٹی طرف میر پور روڈ پر مناسب قیمت کی دکان پر قطار میں کھڑے ہونے کے لئے بھیج دیا ہے۔ کسی بھی طرح تیل مل جائے تو بات ہے۔ گھر پر اور دو دن تک چلنے جتنا تیل موجود ہے۔

شریف نو بجے دفتر جائیں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔ میرے ساتھ لولو اور جامی جائیں گے۔ شریف کو موتی جھیل میں اس کے دفتر پر اتار کر ہم لوگ بیت المکرم۔ سٹیڈیم مارکیٹ میں کچھ خریداری کے لئے جائیں گے۔ آج جان بوجھ کر ڈرائیور کو آنے سے منع کر دیا تھا۔ شریف اپنے دفتر تک گاڑی چلا کر لے جائیں گے، وہاں سے پھر میں چلاؤں گی۔ جاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر طے کر لیا کون کون سی چیز، کون، کس طرح خریدے گا۔ میں پہلے دو سوئیٹر خریدوں گی۔ اس کے بعد میں دواؤں کی دکان میں جاؤں گی۔ لولو اور جامی علیحدہ ہو کر مختلف سمت کی دو دکانوں میں داخل ہو کر دوائیں خریدیں گے۔ ان دونوں کو دو نسخے دے دیئے۔ وہ دونوں دوائیں خریدنے کے بعد دو الگ الگ دکانوں سے دو دو سوئٹر خریدیں گے۔ اس کے بعد گاڑی کے پاس آ جائیں گے۔ گاڑی سٹیڈیم کے پنہ سٹور کے سامنے کھڑی ہو گی۔

اتنی منصوبہ بندی کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ ہفتے ایک ہی دکان سے بیک وقت چھ سوئٹر خریدتے ہوئے تقریباً پکڑی گئی تھی۔ جناح ایونیو کے لمبے فٹ پاتھ پر کئی لوگ چادریں بچھا کر چھوٹی چھوٹی بہت سی دکانیں سجا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سے نسبتاً کم قیمت پر سوئٹر، مفلر، جرابیں وغیرہ خریدنی شروع کیں، پچھلے ہفتے سے پہلے صرف دوائیں، سگریٹ اور روپے بھیجا کرتی تھی۔ اب سردیاں آ گئی ہیں۔ گرم کپڑوں کی بھی ضرورت ہو گی۔ شریف نے کہا تھا کہ بہت چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنانے ہیں تا کہ لڑکوں کو لے جانے میں آسانی ہو اور کوئی شک بھی نہ کر سکے۔ اسی لئے میں بہت چھوٹے چھوٹے پیکٹ تیار کرتی ہوں۔ ایک پیکٹ میں ایک سوئٹر، ایک مفلر اور ایک جوڑا جرابوں کا رکھتی ہوں۔ ویسے جرابیں زیادہ کام میں نہیں آتیں کیونکہ مکتی سپاہیوں میں سے اکثر کے پاس جوتے ہی نہیں ہیں۔ پھر بھی جرابیں خرید کر بھیج دیتی ہوں۔ کم از کم خود کو تو اس فریب میں رکھ سکتی ہوں کہ میرے بچے اس

سردی میں جوتے موزے پہن کر لڑائی لڑ رہے ہیں۔

گزشتہ ہفتے ایک ساتھ چھ سوئٹروں کا سودا کیا، اتنے میں فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا ایک فوجی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اتنے سوئٹروں کا کیا کریں گی اماں جی؟ جوان لوگوں کے لئے ہیں کیا؟''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے باوجود منہ پر ہنسی پھیلا کر میں نے کہا، جی بابا جی، بیگم لیاقت علی نے اخبار کے ذریعے درخواست کی ہے کہ جوانوں کے لئے سوئٹر، تولئے، صابن، بلیڈ، ٹافیاں، چیونگم، ساری چیزیں خرید کر اپوا کے آفس میں جمع کرائیں۔ آپ جانتے ہیں اپوا کس کا آفس ہے؟ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کا''

آل پاکستان کے لفظ پر زیادہ زور دیا۔ اس فوجی کو کتنی بات سمجھ آئی مجھے یہ تو نہیں معلوم لیکن وہ ''ضرور، ضرور'' کہتے ہوئے سر ہلا کر چلا گیا۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ چند روز پہلے اخبار میں بیگم لیاقت علی کا یہ بیان پڑھا تھا۔ قسمت اور بھی اچھی تھی کہ بروقت وہ بات یاد آ گئی تھی۔

اس روز میرا سوئٹر خریدنا رہ گیا تھا۔

۲دسمبر۱۹۷۱ء بروز جمعرات

آج سارادن گھر سے نہیں نکلی۔کل کی خریدی ہوئی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تیار کر کے رکھ دیئے لیکن ابھی تک انہیں لینے کے لئے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ویسے آج شاید ہی کوئی آئے۔پہلے سے ایسی کوئی بات طے بھی نہیں ہوئی تھی لیکن اندر ہی اندر جانے کیوں لگ رہا تھا کہ کوئی آئے گا۔میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔عتیق الاسلام کے ساتھ دوپہر کے وقت فون پر بات ہوئی۔اس نے بتایا کہ کافی دنوں سے اس کے پاس بھی کوئی نہیں آ رہا۔میں نے کہا،''کم از کم میرے پاس سے وہ پیکٹ لے کر اپنے گھر پر رکھ دو تا کہ اچانک کوئی آ جائے تو دے سکو۔''

''ٹھیک ہے باجی۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا مگر آیا نہیں۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج بھی کوئی نہیں آیا۔ نہ آنے کی وجہ بھی تھوڑی بہت سمجھ میں آتی ہے۔ ملک کے حالات بہت خراب ہیں۔ چاروں طرف کی سرحدوں پر کافی زوروں کی جنگ جاری ہے۔ تمام اخبارات میں جلی سرخیوں میں مشرقی پاکستان کی مختلف سرحدوں پر ''بھارتی حملوں'' کے بارے میں مزاحمتی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ ہم لوگ آزاد بنگلہ بے تار، آکاش بانی اور بی بی سی کی خبریں سن کر تمام خبروں کا موازنہ کر کے اندازہ لگاتے ہیں کہ کن علاقوں میں مکتی باہنی کس حد تک آگے بڑھ رہی ہے اور پاکستانی فوج کہاں کہاں، کس حد تک پسپا ہو رہی ہے۔ شریف روزانہ انگریزی اور بنگلہ کے چار پانچ اخباروں میں چھپی ہوئی خبروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ کئی روز سے کہتے آ رہے ہیں، ''دیکھتے رہو بس، ڈھاکہ میں بھی جانے کب لڑائی چھڑ جائے۔ رنگ پور، دیناج پور، جیسور، کشتیا، فینی، سلہٹ، تمام جگہوں پر جس رفتار سے لڑائی جاری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتی باہنی کو ڈھاکہ تک پہنچنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔''

طبیعت اچھی نہیں تھی لہٰذا رات کو جلدی لیٹ گئی۔ مجھے دیکھ کر گھر کے باقی لوگ بھی لیٹ گئے۔ رات کے دو بجے کے قریب اچانک اینٹی ایئر کرافٹ گن سے ٹریسر چھوڑنے کی آواز پر جاگ گئی۔ کیا ہو رہا ہے؟ ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، فضا میں روشنی کی پھل جھڑی سی نظر آئی۔ سمجھ گئی کہ جس جنگ کے امکانات پر سب لوگ بے چین ہو رہے تھے وہ اب حقیقت میں بدلنے لگی ہے۔ دل بہت بے تاب ہونے لگا.... وہی احساس جیسے جسم کے ایک ایک حصے میں پھیلنے لگا۔ مزید لیٹ نہیں سکی۔ اٹھ کر دبے پاؤں بابا کے کمرے میں گئی۔ وہ سو رہے تھے۔ جامی جاگ کر پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر میرے کمرے میں آ گیا۔ دو ٹریسروں کی روشنی کے درمیان کا وقفہ کس قدر سپاٹ اور سیاہ تھا۔ اچانک خیال آیا کہ گہری رات کو ڈھاکہ شہر میں تو کبھی اس قدر اندھیرا نہیں ہوا۔ سڑک کی بتیوں کی وجہ سے ہلکی سی روشنی فضا میں پھیلی رہتی ہے۔ آج کیا ہوا؟ تب غور کیا کہ ہمارے مکان کے سامنے والی بتیاں بھی نہیں جل رہی ہیں۔ پیچھے کی طرف والے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک کر بلاکا بلڈنگ کی طرف نظر ڈالی، اس طرف بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ بلیک آؤٹ کیا گیا ہے؟

باقی رات جاگ کر ہی گزاری۔ شریف، جامی اور میں نے مختلف کمروں کی مختلف کھڑکیوں سے

جھانکتے اور برآمدوں میں ٹہلتے ہی سارا وقت گزار دیا۔

۴ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

چھ بجتے ہی فقیر کا فون آ گیا۔ ان معاملوں میں وہ بہت تیز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ڈھاکہ ریڈیو سنٹر سے بلیک آؤٹ کا اعلان کیا گیا تھا۔ گزشتہ روز سہ پہر کے ساڑھے چار بجے بھارتی فوج نے مغربی پاکستان کے سیالکوٹ، چھمب، لاہور، رحیم یار خان، بنج، اوڑی سیکٹر پر بری اور ہوائی حملے شروع کر دیئے تھے لہٰذا پاکستانی فوج کو بھی دفاع کے لئے بھارت کے سرحدی علاقوں پر جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ آل انڈیا ریڈیو سے کہا گیا ہے کہ پاکستان نے ہی شام کے ساڑھے پانچ بجے پہلا حملہ کیا تھا۔ انہوں نے سلیمانکی، کھیم کرن، امرتسر، پٹھان کوٹ، سری نگر، جودھ پور، انبالہ اور آگرہ پر بری اور ہوائی حملے کئے ہیں۔

پہلا وار جس نے بھی کیا ہو بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ حقیقت میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ ثبوت بھی مل گیا، صبح کی روشنی پھیلتے ہی خوفناک کڑکڑ کڑکڑ آواز نکالتے، فضا بیدار کرتے، لڑاکا طیارے اڑنے لگے۔ بیچ بیچ میں ائیر ریڈ سائرن بجتا رہا۔ ریڈیو پر مختلف اعلانات اور حفاظتی تدابیر نشر کی جاتی رہیں۔

آج اور کوئی کام نہیں تھا، ریڈیو، ٹیلی فون اور اخبارات سے ہی وقت گزارا۔ ریڈیو سنتی رہی اور اِدھر اُدھر فون کرتی رہی۔ کسی ایک کے پاس سے مکمل اطلاع ملنا مشکل تھا لہٰذا مختلف لوگوں سے ٹکڑے ٹکڑے اطلاعات اکٹھی کرتی رہی۔ کوئی آکاش بانی سن رہا تھا، کوئی بی بی سی، کوئی ریڈیو آسٹریلیا اور کوئی ریڈیو پاکستان۔

گزشتہ شام کو بھارت کے صدر نے اپنے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کل گہری رات کو ریڈیو پر خطاب کے ذریعے اپنے عوام کو بتایا کہ پاکستان نے بھارت کے خلاف جنگ شروع کر دی ہے۔ پاکستان کے صدر یحییٰ نے ریڈیو پر خطاب کرتے ہوئے اپنے عوام کو بتایا ہے کہ بھارت نے پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔

کس نے کس کے خلاف ''پہلے'' جنگ کا آغاز کیا اس بارے میں اگرچہ اختلاف موجود تھا لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہے ڈھاکہ کی فضا میں بھارتی طیاروں کی آمد و رفت۔

نو بجے کے قریب لولو آیا۔ ولولہ انگیز لہجے میں کہا، ''ممانی آپ کو بتاؤں! ائیر ریڈ سائرن سن کر لوگ

چھپنے کی بجائے بھاگ کر سڑکوں پر نکل رہے ہیں۔"

میں حیران رہ گئی، "یہ کیا بات ہوئی؟ سائرن سن کر تو سیڑھیوں کے نیچے دبک کر بیٹھنا چاہئے۔"

"سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں جانتی ہو؟ بھارتی طیارے عوام پر بمباری نہیں کریں گے۔ ان کا نشانہ صرف کیفونمنٹ اور ائیر پورٹ ہے چنانچہ سب لوگ لڑائی دیکھنے کے لئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔"

جامی چھت پر تھا۔ نیچے آ کر کہنے لگا، "حیرت ہے! چاروں طرف سب لوگ گھروں کی چھت پر اکٹھا ہو کر طیارے دیکھ رہے ہیں۔"

لولو چیخ اٹھا، "سنا ہے ممانی؟ سنا ہے؟ جو کچھ میں نے کہا تھا سچ تھا۔ سب لوگ جنگ کا منظر دیکھنے کے لئے چھتوں پر جا رہے ہیں۔ سڑکوں پر نکل رہے ہیں۔"

واقعی تعجب کی بات ہے! میں بھی سارا دن باورچی خانے میں مصروف رہی تھی لیکن کبھی کبھی باہر نکل کر فضائی جنگ بھی دیکھتی رہی تھی۔ شریف اور جامی ایک مرتبہ باہر نکلنا چاہ رہے تھے، میں نے منع کر دیا۔ لوگ جتنا بھی کہتے رہیں کہ بھارتی طیارے سیولین آبادی پر بم نہیں پھینکیں گے، لیکن پھر بھی اتنی بلندی سے سیولین اور آرمی کی پہچان کر کے بم پھینکنا ممکن نہیں تھا؟ میرا ایک بیٹا پہلے ہی پاک آرمی کے پنجوں میں ہے، دوسرے بیٹے کو بم کے دھماکے سے کھونا نہیں چاہتی۔ ضد بحث کر کے ان کو باہر جانے سے روک تو لیا لیکن اندر سے میرا اپنا دل بھی باہر جانے کو کر رہا تھا۔

طیاروں کی گڑگڑاہٹ کے دوران ہی بوڑھے میاں بازار سے سودا لے آئے۔ میں بھی اس کی مدد کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ بے چارہ آج اکیلا رہ گیا ہے۔ رینو کی ماں، رینو... کوئی بھی نہیں آئی۔ شائد گھر پر بیٹھ کر سب کے ساتھ مزے سے طیارے دیکھ رہی ہوں گی۔ شریف اور جامی باہر نہ نکل سکے تو دوبارہ چھت پر چلے گئے۔ کھانا پکانے میں بوڑھے میاں کا کچھ ہاتھ بٹا کر میں بھی چھت پر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر جامی نے پرجوش لہجے میں کہا، "امی، امی اتنی زبردست ڈاگ فائٹ ہو رہی ہے۔"

"ڈاگ فائٹ کیا ہوتی ہے؟"

"ڈاگ فائٹ؟ ڈاگ فائٹ..... یعنی دو طیاروں کی فضا میں لڑائی۔ سڑک پر جس طرح دو کتے آپس میں لڑتے ہیں اس طرح کی بات ہے! دونوں طیارے ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"پھر مجھے کیوں نہیں بلایا؟"

"ہاں! تمہیں بلانے کے لئے نیچے جاؤں اور ڈاگ فائٹ مس ہو جائے!"

"نتیجہ کیا رہا؟ بالآخر کون مرا؟"

"کوئی بھی نہیں۔ پاکستانی جہاز ہمت ہار کر بھاگ گیا۔"

اس کے بعد سے ڈاگ فائٹ دیکھنے کی امید میں کئی مرتبہ چھت پر گئی لیکن ڈاگ فائٹ دوبارہ نہیں ہوئی۔ ڈاگ فائٹ ہر وقت نہیں ہوتی۔ سارے پائلٹ لڑ بھی نہیں سکتے۔ بہت جاں باز، دلیر اور قوت ارادی رکھنے

والے پائلٹ ہی زندگی کو داؤ پر لگا کر ڈاگ فائٹ کرتے ہیں۔ پائلٹ کو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ طیارے پر ضرب لگنے کا مطلب ہے کہ اس میں آگ لگ جائے گی اور آگ لگنے کے بعد پائلٹ پیراشوٹ کی مدد سے باہر کود سکے یا نہیں، اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ زیادہ تر موقعوں پر طیارے کے ساتھ پائلٹ بھی جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔

تیسری منزل کی چھت پر بار بار چڑھنے اترنے سے سانس پھول گیا۔ شریف اور جامی صبح ناشتے کے بعد سے ریڈیو بغل میں دبا کر چھت پر چلے گئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ میرے تو سو کام ہیں، سسر کی دیکھ بھال سمیت۔ اس کے علاوہ سارے بلبوں پر کاغذ چڑھانا پڑے گا کیونکہ اخباروں کے ذریعے حکومت نے ہدایت کی ہے کہ اگلی ہدایات آنے تک ڈھاکہ شہر میں روزانہ شام سے لے کر صبح تک بلیک آؤٹ کی پابندی رہے گی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر گوند سے کاغذ چپکانا پڑے گا تاکہ بم کا دھماکہ ہونے سے شیشے ٹوٹ کر پورے کمرے میں نہ بکھر سکیں اور کسی کو زخمی نہ کر سکیں۔ یہ سارے کام اکیلے کرنا بھی ممکن ہے کیا؟ وہ لوگ تو چھت سے اتر ہی نہیں رہے۔ ان کی خود غرضی پر غصہ تو آیا مگر زیادہ دیر تک رہا نہیں۔

لولو آیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس کو ساتھ لے کر کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر لئی تیار کی۔ میں نے اخبار کے کاغذ سائز کے مطابق کاٹے۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر بیٹھک کی کھڑکیوں کے شیشوں پر چپکائے۔ دیواروں پر لگے ہوئے تمام بلب اتار کر صرف چھت سے لٹکے ہوئے دو بلب رہنے دیئے۔ ان جگہوں پر بھی پچیس پاور کا بلب لگا کر اخبار سے لپیٹ دیا۔ یہ سارا کام ختم کرنے میں سورج غروب ہو گیا۔ آج ریڈیو پر اعلان کیا گیا ہے کہ شام سے اگلے روز صبح تک کرفیو لاگو رہے گا، اگلی ہدایات آنے تک مسلسل۔ میں نے لولو سے کہا، ''اس وقت نکلنا محفوظ نہیں ہوگا۔ یہیں پر رہ جاؤ۔'' لولو راضی نہیں ہوا۔ ''نہیں ممانی، بھائی بھابی بہت پریشان ہو جائیں گے۔ فون بھی تو نہیں ہے کہ اطلاع دے دوں۔ آپ فکر مت کیجئے، نزدیک ہی ہے، آرام سے چلا جاؤں گا۔ ابھی اندھیرا ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔ لولو تقریباً بھاگتا ہوا چلا گیا۔ بھوتر گلی میں اس کے بھائی کا مکان ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

بابا کو بہت بے چینی تھی۔ آنکھوں سے نہیں دیکھتے لیکن کانوں سے کچھ زیادہ ہی سن لیتے ہیں۔ احساسات اور بھی تیز ہیں۔ کل بار بار کہہ رہے تھے، ''تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ ایئر ریڈ سائرن کو کوئی اس طرح سے نظر انداز کرتا ہے؟ نچلی منزل کی سیڑھیوں کے نیچے جانے کی بجائے چھت پر جا رہے ہو۔''

لہٰذا آج صبح ہی شریف سے کہہ دیا ہے، ''سنو آج اتوار ہے، چھٹی کا دن۔ نچلی منزل پر سیڑھیوں کے نیچے سب کے سونے کا انتظام آج ہی کر ڈالو۔ ابھی تو جنگ کا صرف آغاز ہوا ہے، بعد میں بہت شدید ہو جائے گی۔ ہم لوگ تو ضرورت پڑنے پر تیزی سے سیڑھیاں اتر سکیں گے۔ بابا کو اتارنا مشکل ہو جائے گا۔''

چنانچہ شریف اور جامی کو چھت کی کشش بھول کر گھنٹے دو کے لئے نیچے کام کرنا پڑا۔ رومی اور جامی کی دو سنگل چارپائیاں اتار کر سیڑھیوں کے نیچے ساتھ جوڑ کر لگا دی گئیں۔ خاصا چوڑا بستر تیار ہو گیا۔ طے ہوا کہ دیوار کی طرف بابا لیٹیں گے اس کے بعد شریف اور اس طرف میں لیٹوں گی۔ بیٹھک کا دیوان لا کر دونوں چارپائیوں کے سرہانے کی طرف ترچھا کر کے ڈالا گیا، اس پر جامی لیٹے گا۔

کھانے کی میز پہلے درمیان میں تھی، اب وہاں سے ہٹا کر کمرے کی دوسری طرف، دیوار کے ساتھ لگا کر رکھی گئی۔ چوکی کو پہلے کی جگہ سے ہٹا کر وہاں پر بابا کی ایزی چیئر سیٹ کی گئی۔

یہ سارا کچھ کرنے میں دوپہر ہو گئی۔ کل بوڑھے میاں نے دو دن کا سودا خرید کر، سب کچھ پکا کر رکھ دیا ہے۔ تین چار مہینوں سے اسی طرح کیا جا رہا ہے۔ فرج میں کافی مقدار میں پکا ہوا کھانا موجود رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر بن بلائے (مگر بہت ہی عزیز) مہمان آ جاتے ہیں۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ وہ دن یا رات کے کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔ اگر کوئی آ جائے تو تھوڑی دیر کے اندر ان کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہماری ذمہ داری ہے۔ لہٰذا فرج میں ہر وقت پکا ہوا کھانا تیار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بسکٹ، ڈبل روٹی، مکھن، پنیر وغیرہ بھی موجود ہوتا ہے۔

سیڑھیوں کے نیچے کا کام مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کہہ دیا تھا کہ اب اس وقت چھت پر مت جانا۔ نہا دھو کر پہلے کھانا کھا لو۔

ان لوگوں نے کوئی اعتراض کئے بغیر میرے مشورے پر عمل کیا۔ وہ لوگ میری بات آج کچھ زیادہ ہی مان رہے تھے۔ کل رات سے ہی میرا مزاج بہت خراب تھا۔ محلے کے بہاری چوکیدار کے منہ سے برا بھلا سننے کے

بعد سے۔ برا بھلا اس نے سب کو کہا ہے۔ لیکن مجھے اس کی بات ذرا زیادہ بری لگی۔

کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ لولو آ گیا۔ آتے ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھے میاں نے ایک پلیٹ لا کر اس کے سامنے رکھی۔ اسے آج کل کہنا بھی نہیں پڑتا ہے، اسے پہلے ہی سے معلوم ہے۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے لولو سے کہا، کل اتنی محنت تو کی لیکن کام نہیں بنا۔ اخبار کے شیڈ سے گزارا نہیں ہوگا۔ کل رات کو چوکیدار نے شور مچایا تھا کہ بتی کی روشنی نظر آتی ہے۔"

لولو نے کہا، "اسے تو بتی کی روشنی نظر آئے گی ہی۔ طریقہ یہ ہے کہ شیڈ نہ ہو تو بتی کی جو روشنی کھڑکی سے باہر زمین پر پڑتی ہے اسے ڈھک دیا جائے۔ کیونکہ طیارے سے زمین پر پڑنے والی روشنی نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے باہر زمین پر کھڑے ہو کر چوکیدار کو اگر کمرے کے اندر کی روشنی تھوڑی بہت نظر آئے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"یہی بات پاکستان کے اس خیر خواہ کو کون سمجھائے؟ کل سمجھانے گئی تھی۔ بہت برا بھلا کہا لیکن وہ گھپ اندھرا چاہتا ہے۔"

لولو تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ رہا پھر بولا، "نیو مارکیٹ میں کالے رنگ کی موٹی ڈرائنگ شیٹ ملتی ہے لیکن قیمت بہت زیادہ ہے۔"

میں نے زور دے کر کہا، "بے شک مہنگی ہو۔ ان کتوں کی گالیاں نہیں سن سکتی۔ کھانا کھا کر چلو نیو مارکیٹ چلتے ہیں۔"

جامی نے اتنی دیر میں منہ کھولا، "آل کلیئر، کا سائرن ابھی نہیں بجا ہے۔"

میں چیخ اٹھی، "نہ بجے! میں اسی کے اندر جاؤں گی۔"

بہت موٹی سیاہ ڈرائنگ شیٹیں خرید کر لے آئی، بہت ساری۔ پوری ایک شیٹ کو گول کر کے سوئی دھاگے سے دونوں سرے سی دیئے۔ اس کی شکل پائپ جیسے ہوگئی۔ اسے بلب کی گردن کے ساتھ لٹکا دیا۔ بتی کی روشنی اب کھڑکی کے باہر سے نظر آنا تو دور کی بات ہے، خود کمرے کے اندر روشنی ہے یا نہیں اس میں بھی شک ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں پر بھی بڑی شیٹیں چاروں طرف چھوٹی کیلیں ٹھونک کر لگا دیں۔ شیٹیں اتنی موٹی ہیں کہ گوند سے نہیں چپکیں گی۔

شام کے بعد کھڑکیاں بند کر کے بتیاں جلا دیں۔ بلب کے نیچے فرش کے اوپر کاغذ کے ماپ کا چھوٹا سا روشنی کا دائرہ پڑتا ہے لیکن کالے کاغذ نے ساری روشنی جذب کر لی ہے۔ اس سے تو موم بتی کی روشنی زیادہ ہوتی ہے! شریف اور جامی نے باری باری باہر سے جائزہ لے کر بتایا کہ بالکل گھپ اندھیرا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

صبح بوڑھے میاں اور رینو کو بھیج کر راشن منگوایا۔ اس کے بعد دس بجے جوں ہی امی کی طرف جانے کے لئے قدم بڑھایا، خطرے کا سائرن بج اٹھا۔ شریف اور جامی فوراً چھت کی طرف بھاگے۔ بابا بے چین ہو کر بہت کچھ کہنے لگے۔ میں نے بھی ان کی باتوں کی طرف توجہ نہیں دی، آہستہ آہستہ چھت کی طرف بڑھنے لگی۔ ''رینو کو آواز دے کر کہا کہ وہ دادا کے پاس بیٹھی رہے۔

نچلی منزل پر منتقل ہونے کے بعد بھی بابا کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ دوسری منزل پر اپنا بستر، اپنا ایزی چیئر، اٹیچ باتھ روم، سارا کچھ انہیں رٹا ہوا ہے۔ کسی کی مدد کے بغیر بھی دیوار پر ہاتھ رکھ رکھ کر باتھ روم چلے جاتے ہیں۔ ہم لوگ اگرچہ انہیں اکیلا جانے نہیں دیتے ہیں، کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ جاتا ہے لیکن وہ خود بھی جا سکتے ہیں۔ یہی ان کا بہت بڑا ذہنی اطمینان ہے۔ نچلی منزل کا باتھ روم، ڈائننگ روم سے گزر کر، اندر کا برآمدہ پار کرنے کے بعد گیسٹ روم کے رخ پر ہے۔ یہ نیا باتھ روم ابھی تک ان کے ذہن میں نہیں بیٹھا۔ اس وجہ سے بھی دل ہی دل میں بہت پریشان ہو رہے ہوں گے مگر اس کا حل بھی کیا ہے؟ ہم لوگوں کو بھی اپنا کمرہ اور باتھ روم چھوڑ کر اچھا نہیں لگ رہا البتہ سارا کچھ نچلی منزل اور ڈائننگ روم تک محدود ہونے کی وجہ سے ایک آسانی ہو گئی ہے، سب کچھ ہاتھ کے قریب ہے۔ مشکلات بھی موجود ہیں۔ کسی بھی قسم کی گفتگو کے لئے کھانے کی میز جو سب سے اعلیٰ جگہ تھی، اب کچھ غیر محفوظ سی لگتی ہے۔ وہاں پر بیٹھ کر بابا سے چھپا کر کوئی بات کرنا ممکن نہیں رہا۔ سرگوشی کرنے سے ان کو شبہ ہوتا ہے۔ ان کو ساری باتیں بتانا بھی ممکن نہیں، انہیں ہائی بلڈ پریشر ہے۔

اسی لئے نیچے منتقل ہونے کے بعد سے غور کر رہی ہوں کہ کھانا ختم ہوتے ہی دونوں باپ بیٹے بیٹھک کے کونے میں جا بیٹھتے ہیں۔ میں اپنے کام چھوڑ کر ان کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتی لہٰذا کام کے دوران ہی کان کھڑے کر کے ان کی باتوں میں حصہ لینے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔

شام کے وقت آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات سننے کے لئے بھی ہم لوگ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھتے ہیں۔ بابا سے کہتے ہیں کہ مہمان آیا ہے۔ بہت نیچی آواز میں ریڈیو سنتے ہیں۔ بابا غیر واضح آوازیں سن کر سمجھتے ہوں گے کہ مہمان سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اس دوران ہم لوگ آپس میں کچھ بات چیت بھی کر لیتے ہیں۔

آج دوپہر کے وقت آکاش بانی کی خبروں سے معلوم ہوا کہ بھارت نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے۔

شریف دوپہر کو دفتر سے لوٹنے کے بعد گزشتہ کئی دنوں کے اخبارات لے کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بابا کے غسل اور کھانے کا انتظام کرنے کے دوران میں غور کر رہی تھی کہ دونوں باپ بیٹے بہت سنجیدگی کے ساتھ مختلف اخبارات الٹ پلٹ کر کچھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ساتھ ہی کاغذ پر بھی کچھ نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔

بابا کھانے سے فارغ ہوئے تو انہیں اپنے بستر پر لٹانے کے بعد کھانے کی میز کے پاس آئی۔ ''اب تم لوگ اپنے کاغذات سمیٹ لو تا کہ میں کھانا لگاؤں، دو بج رہے ہیں، کر کیا رہے ہو یہ سب؟''

اخبارات، کاغذ وغیرہ سمیٹتے ہوئے شریف نے مدھم آواز میں کہا کہ کھانے کے بعد سب کچھ بتاؤں گا۔

تیز تیز دو چار لقمے منہ میں ڈال کر وہ دونوں دوبارہ بیٹھک خانے کے کونے میں دور بیٹھ کر اخبارات میں ڈوب گئے۔

آج کل رینو اور اس کی ماں بارہ، ایک بجے تک اپنا کھانا باندھ کر گھر چلے جاتے ہیں۔

میں نے ٹیبل صاف کرتے ہوئے شریف اور رومی کی باتیں سننے کی کوشش جاری رکھی۔

جوش میں جامی کی آواز قدرے بلند ہو گئی اور مجھے صاف سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات تو سمجھ میں آ گئی، لیکن آرمز کہاں سے ملیں گے؟

میرے ہاتھ میں جو کام تھا اسے چھوڑ کر ان کے قریب چلی گئی۔ شریف جامی سے کہہ رہے تھے کہ وقت پر آرمز بھی آ جائیں گے۔

میں نے ان کے سامنے پہنچ کر سوال کیا، کیسے؟ کس کام کے لئے؟ مجھے بھی تو بتاؤ نا۔

تمہیں تو بتانا ہی ہوگا۔ میں اور جامی حساب لگا رہے تھے کہ مکتی باہنی کو ڈھاکہ تک پہنچنے میں اندازاً اور کتنے دن لگیں گے۔ اس وقت گلی گلی جھڑپیں شروع ہو جائیں گی۔ اس وقت کے لئے ابھی سے تیار رہنا ہوگا۔

میرے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گلی گلی لڑائی؟

شریف کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مکتی باہنی کے بہت سے گروہ مختلف سمت سے ڈھاکہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ دو چار روز کے اندر وہ ڈھاکہ پہنچ جائیں گے۔ ہم جو لوگ شہر میں موجود ہیں، اس وقت ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ نوجوان لڑکے ان کے ساتھ سٹریٹ فائٹ میں شریک ہو جائیں گے اور ان کو ہم لوگ کھانا پینا، دوائیں اور علاج جیسی سہولتیں مہیا کریں گے۔ تم ابھی سے چاول، دالیں، آلو، بسکٹ وغیرہ خریدنا شروع کر دو۔ ایک وقت میں زیادہ نہ خریدنا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے باری باری خریدنا تا کہ کوئی شک نہ کرے۔ ساتھ ہی ٹنکچر آیوڈین، بینزین، روئی، گاز وغیرہ بھی خریدنا۔

میں ہنس پڑی۔ ''یہ ساری چیزیں ویسے بھی بہت خریدی ہیں۔ گیسٹ روم کے اندر ڈھیر لگا ہوا ہے۔ سوئٹر، مفلر، جرابیں، دوائیں.... کوئی لینے کے لئے آیا ہی نہیں۔ سارا کچھ پڑا ہوا ہے۔''

''پڑا نہیں رہے گا۔ ڈھاکہ میں کتنے دن تک جنگ جاری رہے کون کہہ سکتا ہے؟ تمہارے سوئٹر، مفلر، جرابیں، دوائیاں سب کچھ کام میں آ جائے گا، دیکھ لینا۔''

اچانک آسمان پر طیارہ اڑنے کی آواز سے مکان کے دروازے، کھڑکیاں سب لرز اٹھے۔ طیارہ بہت نچلی پرواز کر رہا تھا۔ شریف نے فوراً بات ختم کی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے، جیسے بات چیت سب مکمل ہو گئی ہو۔ جامی بھی ان کے پیچھے بھاگا۔ میں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ان کی طرف غصے سے دیکھتی رہ گئی۔

۷ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز منگل

بنگلہ دیش کو بھارت نے تسلیم کرلیا ہے۔

نئی دہلی، چھ دسمبر۔ اے پی پی، رائیٹر

بھارت نے آج باضابطہ طور پر بنگلہ دیش کو ایک آزاد مملکت کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔

روزنامہ اتفاق کی اس خبر پر نظر جمی رہ گئی۔ بنگلہ دیش، آزاد بنگلہ دیش، ایک آزاد قوم۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ رومی اس وقت کہاں ہوگا؟ اس کو پاکستانی فوجی گھر سے نکال کر لے گئے تھے، یہ تو معلوم ہے لیکن اسے مار دیا گیا ہے یا وہ زندہ ہے، اس بارے میں کوئی واضح خبر آج تک نہیں مل سکی۔ پگلا پیر کہتا ہے کہ رومی زندہ ہے۔ پگلا پیر کے پاس جتنے بھی لوگ جاتے ہیں، مشفقہ، محمودہ، محمودہ حق، جھیتو محمود، گوری ماں، نوجیل، دینو، کھنو، لینو، سنبل، زیب النساء، جہانگیر، نجمہ مجید..... سب سے پگلا بابا ایک ہی بات کرتا ہے: ''زندہ ہے۔ تیرا میاں زندہ ہے، تیرا بیٹا مرا نہیں ہے۔ تیرا بھائی جلد لوٹ آئے گا۔''

مامون محمود، شاہ عبدل مجید، شمس الحق، الطاف محمود، رومی، جہانگیر، بدیع، جوئل، آزاد، بشر، باقر نے مل کر آزاد بنگلہ دیش کا خواب دیکھا تھا۔ یہ سب لوگ آج کہاں ہیں؟ سب لوگ کہتے ہیں کہ پگلا بابا بہت قدرت والا پیر ہے۔ اس کی بات یقیناً صحیح ہوگی۔ وہ لوگ اگر حقیقتاً زندہ ہیں تو جہاں پر بھی ہیں وہاں پر کیا انہوں نے یہ خبر بھی سنی ہوگی؟ آج کا اخبار دیکھنے کا موقع ملا ہوگا؟ کیا انہیں معلوم ہوا ہے کہ دنیا کے کم از کم ایک ملک نے بنگلہ دیش کو آزاد مملکت کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ جن لوگوں کو غدار کہہ کر، کافر کہہ کر پاکستانی افواج چیونٹیوں کی طرح روند رہی ہیں، انہی کو آج دنیا کے ایک ملک نے آزاد قوم کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ اگر وہ سب لوگ شہید ہو چکے ہیں تو کیا ان کی روحوں کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی۔ کیا یہ جان کر ان کی روحوں کو اطمینان ملا ہوگا؟

اخبار کے اوپر سر رکھ کر شاید میں بے ہوش ہوگئی تھی؟ جامی نے آکر مجھے اٹھایا۔ اٹھا کر میرے آنسو پونچھے اور کہا، ''امی جانتی ہو؟ اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی۔ بہت جلد ڈھاکہ میں مکتی باہنی داخل ہو جائے گی۔ مگر لڑائی بہت آسان نہیں ہوگی۔ ڈھاکہ میں پاک آرمی کا زور کم تو نہیں۔ جانتی ہو امی، مجھے اور علی کو عظیم پور کالونی کے پاس ڈیوٹی ملے گی۔ ابو سے کہہ دیا ہے کہ مجھے اور علی کو ایک ایک چائنیز سٹین گن دی جائے۔ بھیا لوگ اگست میں ایکشن سے لوٹ کر گھر پر جس طرح کی سٹین گن لائے تھے ویسی۔ تمہیں یاد ہے نا امی؟ دیکھنے میں کیسی چمکدار مگر سائز میں

چھوٹی سی تھی۔ ان میں سے چائنیز سٹین گن ہی مجھے سب سے اچھی لگی تھی۔ بھیا بھی چائنیز سٹین گن کے لئے ہی پاگل تھے۔ ان کے گروہ میں صرف عالم بھائی کے پاس ایک چائنیز سٹین گن تھی، کسی دوسرے کے پاس نہیں۔ بھیا کو جب بھی موقع ملتا، عالم بھائی کی سٹین گن ہاتھوں میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا کرتے تھے۔"

جامی کا مقصد پورا ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہو گئے۔ میں نے کہا، "امی کے گھر جانا پڑے گا۔ ان کے گھر پر سودا ختم ہو گیا ہے۔ بوڑھے میاں آج گھر جائیں گے، اس لئے ان سے زیادہ مقدار میں سودا منگوایا ہے۔"

"چلو نانی لوگوں کو دے کر آتے ہیں۔"

باورچی خانے میں جا کر بوڑھے میاں سے کہا، "تم جتنی دیر میں کھانا پکانے کا کام مکمل کرو گے، میں لوٹ آؤں گی۔ امی کے گھر پر سودا دے آؤں۔"

دھان منڈی چھ نمبر روڈ پر امی کے گھر جا کر سودا دیا، دو چار باتیں کیں اور لوٹ آئی۔ اتنی دیر میں ایک مرتبہ فضائی جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس طرح کی فضائی جھڑپ شروع ہوتے ہی سڑکوں پر راہ گیر، گاڑیاں، رکشے، سارا کچھ رک جاتا ہے۔ "ائیر ریڈ" اور "آل کلیئر سائرن" کے درمیان تمیز کرنا تک لوگ شاید بھول گئے ہیں۔ سارے منہ اوپر اٹھا کر فضا میں گھورتے رہتے ہیں۔

آج ایک مختلف نوعیت کا منظر دیکھا۔ فوج کے افراد سڑک پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مار بھگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سب اندر چلے جائیں باہر کوئی نہ رہے۔ اس سے پہلے ایک اشتہار بھی دیکھ چکی ہوں جس پر لکھا تھا کہ فضائی حملے کے دوران باہر رہنا اپنے ہی لئے خطرناک ہے۔ واہ! بنگالیوں کے لئے بے چاروں کے دل میں کتنا درد ہے۔ بھارتی طیارے کے بم سے اگر بنگالی مریں گے تو انہیں کس قدر تکلیف ہو گی لہٰذا سڑکوں پر عوام کی پٹائی کر کے ان کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

گھر پر لوٹ کر بوڑھے میاں کو چھٹی دے دی۔ بار بار اچھی طرح سے کہہ دیا، "ٹھیک دو دنوں کے بعد واپس آ جانا بوڑھے میاں۔ دیکھ ہی رہے ہو کیسے حالات ہیں۔ اِس گھر میں نابینا سسر اور اُس گھر میں امی اکیلی ہیں۔"

بوڑھے میاں نے حسب عادت ہلکی سی ہنسی ہنس کر دھیمے لہجے میں کہا، "اللہ بھروسہ۔"

۸ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج ریڈیو پر اعلان کیا گیا ہے کہ اگلی ہدایات آنے تک، شام کے پانچ بجے سے سحر کے پانچ بجے تک کرفیو جاری رہے گا اور بلیک آؤٹ کی پابندی رہے گی۔ پہلے بھی تو شام سے صبح تک کرفیو کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ دوبارہ سے اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آج کل شام بھی پانچ بجے ہی ہوتی ہے۔ غور کر رہی ہوں کہ ان کا دماغ پاگل کتے کی طرح چل گیا ہے۔

آج رینو نے خود سے ہی رات کو یہاں پر رہنے کی بات کی۔ بوڑھے میاں نہیں تھے اس لئے خود ہی رینو کو یہاں پر رہنے کا کہنا چاہ رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی ہے، رہ سکے یا نہیں، اسی سوچ میں تھی۔ اب اس نے جو خود ہی دلچسپی کا اظہار کیا تو میں مطمئن ہو گئی۔ رینو عمر میں تو آٹھ نو سال کی ہے لیکن کام کرنے کا اتنا شوق ہے کہ وہ پندرہ سولہ سال والوں کو ہرا دے۔ میں نے خوشی کے ساتھ اپنے بستر کے پاؤں کی طرف وہ چوکی ڈلوا دی جس پر میں آرام کرتی تھی تا کہ رینو اس پر سو سکے۔ رینو کے رہنے کا مطلب ہے کہ بابا کے لئے کوئی فکر نہیں رہے گی۔ میں جب مرضی ہو. دوڑ کر چھت پر جا سکوں گی۔

آج صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ایک مرتبہ پھر فضائی جھڑپ ہوئی۔

۹ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

ہمارے واقف کاروں میں سے تقریباً سب لوگ ہی بینک سے پیسے نکلوا رہے ہیں۔ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ بینک میں رکھوا کر ان کے عوض نقد روپوں کا ''قرضہ'' لے رہے ہیں۔ سب لوگ ہی کہہ رہے ہیں کہ نجانے کب کیا پیش آ جائے۔ بروقت بینک سے پیسے نکلوا بھی سکیں یا نہیں۔ بے چاروں کے دن تو بس قریب آ گئے ہیں۔ کیا پتہ جانے سے پہلے بینکوں کے سارے نوٹ جلا جائیں یا جہاز میں ڈال کر اپنی طرف لے جائیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ جتنا زیادہ ہو سکے نقد روپے ہی پاس رہیں۔

لیکن اتنی نقد رقم گھر پر رکھنا بھی تو آسان بات نہیں۔ کسی بھی وقت پاک آرمی گھر میں داخل ہو کر سرچ کر کے لے جا سکتی ہے، گھر کا ملازم بھی چرا کر بھاگ سکتا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ بینک سے رقم نکلوا کر ایک ڈبے میں بند کر دیتے ہیں اور اسے پولی تھین میں لپیٹ کر مٹی کھود کر زمین میں چھپا دیتے ہیں۔

شریف نے بھی اپنے تمام نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ بینک میں رکھوا کر نقد روپے ''قرض'' لے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ چار مرتبہ جا کر پانچ پانچ ہزار روپے کی رقم بینک سے نکلوالی ہے۔ کل بیس ہزار نکلوائے ہیں۔ دس ہزار دفتر کے سیف میں رکھ دیئے اور دس ہزار گھر پر۔ میں نے ان روپیوں کے چھوٹے چھوٹے بنڈل باندھ کر مختلف جگہوں میں چھپا دیا ہے۔ کوئی بنڈل چاول کی بوری میں رکھا تو کوئی جوتے کے ڈبے کے نیچے۔ دوسروں کی طرح مٹی کھود کر چھپانے جیسا جھنجٹ مجھ سے نہیں ہوتا۔

ویسے بھی یہ رقم تو تھوڑے دنوں میں ہی کام آ جائے گی، سڑکوں پر لڑائی شروع ہونے کے بعد۔ دوپہر کو کھانا کھاتے وقت شریف نے بتایا کہ آج بانکا لوگ دھان منڈی کے مکان سے واری جا رہے ہیں۔

''کیوں؟''

''واری میں اس کی بیگم کی ایک بہن رہتی ہیں۔ ان کے ساتھ رہیں گے۔ دھان منڈی کے مکان کے پیچھے کی طرف کا پورا علاقہ ای پی آر والوں کا ہے۔ وہاں پر ایک اینٹی ائیر کرافٹ گن بھی نصب ہے۔

''اس وجہ سے؟''

اسی وجہ سے بانکا لوگوں کے مکان کی ہمیں ضرورت ہو گی۔ اس لئے اس سے کہا تھا کہیں اور منتقل ہونے کے لئے۔

جامی کی دونوں آنکھیں چمک اٹھیں۔اس نے سانس پھلا کر سرگوشی میں کہا، ''ابو مجھے اور علی کو بانکا چچا کے مکان پر.....''

شریف نے ہنستے ہوئے ڈانٹ پلادی، ''خاموش ہو جاؤ۔ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔تم لوگ عظیم پور کالونی کی تیسری منزل کی چھت پر پوزیشن سنبھالو گے۔جنگ لڑنے والے کبھی آرڈر کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔''

میرے پورے جسم پر کانٹے دوڑ گئے۔کرفیو کے حصار میں گھرے شہر میں، بلیک آؤٹ کے کالے کاغذ میں منڈھے ہوئے، اس قبر جیسے کمرے کے اندر رہ کر آزاد بنگلہ بے تار کی نشریات سن کر بڑی مشکل سے دلی قوت برقرار رکھتی ہوں۔جتنے دن گزرتے جا رہے ہیں یوں لگ رہا ہے کہ مزید نہیں سہہ سکوں گی۔لیکن اس طرح کی جنگ کی تیاریوں کی باتیں بلاشبہ پورے بدن میں توانائی بھر دیتی ہیں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

بوڑھے میاں نے آج لوٹ کر آنا ہے۔ ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے سودا منگوایا اور رینو کی ماں کو ترکاری کاٹنے کے لئے بٹھا دیا۔ ایک درجن انڈے اور گلیسرین کی دو شیشیاں لے کر امی کے گھر گئی۔ وہاں سے جو بلی لوگوں کے گھر جا کر خیریت معلوم کی۔ واپسی پر گھر لوٹے ہوئے راستے میں غور کرتی آئی کہ بہت سے لوگ سوٹ کیس، سامان وغیرہ لے کر رکشے پر اور بے بی ٹیکسیوں پر جا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ، سر پر، کندھے پر، ہاتھوں میں سامان اٹھا کر پیدل بھی جا رہے ہیں۔ کیا ماجرا ہے؟ پھر سے لوگ ڈھاکہ چھوڑ کر جا رہے ہیں؟

گھر پر لوٹ کر دیکھا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ فقیر، امیر، حسین، ببلو، چمو، حسین صاحب، ڈاکٹر اے کے خان۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات ہے، کل اور پرسوں رات کے وقت تیج گاؤں کے صنعتی علاقے اور یتیم خانے میں بم کے دھماکے ہوئے ہیں۔ سب کا گمان ہے کہ وہ دانستاً ''سیم سائڈ'' آپریشن تھا۔

میں نے کہا، ''سڑک پر دیکھ کر آ رہی ہوں کہ سارے لوگ ڈھاکہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔''

اے کے خان نے کہا، ''ڈھاکہ میں افواہ پھیل گئی ہے کہ مکتی باہنی نے شہریوں کو ڈھاکہ شہر چھوڑنے کی ہدایت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں پر شدید لڑائی ہوگی۔

امیر حسین نے کہا، ''کہاں..... میں نے تو نہیں سنا؟''

حسین صاحب نے سوال کیا، ''آزاد بنگلہ بے تار نے اس مسئلے پر کچھ کہا ہے؟''

''اعلان کی طرح سے نہیں کہا البتہ مقالوں میں، الٹی میٹم کے اندر گھما پھرا کر یہی بات کہی ہے۔''

''ڈھاکہ کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ کل سے تو تمام سکول اور کالج بھی بند کر دیئے گئے ہیں۔''

''واقعی''

''کیوں آج کے اخبار میں نہیں دیکھا؟ تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے ہیں۔''

''حالت اس کا مطلب ہے کہ واقعی پلپلی ہو گئی ہے؟''

گفتگو چلتی رہی۔ میں نے چائے، ناشتہ تیار کر کے مہمانوں کو پیش کیا۔ تقریباً دو بج گئے، کوئی اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

رینو کی ماں گھر پر لوٹنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ اس کا گھر کافی دور کامرنگی میں دریا کے

کنارے پر ہے۔ جاتے جاتے اسے شام ہو جاتی۔

بیٹھک میں بحث و تکرار میں مگن مہمانوں کو چھوڑ کر میں رینو کی امی کو کھانا باندھ کر دینے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

۱۱دسمبر ۱۹۷۱ء بروز ہفتہ

بوڑھے میاں آج بھی لوٹ کر نہیں آئے۔ رینو ایک رات رہنے کے بعد گھر چلی گئی جس سے مجھ پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔ شریف اور جامی پہلے تو گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے، چار تاریخ کے بعد سے وہ دونوں بالکل بدل گئے ہیں۔ کھانے کے وقت کے علاوہ تقریباً سارا وقت چھت پر گزارتے ہیں۔ دفتر جانے میں بھی باقاعدگی نہیں رہی۔

بوڑھے میاں نے ہمیشہ سے زبان کی پابندی کی ہے مگر اس مرتبہ وہ اپنی بات کا مان نہیں رکھ سکا۔ ملک کے جیسے حالات جارہے ہیں، کون جانتا ہے کہ اس بے چارے پر کیا بیت رہی ہوگی۔

میں کاموں سے فرصت نکال کر روزانہ بازار جا کر چاول، دالیں، آلو، پیاز، آٹا، چینی، سوجی، بسکٹ وغیرہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں مختلف دکانوں سے خرید لاتی ہوں۔ گیسٹ روم کے اندر اس سارے سامان کا ڈھیر لگا رہی ہوں۔

آج اچانک سہ پہر کے ساڑھے تین بجے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ مجھے اس کا بالکل بھی علم نہیں تھا۔ بے فکری سے بازار سے سودا خریدا۔ پونے چار بجے واپس آتے ہوئے غور کیا کہ سڑک پر لوگ سانسیں پھلا کر بھاگ رہے ہیں!

اتنا الٹ پلٹ شروع ہو گیا ہے۔ کس وقت کرفیو لاگو کرتے ہیں کب اٹھا لیتے ہیں کچھ پتا نہیں، ان کے سر پیر کی سمجھ نہیں آتی۔ دماغ کس طرح سے درست رہے؟ ملک کے تمام علاقوں میں جیسے حالات ہیں ان میں دماغ کہاں ٹھکانے رہ سکتا ہے؟ آج کے روزنامہ پروا دیس میں ایک خبر پڑھی کہ لاکسم، کومیلا، برہمن باڑیا، سلہٹ، حلوا گھاٹ، رنگ پور، دیناج پور، کشتیا اور کھلنا میں شدید لڑائی جاری ہے۔

یہ تو چھوٹی سرخی ہے۔ اس سے دگنے بڑے حروف میں اس کے نیچے ہی لکھا ہوا تھا، بری، بحری اور ہوائی جھڑپوں میں حملہ آور فوج کو بڑے پیمانے پر نقصان پہنچا ہے۔

پڑھ کر تھوڑی دیر تک دل ہی دل میں ہنستی رہی۔ یہ ''حملہ آور'' فوج کونسی فوج ہے سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ اسی لئے تو ان کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز اتوار

آج پورا دن کرفیو نہیں ہٹایا گیا۔ سوچا تھا کہ آج بھی کچھ خریداری کے لئے نکلوں گی مگر ممکن نہیں ہوا۔ ائیر ریڈ سائرن کو نظر انداز کر کے سڑک پر نکلنا تو ممکن ہے لیکن کرفیو میں تو نہیں نکلا جا سکتا۔ مجبوری ہے۔

جیسے مجھے کوئی بڑا موقع ہاتھ آ گیا ہو ایسے انداز میں، شریف اور جامی سے کہا، ''اس فرصت کے موقعے پر گیسٹ روم کو ترتیب دے لیتے ہیں''۔ وہ لوگ ریڈیو بغل میں دبا کر سیڑھیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے تھے۔ میری بات سن کر پیچھے مڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو ساتھ لیا، گیسٹ روم کا تالہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ ویسے فی الحال تو یہ سٹور روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ کوئی گھومتا پھرتا اچانک اس طرف نہ آ نکلے اور اس کمرے کی ابتر حالت نہ دیکھ لے، اس لئے تالا لگا کر رکھتی ہوں۔ چاول، دالیں، آلو، پیاز وغیرہ ساری چیزیں ہی ابھی تک ویسی کی ویسی، ٹاٹ کی تھیلیوں، کاغذ کے لفافوں اور پولی تھین کے بیگوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ روئی، بینڈ یج، ڈیٹول، اسپرین اور دوسری دوائیاں سب چھوٹے چھوٹے خاکی لفافوں کے اندر تھیں۔ پورے کمرے میں نظر گھما کر شریف نے کہا کہ ان چیزوں کو ترتیب سے رکھنا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح سے کیموفلاج ڈر ہنے دو تا کہ کوئی اچانک کمرے میں داخل ہو کر دیکھ بھی لے تو سمجھ نہ سکے۔ شریف بات مکمل کرتے ہی اباؤٹ ٹرن ہونے لگے۔ میں نے بہت تیکھی آواز میں کہا، ''درست ہے مگر ضرورت کے وقت جلدی سے درست چیز نکال سکوں، اتنی ترتیب سے تو رکھ لینی چاہئیں۔ فرض کرو کہ کسی شدید زخمی مکتی سپاہی کے زخم پر پٹی کرنے کی ضرورت پڑے اور ایسے موقع پر ایک سو پیکٹوں میں سے روئی تلاش کر کے نکالنے میں پندرہ منٹ ضائع ہو جائیں تو کتنا نقصان ہوگا۔

جامی ایک چھلانگ میں میرے قریب آیا اور گردن سے لپٹ کر کہا، ''پرامس امی، شام کے وقت سارے پیکٹ ترتیب سے رکھ دوں گا۔ اس وقت تم بھی ہمارے ساتھ چھت پر چلو۔ آج کرفیو کیوں نہیں ہٹایا گیا، اس بات کا اندازہ چھت پر جائے بغیر نہیں لگایا جا سکے گا۔''

میں نے منہ بگاڑ کر کہا، ''تم بھی چلو چھت پر! دادا کو اکیلے چھوڑ کر....''

جامی آج کل ذرا زیادہ دلیر اور شوخ ہو گیا ہے۔ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے کھینچ کر ڈائننگ روم کی طرف لے جاتے ہوئے بولا، ''دادا تھوڑی دیر کے لئے اکیلے بیٹھے رہیے۔ امی کو اوپر لے کر جا رہا ہوں.... الماری کھلوانا پڑے گی۔ ابو باتھ روم گئے ہیں۔'' جبکہ ابو پاس ہی کھڑے تھے۔

بابا خاموشی سے اپنی ایزی چیئر پر بیٹھے رہے۔ انہیں بھی چند دنوں میں گھر کے تمام لوگوں کے دھندوں کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اس روز بیٹے اور پوتے ہوائی حملہ کے وقت کی احتیاطی تدابیر سمجھا رہے تھے لیکن ان کی بات کو جیسے سب نے الٹا ہی سمجھا تھا اور کسی نے بھی ان پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بعد سے کسی کو کچھ نہیں پوچھتے۔

میں ان دونوں کے ساتھ چھت پر چلی تو گئی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد نیچے اتر آئی۔ بابا کو حقیقتاً زیادہ دیر تک اکیلے چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی بابا کی دیکھ بھال کرنے اور کھانا پکانے کے دوران میں بہت بار چھت پر گئی۔

ائیر پورٹ کی طرف نظر آ رہا تھا کہ تین طیارے بار بار نیچے اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر بلند ہو جاتے ہیں۔ ہماری چھت والے کمرے کی شمالی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید اقوام متحدہ کے ملازمین کو ڈھاکہ سے نکالنے کی کوشش ہو رہی تھی لیکن بھارتی طیاروں نے بمباری کر کے رن وے کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ صبح سے سہ پہر کے تین بجے تک کوشش کرنے کے بعد آخر طیارے نیچے اترنے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ پرواز کر گئے۔ ان کے پرواز کر کے جانے کے فوراً بعد بھارتی طیارے رن وے پر دو اور بم پھینک گئے۔

یہ منظر مزید اچھی طرح دیکھنے کے لئے جامی ایک مرتبہ چھت والے کمرے کی چھت پر بھی چڑھا تھا۔ وہاں سے ایلیفنٹ روڈ بھی واضح نظر آتی ہے۔ اوپر سے اتر کر جامی نے کہا، ''اچھا امی، پورا دن کرفیو جاری رہا مگر اتنی مائکرو بسیں کہاں پر جا رہی ہیں؟ یہ فوج کی گاڑیاں تو نہیں ہیں!

۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز پیر

آج آٹھ بجے سے دو بجے تک کرفیو میں وقفہ ہے۔ گھر پر سودا بھی موجود ہے اور کھانا بھی پکا ہوا ہے پھر بھی شریف کے کہنے پر چاول، دال، نمک، تیل، بسکٹ وغیرہ خریدنے کے لئے بازار نکلی۔ تمام رکشے سواریوں کو سامان سمیت لے کر جا رہے تھے۔ شریف گاڑی لے کر دفتر چلے گئے۔ جامی بابا کے پاس رکا ہے۔ میں لولو کے ساتھ پہلے امی کے گھر جانے کے لئے نکلی، لیکن رکشا ملنا بہت مشکل تھا۔ سواریاں اور سامان لاد کر کس طرف کو جا رہے ہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ کافی دور تک پیدل جانے کے بعد ایک رکشا خالی ملا۔ اسی کو غنیمت جانا اور اس میں بیٹھ گئی۔

امی کے گھر پر جا کر دیکھا کہ نچلی منزل، جو پہلے خالی تھی اب وہاں پر لولو کی سہیلی انوارہ لوگوں کا سارا کنبہ آ کر ٹھہرا ہے۔ وہ لوگ پوست گولا کی طرف رہتے تھے۔ وہاں سے خوفزدہ ہو کر اس محلے میں آ گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر میں بے فکر ہو گئی۔ امی کے لئے مجھے اب اتنا پریشان نہیں رہنا پڑے گا۔

اسی رکشے پر بازار سے خریداری مکمل کر کے گھر لوٹنے میں بارہ بج گئے۔ اگرچہ فرج میں مچھلی کا سالن وغیرہ پکا ہوا موجود تھا تاہم مزید مچھلیاں اور گوشت خرید کر لے آئی۔ دوبارہ کس وقت چوبیس گھنٹے کے لئے کرفیو نافذ ہو جائے کون جانتا ہے؟ باورچی خانے میں تین چولہے جلا کر گوشت، مچھلی اور چاول چڑھا دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد شریف دفتر سے آ گئے۔ باورچی خانے میں ایک مرتبہ جھانک کر چھت پر چلے گئے۔ چیخ کر جامی کو آواز دی، ''دادا کو غسل خانے میں لے جاؤ۔ غسل سے فارغ ہو جائیں تو کھانا کھلا دینا۔ خبردار اس وقت چھت پر مت جانا۔''

دوپہر کو میز پر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ میں نے کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ لوگ بھی خاموش رہے۔ ڈیڑھ بج گیا، دو بجے سے کرفیو شروع ہونا تھا چنانچہ کھانے سے فارغ ہو کر لولو رخصت ہو گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں گوشت اور دال کا برتن اٹھا کر پینٹری میں رکھ دیا۔ دوبارہ کمرے میں آتے ہی دیکھا کہ ریڈیو بغل میں دبا کر شریف سیڑھیوں سے چھت کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جامی بھی اچھلتا جا رہا ہے۔ دن بہ دن ان کی خودغرضی بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلے پھر بھی نیچے ہی رہتے تھے۔ سائرن بجنے پر یا طیاروں کی آواز سنائی دینے پر بھاگ کر چھت کی طرف جاتے تھے، اب تو پہلے ہی سے جا کر چھت پر بیٹھ جاتے ہیں۔ غصے میں دانت پیستے ہوئے کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اچانک یاد آیا ''ارے! میں نے خود ہی تو شریف سے کہا تھا

کہ بار بار بھاگ کر تیزی سے سیڑھیاں مت چڑھا کرو، خاص طور پر کھانے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ صحت کو نقصان پہنچتا ہے"۔

غصہ کافور ہو گیا، خود ہی ہنس پڑی۔ کیا بچوں کی طرح ناراض ہو رہی تھی۔ جنگ کی ٹینشن میں لگتا ہے کہ میری عقل بھی ٹخنوں میں اتر آئی ہے۔

ان پریشانیوں کے ساتھ ساتھ شریف کی وجہ سے بھی تو کم پریشان نہیں ہوں۔ اگست کے مہینے میں پاک آرمی نے ان پر جو ٹارچر کیا تھا اس کے بعد سے ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی۔ اگرچہ وہ معمول کے مطابق دفتر جاتے ہیں، میرے ساتھ پگلا بابے کے پاس جاتے ہیں، ٹینس کھیلتے ہیں دشمنوں کی ناک کے نیچے خطرناک کارروائیوں کے منصوبے بناتے ہیں، دیگر انتظامات سنبھالتے ہیں لیکن پھر بھی ان کا وزن مسلسل گرتا جا رہا ہے۔ آج دوپہر کو کھانے کی میز پر ان کا چہرہ بہت اترا ہوا لگ رہا تھا۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے دوسری منزل پر جا کر باتھ روم میں گھس گئی۔ دو دنوں سے نہیں نہائی تھی۔ نہا کر تازہ دم ہونے کے بعد ہی چھت پر جا کر دھوپ میں بیٹھوں گی۔ اگرچہ آج کل سارا انتظام نیچے ہے لیکن جب تک اپنے باتھ روم میں نہ نہاؤں، مجھے تسلی نہیں ہوتی۔ طیاروں کی گڑگڑاہٹ اگرچہ مسلسل سنائی دے رہی ہے لیکن تھوڑی دیر کے لئے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

بیڈ روم میں ہمارے ڈبل بیڈ پر ناریل کے چھلکوں کا موٹا گدہ ننگا پڑا تھا۔ اوپر کاروئی کا پتلا گدہ، چادر، تکیئے سارا کچھ نیچے رکھا ہوا تھا۔ آج سحر کے وقت فجر کی نماز کے بعد ہم دونوں تھوڑی دیر کے لئے اس کھردرے گدے پر لیٹے تھے۔

غسل سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں پاؤں رکھتے ہی چونک گئی۔ شریف اس گدے پر اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ بھاگ کر ان کے پاس گئی اور پوچھا "کیا ہوا؟ اس طرح سے یہاں پر کیوں لیٹے ہوئے ہو؟"

شریف نے بہت دھیمی آواز میں کہا، "سینے میں درد ہو رہا ہے۔ سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔"

پشت پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا کہ پسینے سے قمیض اور بنیان بھیگ گئی ہے۔ گیلی قمیض اور بنیان اتار کر جسم پونچھ کر خشک قمیض پہنا دی۔ اس کے بعد فون اٹھا کر ڈاکٹر اے کے خان کو بلایا۔ وہ فوراً اپنا بیگ اٹھا کر آ پہنچے۔

"سٹیتھکوپ سے شریف کا معائنہ کرتے ہوئے سوال کیا، پسینہ آیا تھا؟ پیرسن ہو رہے ہیں؟"

میں نے کہا، "پسینے سے بالکل نہا گئے تھے۔ دیکھئے دوبارہ سے پسینہ چھوٹ رہا ہے۔"

اے کے خان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ بیگ سے نکال کر شریف کو ایک انجکشن لگایا۔ اس کے بعد بولے، "یہ ان کا پہلا ہارٹ اٹیک تھا۔ اس کے لئے جس دوائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس موجود تھی، انہیں دے دی ہے۔ کسی کسی کو دوسرا ہارٹ اٹیک بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو اس کی دوائی میرے پاس نہیں چنانچہ بروقت ہسپتال لے جانا ہی سب سے بہتر ہوگا۔"

بائیں طرف کے مکان کے پڑوسی ڈاکٹر رشید، پی جی ہسپتال میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ان کو فون کر کے

پی جی میں شریف کے ایڈمشن اور ایمبولنس کا بندوبست کرنے کے لئے درخواست کی۔

کسے معلوم ہے کہ کتنے دن تک ہسپتال میں رہنا پڑے۔ اے کے خان نے کہا، ''کچھ کپڑے بسکٹ، پانی کی بوتل، موم بتی، ٹارچ.... یہ ساری چیزیں ساتھ رکھ لیجئے گا۔''

شریف نے کہا، ''بانکا اور منظور کو فون کر کے اطلاع دے دو۔ بانکا واری میں نہیں رہ رہا، وہ دفتر میں تیسری منزل کے فون پر ملے گا۔''

ڈائل گھمایا، منظور کا فون انگیج تھا۔ بانکا کے نمبر سے کوئی فون اٹھا نہیں رہا تھا۔ ایمبولنس آ گئی۔ اے کے خان نے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔ سانو آ کر رات کو یہاں رہ لے گی کیونکہ بابا بہت ضعیف ہیں اور جامی بچہ ہے۔ رات کے وقت بابا کو اگر کچھ ہوا تو جامی اکیلا سنبھال نہیں سکے گا۔

ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ ایلیفنٹ روڈ کی سنسان سڑک پر ایمبولنس تیزی سے جا رہی تھی۔ شام کے اندھیرے نے ہر چیز کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مغرب کے آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی کس قدر خوفناک لگ رہی تھی۔ چاروں طرف سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں، بندوقوں کے فائر کی، گرینیڈ کے دھماکوں کی، کبھی کبھی لگاتار ٹھا ٹھا ٹھا.... مشین گن کی آواز۔ طیاروں کی آمد و رفت جانے کیوں کافی دیر سے بند تھی۔ کبھی کوئی جیپ یا ماٹکرو بس تیزی سے پاس سے گزر جاتی تھی۔

شریف کو پی جی کی تیسری منزل پر انتہائی نگہداشت وارڈ کے سامنے لے جایا گیا تھا، ابھی اندر بیڈ تیار ہو رہا تھا۔ شریف برآمدے میں اسٹریچر کے اوپر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے بائیں طرف کے فرش پر گھٹنے ٹیکے میں بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ڈاکٹر اے کے خان اور پی جی کے ڈائریکٹر پروفیسر نورالاسلام کھڑے تھے۔

پروفیسر نورالاسلام ہمارے بھی کافی قریبی واقف کار ہیں۔ وہ خود کھڑے ہو کر ہدایات دے رہے تھے، بستر پر چادر ڈالو، کمبل صاف ہو، انہیں کسی طرح سے کوئی تکلیف نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

وارڈ کے ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ بوائے، سب کو خاص خیال رکھنے کی ہدایات دے کر پروفیسر نور الاسلام دوسری منزل پر چلے گئے۔ دوسری منزل پر بنے کیبنوں میں پی جی کے بہت سے ڈاکٹر، کنبے سمیت آ کر پناہ گزین ہوئے ہیں۔ پروفیسر اسلام بھی اپنے کنبے کے ساتھ ایک کیبن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

تھوڑی دیر میں شام کی ہلکی روشنی گھپ اندھیرے میں بدل گئی۔ وارڈ کی کھڑکیاں بہت بڑی ہیں، دروازے جتنی۔ کھڑکی کے کسی شیشے پر کاغذ نہیں لگا۔ پردہ کھینچنے سے بھی کھڑکی پوری نہیں ڈھکتی۔ کسی کھڑکی پر تو پردہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

شریف کو صاف چادر ڈال کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس اثناء میں شریف نے مجھ سے دوبارہ کہا کہ منظور کو فون کر کے اطلاع دے دوں۔ ڈاکٹر اے کے خان نے انہیں خاموش لیٹ کر ریسٹ کرنے کے لئے کہا ہے۔ میں نے بیگ سے ایک موم بتی نکال کر جلائی ہی تھی کہ ڈیوٹی پر فائز ڈاکٹر جھنجلا کر بولے۔ ''ارے، ارے! بجھا دیجئے۔

نیچے کے گارڈوں نے دیکھا تو شور کریں گے۔"

میں نے گھبراہٹ میں موم بتی بجھا کر کہا، "کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا کام کس طرح کریں۔"

"ٹارچ ہے آپ کے پاس؟ ٹارچ ہو تو دیجئے۔" ایک اور ڈاکٹر نے کہا، "گارڈ اتنے حرامی ہیں۔ بتی نظر آ جائے تو اوپر کی طرف منہ کر کے گولی چلا دیتے ہیں۔"

شریف نے کہا، "مجھے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔ آکسیجن....."

"آکسیجن سلنڈر لینے گئے ہیں سمجھ گئے، آکسیجن کی ذرا تنگی ہے۔"

ابھی تقریباً ساڑھے چھ بجے تھے لیکن ابھی تک آکسیجن نہیں آئی۔ شریف کو سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اے کے خان ان کی نبض تھام کر کھڑے تھے۔ شریف نے کہا، "آکسیجن کے لئے منظور کو فون کرو۔ وہ بندوبست کر لے گا۔" ڈاکٹر اے کے خان نے کہا، "کوئی بات مت کرو۔ بالکل خاموش رہو۔"

"رنچ کہاں ہے؟ جلدی سے رنچ لے کر آؤ۔" ایک ڈاکٹر نے چیخ کر کہا۔

"رنچ تو سر دوسری منزل پر لے گئے ہیں۔"

ہاتھ سے زور لگا کر سلنڈر کی ٹونٹی کھولنے کی بے جا کوشش کرنے کے بعد ڈیوٹی پر فائز ڈاکٹر نے دوبارہ سے چیخ کر کہا، "اس وارڈ کا رنچ دوسری منزل میں کیوں لے جانے دیا۔ جلدی سے بھاگ کر رنچ لے آؤ۔"

اندھیرے میں ٹھوکر کھانے سے بچتے ہوئے وارڈ بوائے احتیاط سے رنچ لانے کے لئے بھاگا۔

شریف بہت سٹپٹا رہے تھے۔ اے کے خان ان کو تسلی دینے کے لئے بار بار دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔ "ذرا صبر سے کام لو۔ بالکل خاموش رہو، ہلو جلو مت۔ ابھی سارا انتظام ہو جائے گا۔"

شریف نے سٹپٹاتے ہوئے دوبارہ سوال کیا، "منظور کو فون کیا؟"

مجھے رونا آ گیا۔ اس اندھیرے میں فون کہاں ہے؟ کس طرف کو جاؤں۔ میری ٹارچ لے کر ڈاکٹر لوگ بھی پتا نہیں کیا کرنے لگ گئے تھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک ڈاکٹر نے اچانک اے کے خان سے کہا، "سر مریض کو ساتھ والے چھوٹے کمرے میں منتقل کر دیتے ہیں۔ وہاں پر کھڑکیاں نہیں ہیں۔ موم بتی جلائی جا سکے گی۔"

چنانچہ شریف کو دوبارہ سے سٹریچر پر ڈالا۔ ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھ کر ساتھ کے چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ دراصل کسی اور کمرے کے ایک حصے میں پارٹیشن ڈال کر یہ کمرہ بنایا گیا تھا۔ کافی تنگ جگہ تھی اور اس میں بیڈ بھی ایک ہی تھا۔ بیڈ کے قریب ڈی فبریٹر مشین پڑی تھی۔ دونوں طرف جگہ اتنی تنگ تھی کہ دو تین افراد بڑی مشکل سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ یہاں پر آ کر میں نے ایک موم بتی روشن کر دی۔ شریف کو بیڈ پر لٹا کر میں فون کی تلاش میں دروازے سے باہر برآمدے تک آ گئی۔ گھپ اندھیرا دیکھ کر مایوس ہو کر کمرے میں لوٹ گئی۔ وہاں جا کر چونک گئی۔ ڈیوٹی پر فائز دونوں ڈاکٹر بیڈ کے دونوں طرف کھڑے ہو کر ہاتھ سے کارڈیاک مساج کر رہے تھے۔ میں نے اے کے خان سے سوال کیا، مشین کو کیا ہوا؟ مشین کیوں نہیں لگا رہے۔"

شریف کے سینے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے ایک ڈاکٹر نے کہا، ”کیسے لگائیں؟ ہسپتال کا مین سوئچ بند ہے۔ بلیک آؤٹ کی پابندی کی جارہی ہے ایسی بات تو زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ ایسے حالات میں موت سے لڑنے والے مریضوں کا کیا بنے گا؟ لائف سیونگ مشین بھی نہیں لگا سکتے۔“

۱۴دسمبر۱۹۷۱ء بروز منگل

شریف کو صبح دس بجے کے قریب گھر واپس لے آئے تھے۔ منظور اور مکی نے اپنے ایک عزیز رشتہ دار پولیس آفیسر سے کہہ کر آرمڈ پولیس کی مدد سے، بڑی تلاش کے بعد ایک پک اپ کا بندوبست کیا۔ اسی پر شریف کو ہسپتال سے گھر لائے۔

صبح کے وقت طیاروں کی آمد و رفت ذرا کم تھی۔ آج کرفیو نہیں ہٹایا گیا۔ اس کے باوجود، ہماری گلی چونکہ ایک طرف سے بند تھی، لہٰذا اطلاع پا کر تمام پڑوسی اکٹھے ہو گئے۔ انور کو اطلاع ملی تو اس نے کئی پاپڑ بیل کر اپنے بورڈ آفس کی مائکرو بس کا انتظام کر لیا تھا۔ ساتھ میں شیلی اور سلام بھی آ گئے۔ مائکرو بس بھیج کر امی اور لالو کو چھ نمبر روڈ سے بلوا لیا تھا۔ منظور اپنی گاڑی پر کئی چکروں میں بانکا، فقیر اور امین الاسلام کو لے آئے۔ ڈبلیو آر خان نے کفن کے کپڑے کا انتظام کیا۔

گھر کے قریب خالی جگہ پر دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے کے قریب جنازہ پڑھا گیا۔ جنازے میں تقریباً تیس چالیس لوگ شریک ہوئے۔ چار پانچ گاڑیوں پر بیس کے قریب افراد قبرستان تک گئے۔ سانو بھکو اور منظور میرے پاس رکے۔ بابا بالکل گونگے ہو کر اپنی ایزی چیئر پر پڑے ہوئے تھے۔

ڈیڑھ بجے اچانک طیاروں کی گڑگڑاہٹ بڑھ گئی۔ طیارے بار بار بہت نیچی سطح پر پرواز کرتے ہوئے، ایلیفنٹ روڈ کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ان کی گھن گرج بہت شدید تھی۔ جو لوگ قبرستان گئے تھے میں ان کے لئے بہت فکر مند ہو گئی۔ دو بجے تک سب لوگ واپس آ گئے۔ جامی کو واپس پہنچا کر اور میرے ساتھ چند باتیں کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ میری دو بھانجیاں ایوا اور صورت، جامی کا دوست علی، امی اور لالو ہمارے گھر پر رک گئے۔

گزشتہ رات سے کچھ بھی نہیں کھا سکی۔ السر کے درد سے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر امی سینہ پھاڑ کر چیخیں مار رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ لالو بابا کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں انہیں تسلی دے رہی تھی۔ جامی آ کر میرے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں رو پڑا۔ کہنے لگا، ''امی میرا جنگ لڑنا رہ گیا۔''

میں نے اٹھ کر سینے سے لگایا۔ وہ روتے ہوئے چیخ چیخ کر بازو، سر ہلا کر کہتا رہا، ''میں انہیں دیکھ لوں گا۔ انہوں نے بھیا کو چھین لیا، انہوں نے ابو کو مار ڈالا ہے۔ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

علی نے قریب آ کر جامی کو کھینچ لیا اور اسے دوسری طرف لے گیا۔ امی بھی اس کو روتا دیکھ کر اپنا رونا بھول گئیں اور اس کے پاس چلی گئیں۔

اچانک شدید گڑگڑاہٹ کے ساتھ طیارہ قریب سے اڑا، یوں لگا جیسے ہماری چھت گر گئی ہو۔ اس کے فوراً بعد ہی انسانی چیخیں چاروں سمت پھیل گئیں۔ ہم سب لوگ ہڑبڑا اٹھے۔ کیا ہوا! آس پاس کہیں پر بمباری تو نہیں ہوئی؟

صبح سے ہی افواہ گرم تھی کہ نیازی نے ایلیفنٹ روڈ پر ایک پیلے رنگ کے مکان میں پناہ لے رکھی ہے۔ یہ بھی سنا کہ محسن ہال، اقبال ہال اور سلیم اللہ ہال میں پاک آرمی نے پوزیشنیں سنبھال رکھی ہیں اسی لئے اس محلے کے اوپر سے اتنی نیچی سطح پر بھارتی طیارے بار بار پرواز کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی ہمارے دروازے کو دھکے دے رہا ہے۔ خوف کے مارے ہم سب لوگ دبک گئے مگر صرف ایک لمحے کے لئے۔ دھکوں کے ساتھ بہت سے لوگوں کے رونے اور بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ہم سب بھاگ کر دروازے پر پہنچے۔ جامی نے جوں ہی دروزہ کھولا تو سامنے کے برآمدے پر پڑوسی اکبر صاحب کا خون آلود جسم پڑا ہوا نظر آیا۔ انہیں گھیر کے تمام افراد، کوئی بیٹھ کر اور کوئی کھڑے ہو کر ماتم کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ والے گھر کے امیر حسین لوگ بھی خوف کے مارے آنکھیں پھیلائے کھڑے تھے۔

چیخ و پکار کے دوران کچھ ملی جلی آوزوں سے اصل واقعہ سمجھ آیا کہ اکبر صاحب کے گھر پر بم گرا ہے۔ وہ لوگ طیارے کی آواز سنتے ہی چھت پر چلے گئے تھے۔ بم گرے گا یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بم کے دھماکے سے اکبر صاحب کے مکان کا پچھلا حصہ اور امیر حسین کے گھر کا ایک کونا تباہ ہو گیا تھا۔ دو چھوٹے بچے چھت پر ہی فوت ہو گئے۔ اکبر صاحب شدید زخمی ہوئے۔ اس گھر کے تمام افراد اکبر صاحب کو اٹھا کر ہمارے گھر آ گئے تھے۔

جامی اور علی نے خون میں نہائے اکبر صاحب کو اٹھایا اور اندر لا کے دیوان پر لٹا دیا۔ باقی لوگ بھی، جس کو جہاں جگہ ملی، بیٹھ گئے۔ کوئی صوفے پر، کوئی کرسی پر اور کوئی فرش پر بیٹھ کر آہ وزاری کرنے لگا۔ میں دو دن کے فاقے سے تھی مگر جسم میں جانے کہاں سے جان پڑ گئی۔ گھر پر اس وقت نیا نیا پاس کر کے نکلی ہوئی تین ڈاکٹر، ایوا، صورت اور کھکو موجود تھیں۔ میں نے ان سے کہا، ''تم لوگ پہلے جائزہ لو کہ کون کتنا زخمی ہوا ہے۔ میں میڈیکل میں فون کرتی ہوں ایمبولنس بھیجنے کے لئے۔'' خوش قسمتی سے پہلی مرتبہ ڈائل کرتے ہی میڈیکل ہسپتال کا فون مل گیا۔ گھر کا پتا اور راستہ سمجھا کر ایمبولنس بھیجنے کی درخواست کی۔

اکبر کے علاوہ بھی تین چار افراد کافی زخمی ہوئے تھے۔ ولیم ٹو کی ایک شیشی ایوا کے ہاتھ میں تھما کر اس سے کہا، ''ہر ایک کو دو دو گولیاں کھلا دو۔ انہیں ذرا پرسکون رکھنے کی ضرورت ہے۔ کھکو تم پانی کا جگ اور گلاس لے کر آؤ۔''

ولیم کھلانے کا کام ختم ہوا تو کھکو، ایوا اور صورت کو روئی، آیوڈین، ڈیٹول، بینڈیج وغیرہ دے کر کہا کہ جس حد تک ممکن ہو ابتدائی طبی امداد دے دیں۔

ساڑھے چار بج گئے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جاتا۔ میں نے امیر حسین، ببلو، سجاد اور دوسرے دو

چار لوگوں سے کہا کہ طیاروں کی آواز جیسے ہی کم ہو تم لوگ بھاگ کر گھر سے کھانا، بچوں کے دودھ کا ڈبہ، چاول اور آٹے کا کنستر لے آؤ۔ رات کو فرش پر لیٹنے کے لئے گدے اور رضائیاں بھی لے آنا۔"

موقع پا کر ایک مرتبہ یہ جائزہ بھی لے آئی کہ گیسٹ روم کا تالا ٹھیک سے لگا ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مکتی باہنی کے لئے جو سامان اکٹھا کیا تھا اسے اس وقت کسی بھی حال میں خرچ نہیں کروں گی۔ ان لوگوں کے گھر پر تو ضرورت کی چیزیں موجود ہیں ان کو ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

پانچ بجے ایمبولنس آ گئی۔ اکبر صاحب کے علاوہ جو دوسرے لوگ زخمی تھے انہیں اور ان کی دیکھ بھال کے لئے چند دیگر تندرست افراد کو ایمبولنس پر سوار کرا دیا۔ وہ میڈیکل ہسپتال چلے گئے۔

دس منٹ کے بعد دوبارہ دھماکوں کی شدید آواز سے چاروں سمت ہر چیز کانپ اٹھی۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے ہماری پچھلی طرف کی گلی میں بم گرا ہو۔ بجلی فوراً چلی گئی۔ فون اٹھا کر دیکھا وہ بھی ڈیڈ تھا۔ بس اب جو کسر باقی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ فرج نہیں چلے گا، پانی کا پمپ نہیں چلے گا، مٹی کا تیل ختم ہو گیا تو بجلی کے ہیٹر سے گزارا نہیں کیا جا سکے گا، کرفیو جاری ہے، ایک فون ہی رہ گیا تھا رابطے کا واحد ذریعہ، وہ بھی منقطع ہو گیا۔

پورے فرش پر بستر بچھا دیا۔ سیڑھیوں کے نیچے والے پلنگ پر پہلے بابا اور اس کے بعد جامی اور علی لیٹے۔ نیچے فرش پر پلنگ کے بالکل ساتھ میں، ایوا، صورت، امی اور لالو۔ ہمارے بعد پہلے اکبر کی بھابی کی بچیاں اور اس کے بعد ان کے گھر کے مرد۔ ان کے بعد امیر حسین لوگوں کے گھر کے مرد اور اس کے بعد ان کے گھر کی عورتیں اور لڑکیاں۔ ان کا بستر کمرے کے دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ لگی، کھانے کی میز کے پائیوں تک جا پہنچا۔

رات کے دو بجے کے قریب اچانک نیند ٹوٹ گئی۔ باہر کوئی جامی کا نام پکار رہا تھا۔ اٹھ کر ٹارچ جلائی۔ جامی نے کھڑکی کے پاس جا کر ایک پٹ کھول کر جھانکا۔ ہمارے گھر کے بالکل سیدھ والے مکان کے حسین صاحب کی آواز تھی۔ ان کے پیچھے کی طرف والے مکان کے کونے میں آگ لگ گئی تھی، کس طرح لگی، اللہ معلوم، لیکن ابھی اگر اس آگ کو اوپر سے دیکھ کر کوئی طیارہ بم پھینک جائے تو.....؟

میں نے کہا، "جامی، علی، ببلو، سجاد تم لوگ گرم کپڑے پہن لو۔ حسین صاحب لوگوں کی چھت پر چڑھ کر دیکھو کہ کس طرح سے آگ بجھائی جا سکتی ہے۔"

امی کے بولنے کی آواز آئی، "اس سارے بکھیڑے میں جامی کو کیوں دھکیل رہی ہو؟ وہ چھوٹا بچہ ہے، اس کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ببلو نے ہامی بھری، "ہاں، ہاں جامی کو جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ڈانٹنے کے لہجے میں کہا، "نہیں نہیں! جامی ضرور جائے گا۔"

میں نے گیسٹ روم سے موٹی رسیوں کا ایک بنڈل اور درمیانے سائز کی ایک بالٹی لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ ان لوگوں نے گرم کپڑے پہنے، بالٹیاں اور رسیاں اٹھائیں اور حسین صاحب لوگوں کے گھر چلے گئے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز بدھ

آج حسین صاحب اوران کی نچلی منزل کے کرائے دار اسلم صاحب اپنے کنبوں کے ہمراہ ہمارے گھر پر آ کر پناہ گیر ہوئے۔ اس وقت بچوں اور بوڑھوں کو ملا کر ہمارے گھر پر پینتالیس افراد جمع ہو چکے تھے۔

آج سارا دن کانوں کے پردے پھاڑتی آوازیں، ''راکٹنگ'' اور ''سٹریفنگ'' چلتی رہی۔ سارا دن کانوں میں روئی، گردن پر رضائی اور سر کے نیچے بستر ٹھسا رہا۔

آج ساڑھے آٹھ سے لے کر ساڑھے بارہ بجے تک کرفیو میں وقفہ تھا۔ اطلاع ملی کہ کل پچھلی گلی کے ایک مکان پر بم گرنے سے شریف کے دوست انجینئر تفضل حسین صاحب کی بیٹی مر گئی ہے۔ بم کے اسی دھماکے میں کل بجلی اور ٹیلی فون کی تاریں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔

آج پورا دن کلکتہ ریڈیو کی نشریات جاری رہیں۔ بار بار پاک آرمی کو سرنڈر کرنے کی ہدایت دی جا رہی تھی۔ اس ضمن میں آج سہ پہر کے پانچ بجے سے کل صبح کے نو بجے تک فضائی حملوں میں وقفہ رکھا جائے گا۔

مسلسل بمباری کے دوران میں ہی صبح سے وقتاً فوقتاً ایلا، بادشاہ، عطا بھائی، کلیم، نزلو، ہدیٰ، رینو، منظور، عتیق، حمیدہ، جوبلی رفیق اور معصومہ آئے۔ سب لوگ آ کر باری باری مجھ سے لپٹ کر روئے۔ میں نے سب کو ڈانٹا کہ اس قدر سٹریفنگ کے دوران میں وہ کیوں نکلے؟ طیاروں کی آواز سنائی دیتے ہی سب کو دونوں ہاتھوں سے کان بند کر کے بستر کے اندر گھس جانے کی ہدایت دی۔ منظور نے بتایا کہ گورنر ہاؤس پر تباہ کن بمباری ہوئی ہے لہٰذا بانکا کو موتی جھیل کے دفتر سے اٹھا کر دھان منڈی میں اپنے بھانجے پرنس کے گھر پر چھوڑ آئے ہیں۔ گورنر مالک نے ہوٹل انٹرکان میں جا کر پناہ لی ہے۔ انٹرکان کو انٹرنیشنل زون قرار دیا گیا ہے۔

لولو گزشتہ دو روز سے آ نہیں سکا تھا۔ آج گیارہ بجے اچانک آ گیا۔ بیت جانے والے واقعات سے آگاہ ہو کر دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ شریف اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس سب کچھ کے دوران مجھے باورچی خانے کی بھی فکر کرنا تھی۔ ہمارے ہاں چھ خاندان مقیم ہیں اور انہیں کھانا پینا بھی ہے۔ میں نے کھانا پکانے' کھانا کھلانے اور گھر کے دوسرے کاموں کے لیے سب کی ڈیوٹیاں لگا دیں۔

اس صورت حال میں مجھے بابا کے لیے پرہیزی کھانا تیار کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ہنجو نے اپنے گھر سے ڈبل روٹی' نرم چاول اور بغیر مصالحوں کے پکی مچھلی بھیج کر میرا مسئلہ حل کر دیا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات

آج صبح کے نو بجے تک فضائی حملوں میں وقفہ رکھنے کا جو فیصلہ تھا اس کا وقت سہ پہر کے تین بجے تک بڑھا دیا گیا۔ دوپہر سے پورے شہر میں شدید اشتعال اور اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ سنا ہے کہ پاک آرمی سہ پہر کے وقت ہتھیار ڈال دے گی۔ صبح سے کلیم، ہدیٰ، لولو..... جو بھی گھر آیا اس کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ گروہ در گروہ لوگ جوئی بنگلہ کے نعرے بلند کرتے، سڑکوں پر نکل آئے تھے، کرفیو کو نظر انداز کر کے۔ پاک فوجی اور بہاری فرار ہو رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے سڑکوں اور گلیوں میں اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے جس سے بہت سے بنگالی قتل اور زخمی ہو رہے تھے۔ منظور اپنی دو بیٹیوں کو ساتھ لے کر آئے۔ انہوں نے اپنی گاڑی میں بنگلہ دیش کا جھنڈا چھپایا ہوا تھا۔ وہ بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔ بادشاہ نے آ کر بتایا کہ ایلیفنٹ روڈ پر عزیز موٹرز کے ملک خان نے جیپ پر فرار ہوتے ہوئے بے پروائی سے گولیاں چلا کر سڑک پر کھڑے بہت سے لوگوں کو زخمی کر دیا ہے۔

منظور جاتے وقت جھنڈا مجھے دے گئے، کہنے لگے، ''آج اگر ہتھیار ڈال دیئے گئے تو کل صبح آ کر جھنڈا بلند کروں گا۔''

آج شریف کی قل خوانی بھی تھی۔ ہمارے گھر پر جو لوگ موجود تھے، وہی صبح سے دعا، درود، قل پڑھ رہے تھے۔ محلے کے باقی لوگوں کو بعد مغرب، میلاد میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔ اے۔ کے۔ خان، سانو، منجو بھکو، یہ لوگ سہ پہر سے ہی آ گئے تھے اور قل پڑھ رہے تھے۔

جرنیل نیازی نے نوے ہزار پاکستانی فوج کے ساتھ آج سہ پہر کے تین بجے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس کا مطلب ہے کہ جنگ اختتام کو پہنچ چکی ہے؟ پھر اب کن لوگوں کے لئے سامان بچا کر رکھوں؟

میں نے گیسٹ روم کا تالا کھولا۔ چاول، چینی، گھی، گرم مصالحہ نکالا۔ قل خوانی کا زردہ پکانا تھا۔ امی، لالو اور دوسرے گھروں کی خواتین نے مل کر زردہ پکایا۔

رات کے کھانے کے لئے بھی چاول، دال، آلو، پیاز وغیرہ بھی نکال دیئے تھے۔ اگلے روز صبح کے ناشتے کے لئے میدا، گھی، سوجی، چینی، گرم مصالحہ بھی باہر نکال کر رکھ دیا۔

۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعہ

آج صبح سویرے ہمارے مکان پر آزاد بنگلہ دیش کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ منظور آئے تھے، گھر پر جتنے لوگ موجود ہیں وہ سب بھی چھت پر گئے تھے۔ ۲۵ مارچ کو جس فلیگ پول پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا کر دوبارہ اتار لینے پر مجبور ہوئے تھے، اسی فلیگ پول پر آج پھر سے وہی جھنڈا بلند کیا۔

سب لوگ رونے لگے۔ میں نہیں رو سکی، جامی کا ہاتھ سختی سے مٹھی میں پکڑ کر کھڑی رہی۔

گزشتہ تین روز سے جامی کے بارے میں سخت پریشان ہوں۔ شریف کی وفات کے بعد سے وہ کیسا گم سم سا ہو گیا ہے۔ اکثر بیٹھے بیٹھے طیش میں آ جاتا ہے۔ بھاگ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ پنجابی کو مارے گا، بہاری کو مارے گا، ابو کی موت کا بدلہ لے گا۔ جتنا اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ لڑائی اب ختم ہو چکی ہے اور یہ کہ دوران جنگ پنجابی کو مارنے سے دشمن کا نقصان ہوتا لیکن اب مارنے سے قتل کرنا ہوگا، وہ اتنا ہی طیش میں آ جاتا ہے۔ کیا کروں! اس کی وجہ سے میں بھی کہیں پر نکل نہیں پا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ اتنے جو لوگ موجود ہیں گھر پر۔ حسین صاحب اور اسلم صاحب لوگ کل رات کو ہی اپنے گھر پر واپس چلے گئے تھے لیکن باقی لوگ تو جیسے یہاں سے ہلنا تک نہیں چاہ رہے۔ جانے کس خوف کے مارے اس مکان کے فرش پر پڑے ہوئے ہیں۔

یار، دوست، رشتہ دار، واقف کار، کتنے ہی لوگ صبح سے سیلاب کے پانی کی طرح سے آ رہے تھے۔ ان کی زبانی سن رہی ہوں، رمنا ریس کورس میں ہتھیار ڈالنے کا واقعہ۔ گروہ در گروہ مکتی باہنی کا ڈھاکہ میں آنے کا تذکرہ، بھارتی فوج کی باتیں، جوشِ فتح کی باتیں۔ اسی دوران میں خون یخ کر دینے والی ایک اور بات بھی سنی، سر منیر، مفضل حیدر، ڈاکٹر ربی، ڈاکٹر علیم چودھری، شہید اللہ قیصر اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ گزشتہ سات، آٹھ دنوں کے اندر کرفیو کے دوران ان کے گھروں پر جیپ یا مائکرو بس پر نامعلوم افراد آ کر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے۔ بجلی کی طرح مجھے خیال آیا کہ گزشتہ سات آٹھ روز کے دوران جب مرضی ہوتی تھی بلاوجہ کرفیو لاگو کر دیا جاتا تھا، اس کی وجہ یہی اغوا تو نہیں تھے؟ کرفیو کے دوران غیر فوجی مائکرو بسیں اور جیپیں آ کر اتنے سارے لوگوں کو اٹھا کر لے گئیں، اب جا کر سارا کچھ واضح ہوا۔

شام ہوتے تک رئیر بازار کی قتل گاہ کے بارے میں بھی خبریں کانوں میں آئیں۔ بہت بے تابی محسوس ہو رہی تھی۔ کیا کروں، کہاں پر جاؤں، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رومی! کیا تم زندہ ہو؟ مجھے کس طرح

سے معلوم ہوگا؟ کس کے پاس سے معلوم ہوگا؟ شریف بھی ایسے وقت میں چلے گئے؟ ہم دونوں اکٹھے رومی کا غم اٹھا رہے تھے، انتظار کر رہے تھے، اب مجھے اکیلے ہی ہر کام کرنا ہوگا، سارے دکھ جھیلنا ہوں گے۔

فون اور الیکٹرک لائین اب تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ کون ٹھیک کرے؟ پورے ڈھاکہ میں لوگ ایک ہی ساتھ ہنس بھی رہے ہیں اور رو بھی رہے ہیں۔ آزادی کے لئے ہنسی مگر ہنسی زیادہ دیر تک ہونٹوں پر برقرار نہیں رہتی۔ اتنی زیادہ جانوں کی قربانی جیسی قیمت ادا کرنی پڑی ہے کہ ہنسی، آنسوؤں کی برسات میں ڈوب جاتی ہے۔

شام کے بعد موم بتی جلا کر آسیب زدہ سی روشنی میں جامی کو تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس سے پہلے مکان کے سامنے جیپ رکنے کی آواز سن چکی تھی۔ اٹھ کر دروزہ کھول دیا۔ کندھے پر سٹین گن اٹھائے چند نوجوان کھڑے تھے۔ میں نے دروازے سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا، ''آؤ بیٹو آؤ۔''

ان لوگوں نے کمرے میں داخل ہو کر پہلے اپنا تعارف کرایا۔ میں میجر حیدر ہوں، یہ شہادت ہے، یہ عالم، وہ آنو ہے، یہ ضیاء ہے، وہ فاتح ہے اور ادھر چلو ہے۔

حیدر اور آنو کے علاوہ باقی سب کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

چلو اتنے دن تک سنٹر جیل میں تھا۔ اسے جیل سے نکال کر رومی کو چاہنے والے یہ مکتی فوجی رومی کی ماں سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔

میں نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر دیوان پر بٹھایا۔ میں نے شہادت کے ہاتھ سے چینی سٹین گن لی اور اپنے ہاتھوں میں اٹھالی۔ اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ اس کے بعد اسے جامی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ چلو زمین پر گھٹنے ٹیکے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ کھینچ کر اپنی آنکھوں پر رکھے اور میری گود میں سر چھپالیا۔ میں نے حیدر کی طرف نظر ڈالی اور کہا، ''جامی گھر پر کچھ مسائل ہونے کی وجہ سے آزادی کی جنگ میں شرکت کرنے نہیں جا سکا۔ یہ بہت بے چین ہے۔ اسے بھی کسی کام پر لگالو۔''

میجر حیدر نے کہا، ''ٹھیک ہے، جامی اسی لمحے سے تم میرے باڈی گارڈ ہو، فوراً میرے ساتھ میرے دفتر چلو، میں تمہیں ایک سٹین گن ایشو کر دیتا ہوں۔ تم گاڑی چلا لیتے ہو؟''

جامی نے اٹینشن کھڑے ہو کر تڑاک سے سلیوٹ کر کے کہا، ''جی ہاں۔''

''ٹھیک ہے تم میری گاڑی بھی چلاؤ گے۔''

جامی کے قریب ہی علی کھڑا تھا۔ جامی نے کہا، ''سر، میرا دوست.... علی۔''

میجر حیدر نے سنجیدہ ہو کر کہا، ''ان فکٹ مجھے دو باڈی گارڈوں کی ضرورت ہے، تمہارے دوست کو بھی اپوائنٹمنٹ دیا جاتا ہے مگر سوچ لو کہ ذمہ داری نبھا سکو گے یا نہیں۔ یہ بہت ٹف جاب ہے چوبیس گھنٹوں کی ڈیوٹی۔''

پانچ دنوں کے بعد جامی پہلی مرتبہ دانت نکال کر ہنسا۔

''۴۸ گھنٹوں کی ہو تب بھی پرواہ نہیں۔''